

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

علوم قرآن اور علم تفسیر سے متعلق ضروری معلومات

ذی
محسن تقی عثمانی

استاذ حدیث دارالعلوم کراچی
(فرزند حضرت مولانا محمد تقی عثمانی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

والدہ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تفسیر معارف القرآن کو اللہ تعالیٰ نے عوام مجاہد میں بڑے معمولی قبولیت عطا فرمائی، اور جلد اول کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا، دوسرے ایڈیشن کی طلبات کے وقت حضرت مصنف مدظلہم نے جلد اول پر عمل طور سے نظر ثانی فرمائی، اور اس میں کافی ترمیم و اضافہ عمل میں آیا، اسی کے ساتھ حضرت موصوف مدظلہم کی خواہش تھی کہ دوسری اشاعت کے وقت جلد اول کے شروع میں علوم شرع اور اصول تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعہ سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہو سکیں، لیکن متواتر اراض اور ضعف کی بناء پر موصوف کے لئے بذات خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرت موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیل حکم اور تحصیل سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہو گیا، اور علوم قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پر ہی کتاب کو معارف القرآن کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایما پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر معارف القرآن کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے تھے، یہ تلخیص معارف القرآن جلد اول کے زیر نظر ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس نایاب چیز کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علمی مباحث احقر کی اس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو انشاء اللہ عقربہ تفل کتابی صورت میں شائع ہوگی، لہذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں وہ اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْہِ تَوَكَّلْتُ وَالِیْہِ اُنِیْبُ۔

احقر
محمد تقی عثمانی
۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

دارالعلوم کورنگی
کراچی ۷۵

لے الحمد للہ یہ کتاب "علوم القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ناشر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَفَّحَ سَبَیْلَہُمْ عَلَیْہِ سَبَیْلَہُ الْاِنْدِیْنِ اَصْطَفَیْ

وحی اور اس کی حقیقت

قرآن کریم چنانکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا کہ اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

وحی کی ضرورت ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذریعہ کچھ نفع و نقصان عطا کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔

ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو "علم" کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیلئے اس کی کونسی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کون سے کاموں کو پسند اور کون کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ناممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں وغیرہ عقل اور ضمیر سے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص اثر ہوتا ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں ان کا علم بڑی عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم

نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ صرت آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواس خمسہ کا دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواس خمسہ جواب دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہو اور نہ عقل کے ذریعہ، مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے، اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعہ ممکن ہے نہ عقل کے ذریعہ، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے معترف فرمایا ہے اسی کا نام وحی ہے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دیدیتا ہو اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو وحی کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب دیتا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرت عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے بڑی عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

جو شخص دعوہ اللہ خدا کے وجود پر قائم نہ ہو اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل کمزور ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کا علم پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادر مطلق نے پیدا کیا ہے، وہی اس کے مربوط اور محکم نظام کو اپنی حکمت بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی لئے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہو کہ اس انسان کو پیدا کرنے کے بعد اسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے، یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیج دے، اور اسے نہ چلنے نہ وقت سفر کا

مقصد بتائے، اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اس پر یہ واضح کرے کہ اسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خداوند قدوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمت بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہو کہ جس ذات نے چاند سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور ستاروں کا ایسا عجیب العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغام رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصد زندگی سے متعلق ہدایت دی جاسکے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان ہو تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، ہر رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی در رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ وحی محض ایک نئی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے۔

وحی در رسالت کا یہ مقدمہ سلسلہ ہر کار و دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضور پر نور وحی کے طریقے پر ختم ہو گیا، اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی صورت میرے لئے سب سے زیادہ صحت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آ جاتا ہے۔ (صحیح بخاری ۲/۱)

اس حدیث میں آپ نے وحی کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے شیعہ محمدی الدین ابن عربی نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹی ہوئی رہ سکتی ہے، گھنٹی جب مسلسل بجتی ہو تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلام الہی کی بھی یہ خصوصیت ہو کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح اور اک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے (فیض الباری ۱/۱۹۰)۔

جب اس طریقے سے آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے

دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ کی مبارک پیشانی پسینہ سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی، ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سر سرسکے لگتا، چہرہ انور میسر ہو کر چہرہ کج ہو جاتا، شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے پکپکاتے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے (الاتقان ۱/۲۶)

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپ جس جا نور پر اس وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا، اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سر اقدس حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر رکھا ہوا تھا، اگر اسی حالت میں وحی نازل ہوتی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زید کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی (زاد المعاد ۱/۱۹۸)

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دوسروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھڑوں کی جھنبھنا ہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی (تبویب مسند احمد کتاب السیرۃ النبویہ ۲۰/۲۱۲)

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس اگر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبرئیل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہؓ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لاتے ہیں، بہر کیف جب حضرت جبرئیلؑ انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزول وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی (الاتقان ۱/۲۶)

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کر کے بغیر اپنی اصل صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں اور تیسری بار نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام اجنادین پر پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنہ ۱۲۰ھ کے واقعے کے بعد سے مشکوک ہے۔ (فتح الباری ۱/۱۹۸)

چوتھی صورت براہ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک تعالیٰ سے ہمکلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشاری کی حالت میں صرف ایک بار یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں (الاتقان ۱/۲۶)

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی صورت میں آئے بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرماتے تھے، اسے اصطلاح میں "نفس فی الزور" کہتے ہیں (ایضاً)

تایخ نزول قرآن

قرآن کریم دراصل حکام الہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: **بَقِیُّ قُرْآنٍ مَّحْمُودٍ** (۲۲-۲۱:۸۵) (بکلیہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں ہے) پھر لوح محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمان دنیا کے بیت عزت میں نازل کر دیا گیا تھا، بیت عزت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبارت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پھوٹا تھا اور اس کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزول فترت کی یہ دو صورتیں خود فترت قرآن کریم کے انداز بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائی، بیہقی، اور حاکم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ فترت قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمان دنیا پر ہوا اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر (الاتقان ۱/۴۱)

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمان دنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابو شامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعت شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتائی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہو جاوے زمین کی عبادت کے لئے آسانی ملے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ آسمان سے یہ بھی جتنا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں اور دوسرے بیت عزت میں (مناہل العرفان ۱/۳۶) واللہ اعلم۔ اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تدریجی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلۃ القدر میں ہوئی ہے، اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوہ بدر پیش آیا، لیکن یہ رات رمضان کی کوئی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض لوگوں نے رمضان کی سترھویں، بعض نے اسیسویں اور بعض نے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے (تفسیر ابن جریر ۱/۱۸۰) صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کے سب سے پہلے جو آیتیں تھیں وہ سورۃ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ

یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء تو پچھتے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کی فطرت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اولاً اس دوران آپ نماز میں کئی کئی گنا تہجد کرتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے یہاں تک کہ ایک دن

لے قارئین کے لئے یہ بات یقیناً سمجھوتہ اور غلط فہمی ہو گی کہ اس دفعہ میں وہ تمام آیات قرآنیہ (جو حوالہ کے طور پر دی گئی ہیں) کا سورۃ لمہر اور آیت نمبر دیکھ لیں۔ خلافت مرقومہ سورۃ بروج نمبر ۸۵ آیت نمبر ۲۱-۲۲-۲۳

اسی غامض آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ اِقْرَأْ (یعنی پڑھ) حضورؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس کے بعد خود حضورؐ نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھ پر کڑا اور مجھے اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے مجھے پھر کڑا اور دوبارہ اس زور سے بھیجا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ اِقْرَأْ، میں نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر اس نے مجھے تیسری مرتبہ کڑا اور بھیج کر چھوڑ دیا، پھر کہا:۔

”اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ ۝ وَكَرَّمَكَ

اِنَّكَ لَكَرِيْمٌ ۝“ (۱۰۶: ۱-۵)

پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجھڑوں سے پیدا کیا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔ ۱۰۶۔

یہ آپؐ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو ”فترتِ وحی“ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں آیا تھا، آپؐ کو آسمان و زمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس نے سورۃ مائدہ کی آیات آپؐ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

آپؐ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہوگا کہ کسی سورۃ کے ساتھ کئی اور مدنی آیات آئی اور کسی کے ساتھ مدنی لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے مفسرین کی اصطلاح میں ”مدنی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو آپؐ کے بعض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی، اور ”مدنی آیت“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی، بعض لوگ کئی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور مدنی کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اتاری، لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انھیں کئی کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات مدنی، موقات یا سفر معراج کے دوران نازل ہوئیں وہ بھی کئی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ جو آیتیں سفر ہجرت کے دوران مدینہ کے رہتے میں نازل ہوئیں ان کو بھی کئی کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ مدنی ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپؐ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپؐ مدینہ طیبہ سے سیکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں مدنی ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ ان آیتوں کو بھی مدنی کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوہ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے معانات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی (۱۸۰) اللہ یا مَوْکِدًا لِّقَوْمِکَ الَّذِینَ اٰمَنُوْا اَلَمْ یَکُنْ لَّکَ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ اَلَمْ یَکُنْ لَّکَ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ اَلَمْ یَکُنْ لَّکَ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ اَلَمْ یَکُنْ لَّکَ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ (۱۸۰/۱)

بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری کئی یا پوری کئی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورۃ مدثر پوری مکتی ہے، اور سورۃ آل عمران پوری مدنی، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت کئی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورۃ اعراف مکتی ہے، لیکن اس میں وَشَعَلُھُمْ عَنِ النَّارِ یَۤاَیُّہَا النَّاسُ کَانَتَ حَاجِزَۃً بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہُمْ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا اَنْفُسَکُمْ مِنْ اَنْفُسِہُمْ اَوْ کُمْ اَلَمْ یَکُنْ لَّکُمْ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ اَلَمْ یَکُنْ لَّکُمْ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ اَلَمْ یَکُنْ لَّکُمْ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ اَلَمْ یَکُنْ لَّکُمْ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ ۚ (۵۵: ۲۲-۵۵)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکتی یا مدنی ہونا عمرائے اس کی اکثر آیتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا ہونا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اُسے مکتی قرار دیدیا گیا، اگرچہ بعد میں اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں ہوں۔

(مثال العرفان ۱۹۲)

کئی مدنی آیتوں کی خصوصیات علماء تفسیر نے مکتی اور مدنی سورتوں کا استفادہ کر کے انکی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکتی ہے یا مدنی، ان میں سے بعض خصوصیات قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعد کلیہ یہ ہیں:۔

- (۱) ہر وہ سورت جس میں لفظ ”مکلا“ (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکتی ہے، یہ لفظ بندہ سورتوں میں ۲۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔
- (۲) ہر وہ سورت جس میں ”خفی“ (مکمل) کے مطابق کوئی سورت کی آیت آئی ہو، مکتی ہے۔
- (۳) سورۃ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ کا واقعہ مذکور ہے وہ مکتی ہے۔
- (۴) ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔
- (۵) ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اور مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

- ۱۔ مکتی سورتوں میں عموماً ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ“ (اے وگہ) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مکتی سورتوں میں ”اَلَمْ یَکُنْ لَّکَ اِلٰہٌ اِلَّا اَنْتَ“ (اے انسان والو) کے الفاظ سے۔
- ۲۔ مکتی آیتیں اور سورتیں عموماً جھوٹی جھوٹی اور مختصر ہیں اور مدنی آیات و سورتیں اور مفصل ہیں۔

یہ قاعدہ اتفاق وغیرہ سے ناخوہ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی رو سے سورۃ حج مکتی ہے لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صاحبِ ذہن سے مروی ہے، تو وہ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔

۲۔ مکی سورتیں زیادہ تر توحید و رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پھیلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، چار و قاتل کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

۳۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر مقامات پرستوں سے بڑا اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔
۴۔ مکی سورتوں کا اسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، اس میں استعارات و تشبیہات اور تمثیلس زیادہ ہیں، اور ذخیرۃ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتاً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بہت پرستوں سے تھا، اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بہت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شان و اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ بحوق درجہ جو اسلام کے سامنے تلے آ رہے تھے، علمی سطح پر بہت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اس کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔

قرآن کریم کا تدریجی نزول پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور تدریجاً نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً بیس سال میں اتارا گیا ہے، بعض اوقات جبریل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جزے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی آیتیں بیک وقت نازل ہوجاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقل نازل ہوا وہ **قوله اولی الصلوة** (نساء: ۹۵) ہے جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا کر دوسری طرف پوری سورۃ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے (ابن کثیر ۲/۱۱۲)۔

قرآن کریم کو کیا رنگ نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَزِلْ زَنَّا عَلَيْهِ الْفُرْآنَ جُمْلَةً فَاجْهَلْ كُنَّا لَكَ لُتُيْتِ بِهِ كَوْلَاكَ وَرَقْلُكَ كُرْتِلَا وَكَانَ يَتْلُو بِمِثْلِ الْإِلَٰ

يُحْمَلُونَ بِالنَّجَىٰ فَتَحْسَنُ تَفْسِيرُهُ (العنقران: ۲۳ و ۲۴)

”اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے، تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے۔“

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو چھتیں بیان فرمائیں ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے ان پر قورات ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی۔

(۲) اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہوجاتی، اور یہ اچھا نہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبریل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویت قلب کا سبب بنتا تھا۔

(۴) قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات متعلق ہے اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بعیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہوجاتی تھی (تفسیر کبیر ۶/۳۳۱)۔

شان نزول قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انفرادی طور پر نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ ان کے نزول کا سبب نہیں بنا، دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جیسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہیے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں ”سبب نزول“ یا ”شان نزول“ کہلاتا ہے، مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَشْيَاءَ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ تِلْكَ اُمَّةٌ مِّنْ قَبْلِهِمْ مَّشَرَكًا وَلَٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَٰكِنَّا مُتَّبِعُونَ
مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایسا نہ لے آئیں اور بلاشبہ ایک مؤمن کینز ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ مشرک تمہیں پسند ہو۔“

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غوثی کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مرتزطیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انھیں غناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں، مرتزطیبہ تشریف لاکر حضرت مرثدؓ نے آپ سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی، (اسباب النزول لخواجہ ۷ ص ۳۸)

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ”شان نزول“ یا ”سبب نزول“ ہے، قرآن کریم کی تفسیر میں ”شان نزول“ نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس دقت تک سمجھ طور سے سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک اُن کا شان نزول معلوم نہ ہو۔

قرآن کریم کے سات حرف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے امت محمدیہ (علیہا السلام) کو ایک ہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بوزغھار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آگئے، اور انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبریل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو دو حرفوں پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگا ہوں، میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی امت قرآن کو سات حرفوں پر پڑھے، پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت درست ہوگی، (بحوالہ مناب العرفان ۱۲۲/۱)

سات حرف سے مراد سات نوعیتیں ہیں چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أَنْزَلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَافْرَعُوا مَا تَشَاءُونَ مِنْهُ

(صحیح بخاری ص ۳۵۲ القسطلانی ۴/۲۵۲)

”یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمھارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حرفوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ابلی علم کے مختلف اقوال ہیں، لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اُن میں باہمی فرق و اختلافات کل سات نوعیتوں پر مشتمل ہیں، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

- (۱) اسماء کا اختلاف: جس میں افراد، تشبیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ ہے اور دوسری قراءت میں تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ۔
- (۲) افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر مثلاً ایک قراءت میں تَبَيَّنَّا لِعَيْنِ بَيْنَ أَشْقَارِ قَا ہے اور دوسری میں تَبَيَّنَّا لِعَيْنِ بَيْنَ أَشْقَارِنَا۔
- (۳) وجود و اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یا زیر بر پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا يُضَاهَاكَ بَيْتٌ كَلِمَةً وَلَا يُضَاهَاكَ كَلِمَةً وَلَا يُضَاهَاكَ كَلِمَةً وَلَا يُضَاهَاكَ كَلِمَةً۔
- (۴) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو، مثلاً ایک قراءت میں تَجَوَّزْتُ فِي تَجَوُّزِهَا الْكَلِمَاتُ ہے اور دوسری میں تَجَوَّزْتُ فِي تَجَوُّزِهَا الْكَلِمَاتُ۔
- (۵) تقدیم و تاخیر کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ اور وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ۔
- (۶) بدلیت کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً تَبَيَّنَّا لِعَيْنِ بَيْنَ أَشْقَارِ قَا اور تَبَيَّنَّا لِعَيْنِ بَيْنَ أَشْقَارِنَا اور تَبَيَّنَّا لِعَيْنِ بَيْنَ أَشْقَارِنَا۔
- (۷) احوال کا اختلاف: جس میں تغنی، ترقین، الماد، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے مثلاً مؤنثی کو ایک قراءت میں مؤنثی کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہر حال: اختلاف قراءت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی تھیں

لہٰذا ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلہ کی مطبوعہ تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”علم القرآن احقری مفصل کتاب ۱۳“

اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے ان سب اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دیدی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا ذکر کیا کرتے تھے جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو مرتبہ ذکر فرمایا، اس ذکر کو عوضۃ اخیرہ کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی شراعتیں منسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک قرات کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوت قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہد خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتوں پر لفظی اور زبر و پیش نہیں ڈالے، تاکہ اپنی مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو شراعتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں ان کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قراءت کے مطابق، ائت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قراءت ایک مستقیل علم بن گیا، اور سینکڑوں علماء، قراء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

قراءت میں قبولیت کا معیار دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں پیچھے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اپنی

تلاوت لکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح "علم قراءت" کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خط کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءت سے رجوع کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری اہمیت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ "قراءت" قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:-

۱) مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

(۲) عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

(۳) وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو، اور ائمہ قراءت میں مشہور ہو جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جزء نہیں سمجھا جاسکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قراءت اس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان شراعتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبیدہ قاسم بن سلام، امام ابو حاتم مجتہانی، قاضی بخاری اور امام ابو جعفر طبرانی نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر ابن مجاہد (متوفی ۲۴۱ھ) نے ایک کتاب لکھی، جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، ان کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہد نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، ان کا منشأ یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قراءتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ "سبعة احوت" کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے ہی سات قراءتیں مراد ہیں، جنہیں ابن مجاہد نے جمع کیا ہے، حالانکہ صحیح بتایا جاسکتا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصہ ہیں، درجہ ہر وہ قراءت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح قابل قبول اور ان سات حرمت میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات شراعت بہر حال علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:-

(۱) نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے مشرالیس تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہ راست حضرت ابی بن کعب، عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالون (متوفی ۲۳۱ھ) اور ابو سعید دریش (متوفی ۲۴۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۲) عبد اللہ بن کثیر الداری (متوفی ۲۴۱ھ) آپ نے صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، عبد اللہ بن زبیر، زید اور ابوالوہب انصاری کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بڑی اور قنبل زیادہ مشہور ہیں۔

(۳) ابو عمرو زبان بن العلاء (متوفی ۲۵۱ھ) آپ نے حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر کے

واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ اور اُن کی کعبہ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قرات بقصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قرات کے راویوں میں ابو عمر الدوریؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور ابو شیبہؒ (متوفی ۲۴۰ھ) زیادہ مشہور ہیں،

(۴) عبد اللہ المحضیؒ جو ابن عامر کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۳۸۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعان بن بشیرؒ اور حضرت وائکم بن اسقعؒ کی رایت کی تھی، اور قرات کا فن حضرت مینو بن شہاب مجزویؒ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قرات کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قرات کے راویوں میں ہشامؒ اور ذکوانؒ زیادہ مشہور ہیں۔

(۵) حمزہ بن حبیب الزیات مولیٰ عمر بن ربیع النخعیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ سلمانؓ عیش کے شاگرد ہیں، وہ بھی بن وثابؒ کے 'وہ زربن مجیش' کے اور انھوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشامؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور غلاب بن خالدؒ (متوفی ۳۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

(۶) عامر بن ابی الجعد الاسدیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ زربن مجیش کے واسطہ سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؒ اور ابو عبد الرحمنؒ صلی کے واسطہ سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قرات کے راویوں میں شعبہ بن عتاشؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور حفص بن سلمانؒ (متوفی ۳۸۸ھ) زیادہ مشہور ہیں، آجکل عربی تلاوت ابھی حفص بن سلمانؒ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

(۷) ابو الحسن علی بن حمزہ الکسانیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) ان کے راویوں میں ابو الحارث مروزیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) اور ابو عمر الدوریؒ (جو ابو عمرو کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، نوخر الذکر تینوں حضرات کی قراتیں زیادہ ترک و تہ میں رائج ہوئیں۔

دلیل اور چودہ قراتیں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان شائے کے علاوہ ادھیچ کی قراتیں تو اتر ادریج ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی صحیح قراتیں ان شائے ہی

میں خاص ہیں تو متعدد علماء (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابو یوسفؒ) نے ان شائے کے بجائے دس قراتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ قرات شمرہ کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دس قراتوں میں مندرجہ بالا شائے قرات کے علاوہ ان میں حضرات کی قراتیں بھی شامل کی گئیں:-

- (۱) ابو جعفر زید بن العقیقؒ (متوفی ۳۸۸ھ) ان کی قرات مدنیہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔
- (۲) یعقوب بن اسحق حضرمیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) آپ کی قرات زیادہ قرقرہ میں مشہور ہوئی۔
- (۳) خلف بن ہشامؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو حمزہ کی قرات کے بھی راوی ہیں، آپ کی قرات کو تہ میں زیادہ رائج تھی۔

اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی شراہ میں سے کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قرات کی شراہ تو ان کا اضافہ کیا:-

- (۱) حسن بصریؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جن کی قرات کا مرکز بقصرہ تھا۔
- (۲) محمد بن عبد الرحمن ابن محضؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا۔
- (۳) یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بقصرہ کے باشندے تھے۔
- (۴) ابو الفرج شنبوزیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔

بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوزیؒ کے بجائے حضرت سلمانؓ عیشؓ کا نام شامل کیا ہے، ان میں سے پہلے دس قراتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں و منابل العرفان بحوالہ منجد المقرنین لابن الجریؒ:-

تایخ حفاظت قرآن

عبدالرسالت میں قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کرا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عبدالرسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے

چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ اُس کے الفاظ کو اُس وقت دہرائے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر سورہ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپؐ کو عین نزول وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دہرائے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپؐ میں ایسا حافظ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزول وحی کے بعد آپؐ اُسے بھول نہیں سکیں گے، چنانچہ یہی ہوا کہ اُدھر آپؐ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور اُدھر وہ آپؐ کو یاد ہو جائیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپؐ مزید حیات کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اُس سال آپؐ نے دوسرے مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ ذکر کیا۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۶ ج ۱)

پھر آپؐ صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انھیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ

ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی ہر طلب نہیں کیا کہ وہ انھیں شکرانہ کریم کی تعلیم دیں گے، سینکڑوں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوائے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے پڑھتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپؐ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے جوگے فرمادیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور سجدہ نبویؐ میں قرآن سیکھے سکھانے والوں کی آوازیں کا اتنا شور مچنے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی غلط پیش نہ آئے (مشاہد القرآن ۱/۲۳۲)

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہو گئی جسے قرآن کریم از بر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ، مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمر بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت معاذ بن عمروؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن اسبابؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظہ کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیباچوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوت حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچیں۔

کتابتِ وحی قرآن کریم کو حفظ کرنے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھنے کا بھی خاص ہتمام فرمایا، حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کو سخت گرمی لگتی، اور آپؐ کے جسم اطہر پسینہ

سلہ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "علوم القرآن" احقر کی مفصل کتاب۔

کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپؐ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈے کی کوئی ہڈی یا کسی اور چیز کا ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ نکھواتے رہتے، اور میں نکھاتا جاتا، پہلا ٹکڑا جب میں نکھ کر فارغ ہوتا تو شکرانہ کو نقل کرنے کے بعد جسے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہر حال، جب میں فارغ ہوتا تو آپؐ فرماتے "پڑھو" میں پڑھ کر سناٹا، اگر اس میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپؐ اس کی اصلاح فرمادیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے (مجمع الزوائد ۱/۵۶۱ بحوالہ طبرانی)

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے جن میں خلفائے راشدین، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاذ بن جعفرؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ۱/۸۷ اور زاد المعاد ۲/۱۲۱)

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپؐ وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے (فتح الباری ۱/۸۷) اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں (ایضاً ۱/۸۷)

اس طرح عہد رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہؓ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے آیات قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیات قرآنی لکھی ہوئی تھیں (تسلسلہ اسلام، حضرت ابو بکرؓ کے عہد) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے

مجمع شکرانہ

کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ پھل پر نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوتی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔ اس بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم

کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انھوں نے یہ کارنامہ جن حرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یتامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک روز مجھے بیٹھ کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمرؓ نے ابھی آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یتامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کر دینے کا کام شروع کر دیں، میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمرؓ کی ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”تم لو جو ان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمھارے ہائے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انھیں جمع کرو۔“

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھولنے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ، مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اس رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کچھ روکی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں پر قرآن کریم کو جمع کیا (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن)۔

جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کا طریق کار
اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو ابھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ نیچے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سیکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا۔

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انھوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں

روح نہیں کی جب تک اس کے متوازن ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انھیں یک جا فرمایا تاکہ دنیا و آخرت ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی ہو جو ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

(۱) سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔
(۲) پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگادیا تھا اور جب کوئی شخص کوئی آیت لیکر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے (فتح الباری ۱/۹ بحوالہ ابن ابی داؤد)۔

(۳) کوئی بھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔ (اتقان ۱/۶)۔

(۴) اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے (البرہان فی علوم القرآن للرحمنی ۲/۱۲۳)۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار زمین میں رہا تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب ابھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ سورۃ براءہ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْا کہ یہ آیتیں سوائے ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔ اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جس پر قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آ رہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تو اتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے پاس آیات قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، کسی اور

کے پاس نہیں (البرہان ۱/۲۳۷ و ۲۳۸)۔

ام کی خصوصیات

بہر کیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا (تھان ۶۰/۱) لیکن ہر ضرورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لیے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو "ام" کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

- (۱) اس نسخہ میں آیات قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی (القان، حوالہ بالا)۔
- (۲) اس نسخہ میں سورتوں کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے (مناہل العرفۃ ۱/۲۲۶)۔

- (۳) اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔
- (۴) اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکرؓ کے لکھوانے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انھیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؓ نے اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے، اور اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکمؓ نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہیے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔ (فتح الباری ۱۶/۹)

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عتب سے حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن شکل کر رہا اور ابرار کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا ہرگز علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے، جنکی بدلت انھیں اسلام کی نعمت حاصل ہوتی تھی، اور آپ بھی بڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرامؓ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لیے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انھوں نے صحف سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی

پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم شات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر سرتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لیے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایات حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے، اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے، حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیسا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ آپ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوئی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ نے خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دوسرے معلم نے دوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہ کو جمع کر کے ان سے شورو کیا اور فرمایا کہ: مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتی ہیں

کر میری قراءت جہاں قرات سے بہتر ہے، اور یہ بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں کی اس بات میں کیا رائے ہے؟ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے کیا سوچا ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی اختلاف اور فتنہ پیش نہ آئے، صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجباً مقدر ہو، اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے، جو صحیفہ موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم ان کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں قریش تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ تجب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو رہی ہے اس میں اختلاف ہو کہ کوئی لفظ کس طرح لکھا جائے؟ تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے۔

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخے تیار ہوئے ان میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو قریب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا (مسند رک ۲/۲۲۹)

(۲) قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراتیں

لے یہ پوری تفصیل اور اس سلسلے کی تمام روایات فتح الباری ص ۱۱۳ تا ۱۱۹ سے ماخوذ ہیں۔

سجائیں، اسی لئے ان پر نہ فقط لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر زبریں) تاکہ اسے تمام متواتر قراتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً مسرھا لکھا تاکہ اسے نثراً اور منثراً ہاد دونوں طرح پڑھا جاسکے کیونکہ یہ دونوں شرائطیں درست ہیں (ماہل العرفان ۱/۲۵۳ و ۲۵۴)

(۳) اب تک قرآن کریم کا مکمل معیار نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا، صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور پر مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم سجستانیؒ کا ارشاد ہے کہ مکمل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا (فتح الباری ۱/۱۱۹) (۴) مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر قراہی صحیفوں کو سامنے رکھا

جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی نسخہ کا اختیار کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سر نو مقابلہ کر کے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۃ احزاب کی ایک آیت

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ بَرِيءٌ يَوْمَ يَعْلَمُونَ کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں کہ مصحف لکھتے وقت سورۃ احزاب کی وہ آیت نہ مل جی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، اس سے صحت واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفہ لکھے گئے

ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اس وقت تک نہیں لکھی جب تک ان

تحریروں میں سے کسی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی تھیں، لیکن سورۃ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

(۵) قرآن کریم کے یہ متعدد معیار نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ

تمام انفرادی نسخے بذراآت فرمادیے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط مسلمہ قرار توں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری اہمیت نے بہ نظر احسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ملتا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-
 ”عثمانؓ کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انھوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا،“ (ریخ الباری ۱۵/۹)

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات
 حضرت عثمانؓ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اہمیت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؓ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر و بر پیش سے خالی تھے، اس لئے اہل عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف ادغام گئے، جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطہ
 اہل عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، اور پرہیز دارے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انھیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، اور سیاق و سباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں ہستیا ز بھی بہ آسانی ہو جاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں، کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطہ ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا اور ابراہانؓ (۱۲۰/۱) بعض کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین کے تحت کیا (اصح الاصح ۱۵۰/۳) اور بعض نے کہا ہے کہ کوثر کے گورنر زید بن ابی سلیمان نے ان سے یہ کام کر لیا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ اے اس کی تفصیل کے لئے احقری فضل کتاب علوم القرآن، ملاحظہ فرمائیے۔

عجاج بن یوسف نے حسن بصریؒ، یحییٰ بن یعربؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ کے ذریعہ انجم دیا (تفسیر القرطبی ۱۶۱/۱) **حرکات**
 نقطوں کی طرح شروع میں دستور آن کریم پر حرکات (زیر و بر پیش) بھی نہیں تھیں اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام عجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعربؒ اور نصر بن عاصم لیثیؒ سے کرایا (دستور طبعی ۶۲/۱)

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دؤلیؓ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آجکل رائج ہیں، بلکہ زیر کے لئے حروف کے اوپر ایک نقطہ (ن) زیر کے لئے حروف کے نیچے ایک نقطہ (پ) اور پیش کیلئے حروف کے سامنے ایک نقطہ (د) اور تنوین کے لئے دو نقطے (ت یا یا یا) مقرر کئے گئے۔

بعد میں خلیل بن احمدؒ نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں (صحیح الاصحی ۱۶۰/۳ و ۱۶۱/۱)۔ اس کے بعد عجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعربؒ، نصر بن عاصم لیثیؒ اور حسن بصریؒ رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر و بر پیش کی موجودہ صورتیں معشر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ بحجۃ اعلم۔

احزاب یا منزلیں
 صحابہؓ اور تابعینؓ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار معطر کی ہوئی تھی جسے ”جزب“ یا ”منزل“ کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو مکمل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا (البرہان ۲۵۰/۱)

اجزائے پالے
 آجکل قرآن کریم تین اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تین پالے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تین مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے، بعض کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تین پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تین مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زائد کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدر الدین زکریاؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تین پالے مشہور چلے آئے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے (البرہان ۲۵۰/۱ و مناقب العرفان ۳۰۲/۱) لہذا ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

اُخماس اور اعشار

قرآن اولیٰ کے تشریحی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد دھماکے پر لفظ "مخمس" یا "خ" اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھ دیتے تھے، پہلی قسم کی علامتوں کو "اُخماس" اور دوسری قسم کی علامتوں کو "اعشار" کہا جاتا تھا۔ منہاجل احقران (۳۰۳/۱) علامتہدین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہو کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون نے اس کا حکم دیا تھا۔ البرہان (۲۵۱/۱) لیکن یہ دونوں اقوال اس درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہ کے زمانے میں "اعشار" کا تصور ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں "اعشار" کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۲۹۷)

رکوع

"اُخماس" اور "اعشار" کی علامتیں تو بعد میں متروک ہو گئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہوا وہاں رکوع کی علامت (دھماکے پر حررت) بنا دی گئی، احقر کو جب جو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رکوع کی ابتداء کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو "رکوع" اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رکوع کیا جائے، پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں شب میں تشریح قرآن کریم ختم ہو سکتا ہے۔ رفتادنی عالمگیر یہ فصل المزادج (۹۱۳/۱)

رموز اوقاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (دانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو "رموز اوقاف" کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غریبی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ نہ اس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رموز شب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد عہ

فتاویٰ عالمگیری میں مشائخ بخاری کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ بیان کی گئی ہے، لیکن جب قرآن کریم کے رموز بخاری و قسیمی کی تعداد ۵۵۸ پائی، اور بعض اسماء میں خط میں لکھا کہ ان کی تعداد ۵۵۸ رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے، ہو سکتا ہے کہ رکوع کی علامت لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو، واللہ اعلم
۱۲/۱۲/۱۴۲۸ھ

بن طہور سجادی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے۔ والنشر فی القرائت العشر (۲۲۵/۱) ان رموز کی تفصیل یہ ہے: ط: یہ "وقف مطلق" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج: یہ "وقف جائز" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔
ن: یہ "وقف مجوز" کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص: یہ "وقف مخصص" کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ جو تکمیل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دو سر مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے۔ (المخ العشر، ص ۱۶۳)

مر: یہ وقف لازم" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے، بعض حضرات اسے وقف واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقات میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (النشر، ص ۲۳۱)

لا: یہ "لا یقف" کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ "یہاں نہ ٹھہرو" لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتداء کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ ٹوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتداء کرنا مستحسن نہیں۔ (النشر، ص ۲۳۳ ج ۱) لہ

ان رموز کے باقی میں تو یقینی طور پر ثابت ہو کہ یہ علامہ سجادی کے وضع کئے ہوئے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:-

مع: یہ "معانقہ" کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے، جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں، مثلاً: لَکَ مَثَلُ مِمَّنْ فِی النَّوْرِۃِ وَ مَثَلُ مِمَّنْ فِی النَّجْمِۃِ۔

نم: زیم آخر جہ شطآنہ الخ اس میں اگر النورۃ پر وقف کر لیا تو لَکَ مَثَلُ مِمَّنْ فِی النَّجْمِۃِ پر وقف درست نہیں، اور اگر النَّجْمِۃ پر وقف کر لے تو النَّوْرِۃ پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف کرنا تو درست ہے، اس کا ایک نام "مقابلہ" بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشان دی

لہ: ۱۰ حرم دائرہ یہ علامت آیت ہے۔ ناشر

امام ابو الفضل رازی نے فرمائی ہے (النشر ص ۲۳۴ ج ۱ والاتقان ص ۸۸ ج ۱)

سکتہ : یہ "سکتہ" کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔ وقفہ : اس جگہ "سکتہ" سے قدرے زیادہ دیر تک رکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔ ق : یہ "قیل علیہ الوقت" کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقفہ ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

وقف : یہ لفظ "وقف" ہے جس کے معنی ہیں "بٹھ جاؤ" اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

صلی : یہ "الوصل اولى" کا مخفف ہے جس کے معنی ہیں کہ "ملا کر پڑھنا بہتر ہے"۔ صل : یہ "وقتی یوصل" کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ بٹھرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف المتبی صلی اللہ علیہ وسلم : یہ ان مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

قرآن کریم کی طباعت جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کے لئے مستقبل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہیبرگ کے مقام پر ۱۳۷۷ھ میں قرآن کریم طبع ہوا جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۸۷۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۷۸ء میں ایران کے شہر تبریز میں قرآن کریم کو پھر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن لکھنؤ ص ۸۶، علوم القرآن، ڈاکٹر محمدی صالح لود و ترجمان غلام احمد زبیری ط ۱۳۸۱ھ

علم تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علم تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں، عربی زبان میں "تفسیر" کے لفظی معنی ہیں "بکھولنا" اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جاتے ہیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے (البرہان) قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے :-

وَكَشَرْنَا لَكَ الْكِتَابَ الَّذِي كُنَّا يُبَيِّنُ لِّلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ (۲۴:۱۶)

"اور ہم نے قرآن آپ پر اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں دھانت سے بیان فرمادیں جو ان کی طرف اتاری گئیں ہیں"۔

پھر قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

فَعَلَّمَ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا

عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَبَيِّنَ لَهُمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۱۷۴:۲)

"بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور

انہیں اللہ کی کتاب اور دلائل کی باتوں کی تعلیم دے"۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں جوہن اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی لغیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابہ کرامؓ کو جہاں کوئی دشواری پیش آتی وہ آپ سے رجوع کرتے اور انہیں تسلی بخش جواب مل جاتا، لیکن آپ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ امت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور پھر دیگر لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریک کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس امت نے یہ کارنامہ اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں رہے بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینان و ملاح کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیر قرآن کے مآخذ علم تفسیر اس امت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کسی کسی شقیں اٹھائیں؟ اور یہ چند جدید کتنے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں، لیکن یہاں مختصراً یہ بتانا ہے کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہزار ہاں میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے مستفاد کیا ہے، یہ سچے سچے ہیں۔

۱۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجس اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کی دعا میں یہ جملہ موجود ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" یعنی ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور سے متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی: "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اٰتٰیْنَا الْكِتٰبَ وَهَدٰیْنَاھُمْ سُبُلَھُمْ وَفَعَلْنَا بَعْضَھُمْ فَاٰیٰتٍ لِّبَعْضٍ وَفَعَلْنَا فَاٰیٰتٍ لِّبَعْضٍ" (۱۶: ۴)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔ چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲۔ حدیث

"حدیث" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہو، اس لئے مفسرین کرام نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے بزرگ مسیحی زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری دائر نہ ہو، لہذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم

لے اس پہلے علم القرآن پر محقق مفضل کتاب ملاحظہ فرمائیے۔

کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہو سکتی ہے، اور حقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا اپنی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳۔ صحابہ کے اقوال

صحابہ کرام نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کے وقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اور اس میں منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابل اعتماد ہو سکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا جن آیتوں کی تفسیر ان یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرام کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر صحابہ کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں، اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد اصول فقہ، اصول حدیث اور اصول تفسیر میں مدد توں ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعین کے اقوال

صحابہ کے بعد تابعین کا ممبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام سے سنی ہے، اس لئے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعین کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ (الاتقان ۲/ ۱۷۹) لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لغت عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی زبان نزول یا کوئی اور لغت یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے ان کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ و تابعین کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ ان کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں عیاں کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبر اور استنباط

تفسیر کا آخری مآخذ "تدبر اور استنباط" ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا احسب

نہایت کمزور، جس کی کوئی حد نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے آتے ہی آتے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرام اپنے اپنے تذکرے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ کاغذ سے متصادم نہ ہوں، لہذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت، اجماع، اجتہاد و تابعین کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاء نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن ائمہ کے محقق علماء نے انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی (راتقان ۱۸۷/۲)

اسرائیلیات کا حکم "اسرائیلیات" ان روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں و عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، پہلے زمانے کے مفسرین کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کے وہ روایات نکھ دیتے تھے جو انھیں سند کے ساتھ پہنچی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے ان کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام اور تابعین پہلے اہل کتاب کے مذہب تک تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انھیں قرآن کریم میں پچھلی آیتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انھوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انھوں نے اپنے پڑلے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات اسرائیلیات کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں حافظ ابن کثیر نے جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

(۲) وہ روایات جن کا بھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ وَمَا كَفَرْنَا بِكَ وَلَا بَاطِلٌ لَكَ مِنَ الْإِيمَانِ (۱۱۲:۱۱۳) داود سلیمان کا کافر نہیں ہوتا، بلکہ شیطاں نے سحر کیا، اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار اور یاکی ہوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مردار اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہوا اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

(۳) وہ روایات جن کے بارے میں قرآن و سنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ قورات کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات کو نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیر نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انھیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں (مقدمہ تفسیر ابن کثیر)

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے خود صرف اور بلاغت اور کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک دبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف بولی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی مشہور کتبہ دالے لوگ جنھیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف میں ہوتے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پڑانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے دپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں بچتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت ہلک گمراہی کی طرف لیجاتا ہے، دنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو دنیا کا کوئی خاص مفصل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سمجھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی دان انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آ سکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر

ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کرے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ :-

وَقَدْ يَسْرُنَا اَنْفَعُ لَنَا اَللّٰهُ كَرِيْمٌ (۱۱:۵۴)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے

آسان کر دیا ہے۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہو تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات و قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائنداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیرے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے، مذکور بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ لِلَّذِي کر نصیحت کے واسطے اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں، بیشک اسلامی علوم میں بصیرت اور بینش حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبد الرحمن سہلیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے یہیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور علمی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ :-

فَعَلَّمَنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا

”ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا پڑھا اور اتمام (۱۱:۶۲)“

ہمارے مولا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۃ بقرہ یاد کرنے میں پورے ۱۸ سال صرف کئے، اور مسند احمدؒ میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا (انسان ۱۶۷/۲ نور ۵۵) خود کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعرا و ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور ذہول دمی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود عالم قرآن بننے کے لئے باقاعدہ حضورؐ سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو تو زہد قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شد بد پیدا کر کے یا صرف ترجمہ و تفسیر قرآن بننے کا دعویٰ کرتی بستی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ :-

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بَغْيٌ فَلْيُعْلَمْ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعِدَهُ فِي النَّارِ

جو شخص قرآن کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے

(ابوداؤد، از اتفاق ۱۴۹/۲)

اور :- مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَاصْأَبَ فَقَدْ أَخْطَأَ

جو شخص قرآن کے معاملہ میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح

بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی (ابوداؤد نسائی، از اتفاق ۱۴۹/۲)

مشہور تفسیریں

عہد رسالت کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں بھی گئی ہیں، بلکہ دنیا کی کسی کتاب کی بھی کی خدمت نہیں کی گئی، حتیٰ قرآن کریم کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چر جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے، لیکن یہاں ہم ان اہم تفسیروں کا

مختصر تعارف کرنا چاہتے ہیں جو معارف القرآن کا خاص مآخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ معارف القرآن میں بار بار آیا ہو، اگرچہ معارف القرآن کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف ان تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر اس تفسیر کا اصل نام جامع البیان ہے، اور یہ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۲۵۴ھ) کی تالیف ہے، علامہ طبری اپنے اپنے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھتے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا (الامداد والنبایہ، ص ۱۴۵ ج ۱) بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے حلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تین جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول ان کے نزدیک راجح ہوتا ہے اسے دلائل کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں، البتہ ان کی تفسیر میں صحیح و دقیق ہر طرح کی روایات جمع ہو گئی ہیں، اس لئے ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انھیں دستیاب ہو سکیں ان سب کو جمع کر دیا جائے، تاکہ اس صحیح شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انھوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کر کے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

تفسیر ابن کثیر یہ حافظ عطاء الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، ان کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ کہ مصنف روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتب تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر سیوطی اس کا پورا نام "الجامع لاحکام القرآن" ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القزطی (متوفی ۸۹۴ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ میں امام مالک کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرہ آفاق تھے، اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انھوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب، بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے اور بار بار شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر کبیر یہ امام فخر الدین رازی (متوفی ۸۴۸ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام "مفاتیح الغیب" ہے، لیکن تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے، امام رازی متکلمین اسلام کے امام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقل اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دشمنی انداز میں قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیات قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابل قدر ہے، اغلب یہ کہ امام رازی نے سورۃ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا کر کے چنانچہ سورۃ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الحولی الدمشقی (متوفی ۸۴۸ھ) یکشنبہ نجم الدین احمد بن محمد القسطلی (متوفی ۸۴۸ھ) نے مکمل فرمایا (كشف الظنون ۲/۲۷۷)۔

امام رازی نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہو گئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان کی تفسیر پر تبصرہ کیا ہے کہ فیہ کل شیء الا الغیور (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، اگر حل قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا یہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انھوں نے جو براہمت کی راہ سے ہٹ کر آیات قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط یہ علامہ ابو حنیفہ غناطی اندلسی (متوفی ۸۴۸ھ) کی تصنیف ہے، جو اسلامی علوم کے علاوہ علم خود بلاغت میں خصوصی ہمارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں خود بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلافات اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

احکام القرآن للبخاری یہ امام ابو بکر جصاص رازی (متوفی ۸۴۸ھ) کی تصنیف ہے جو فقہ حنفی میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام مسائل کا استنباط ہے، اور انھوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف ان آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں، اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدر المنثور یہ علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام "الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور" ہے، اس میں علامہ سیوطی نے ان تمام روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین ملاحظہ فرمائیں جو جریہ امام لغوی، ابن مردودہ، ابن حبان، ماجہ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کر چکے تھے۔

علامہ سیوطیؒ نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، البتہ انہوں نے ردایا کیسکا انکی پوری سند ذکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقت ضرورت اس کی مراجعت کر کے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو بجا کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہو گئی ہیں، اور سند کی تحقیق کے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا، علامہ سیوطیؒ بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجہ کی ہے، لیکن چونکہ تنقید حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متکلم ہیں، اس لئے اس پر بھی کما حقہ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

تفسیر مظہری یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ متوفی ۱۲۸۴ھ کی تصنیف اور انہوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام تفسیر مظہری رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید انہوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان بھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

روح المعانی اس کا پورا نام "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و السبع المثانی" ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۲ھ) کی تصنیف ہے، اور میں جلدوں پر مشتمل ہے، انہوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے، لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علی گوشہ نشین نہ ہو، روایات حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

نفسہ۔ نے والے درس قرآنی کے متعلق جو سے فوائس کی گئی جس کو چنا خدا رنگ بنا پر میری جہسید ڈکوسا
پھر اٹھنے کے ایک دوسری چیز پڑی کی کردار ان دوس کے مسئلہ سے الگ ایک ہفتہ وادی دوس
بنام معارف القرآن چلی گیا جانتے جس میں پڑنے قرآن کی تفسیر میں لفظ پر مرکب ماسلمان
کی موجود ضرورت کے لئے لفظ خاص خاص آیات کا انتخاب کر کے ان کی تفسیر اور متعلق احکام بیان
پر کر کے، اسقر نے اس کو اس مشرق کے ساتھ منظور کر لیا کہ دوس کا کئی معادہ مذکور لگا اور کئی
یا بند کی کئی جدول نکروں گا جو میرے نزدیک وہی قرآن کے مناسب ہے، میں پڑھنے منظور کر لی گئی
منا مہذہ خالق ہے دوس بنام معارف القرآن ۳۳، شرال مشرق اور جلائی مشرق و مسمو سے
شرع ہوا اور تفسیر پر لگا ہوا سال یا بندی سے جاری کیا بیان ایک جہسید مشرق و مسمو میں دیکھ پستان
کی اپنی اپنی یا لیس کے تحت اس دوس کو تفسیر کر دیا گیا ہے، دوس معارف القرآن میری پڑنے اور میری
قرآن میری پڑنے ہو گیا جس میں انہی سے باروں کی شکل تفسیر میں ایک منتخب آیات کی تفسیر جس حق نے
اسی اور مانی آیات کو اس میں شامل نہیں کیا تھا جو خاص علی معارف میں پریشان تھی اور دیکھ پانی
تفسیر کے فوہر حوام کے نہ پڑنے کراس کا مشکل تھا، یا وہ آیات جو کر مسرت کی ہیں۔

جس وقت یہ کام شروع کیا کہ اس کا کوئی دور دو خیال تھا کہ یہ کسی وقت قابل
صورت ہو، ایک مشقی تفسیر کے انداز پر شائع ہوگی، مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس بشر پر نامزد ہوا
ہوا تو پاکستان کے سب ملاوٹوں سے اور ان سے لیا وہ طر مالک افریقہ، یورپ، وسطی میں پڑنے والے
مسلمانوں کی طر سے، یہ شہر خطوط اور دیکھ پاکستان کو اور نو و احقر وصول ہوتے ہیں جہسید معلوم
ہو کہ جہسید سے دیندار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس دوس سے بہت شغف دیکھتے ہیں، افریقہ
میں جو کہ یہ دوس آخر شہر یا کھن صیحا وادی کے وقت پہنچتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو
شیپ کر لیا وڈر کے لئے لکھنے ڈاکر کے بعد میں سب کو بار بار دیتے تھے، کا اہتمام کیا اور جہسید اس
کا اتفاق مٹا ہوا کہ اس دوس کو کسائی صورت میں شائع کیا جائے، عام مسلمانوں کے اس اشتیاق
نے اس کا کارہ کی ہمت بڑھادی اور امراض و مضع کے بارہو گیا وہ سال یکدہ مسئلہ پڑی پڑی
باجنٹھا مسئلہ ۴۴ اور مسئلہ ۴۵ جو جب دوس کا مسئلہ بند ہوا تو جہسید سے عزت کی طر سے یہ
تعاہد ہوا کہ جہسید پرکھتا ہے اس کو قابل صورت میں شائع کیا جائے، اور دوس میں پر آیات متحرک

گئی ہیں ان کی بھی جہسید کر دی جائے، بنام ہندیا لراہہ کر لیا کہ موجودہ پر نظر ثانی اور ورمیا سے
باقی نوہد آیات کی تکمیل کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۸۵ میں سورہ فاتحہ کی تفسیر
نظر ثانی مکمل ہوئی، اور سورہ بقرہ پر کام شروع کیا اس میں ان کا کئی آیات مشکل بہت ہیں جو
دیکھو پر تفسیر کی تقریر میں انہی نے تھیں، یہ کام بہت محنت اور فرصت کا متقاضی تھا، جہسید

مشاغل اور امراض نے فرصت دہی اور کفر مٹا یہ کام ڈیوٹی میں چڑ گیا۔

بہر حال یہ قدر ایک خدمت دہیوں مشرق و مسمو کے شعبہ میں، اسقر کے اسطو بد میں کچھ جہسید کی لکھی
بازاری چلی تفسیر کا سبب ہوئی، منوار ہوئی، اور دیکھ پڑنے چیز پڑی گئی، کفر و مسمو میں اس کے کھڑے
ہوئے سے معذور کر دیا، آخری آنکھوں سے بھی قضا ہوئے، مگر میں کچھ کرنا نہ ہوئے گئی، اس کے
ساتھ پاؤں میں لٹریں کا پڑتا دور شروع ہوا، اس کا جو علاج کیسے کا کر کر رہا تھا وہ میں کا مٹا
یہ ہوا اور وہ پاؤں سے معذور ہو گیا، تقریباً شش ماہ سے اس طرح معذور کی بیماری کے ساتھ
موت و حیات کی کشمکش میں لگا رہا، جب چلنے پھرنے اور کام سے معذور ہو گیا وہ زندگی کی اہم
بھی نہیں ہو گئی، قواب اس یا سوس پر ہوا کہ یہ تفسیر کی اور ان میں قدر پر چکے تھے ان پر نظر ثانی اور
تکمیل میں دوسرے اب یہ پاؤں کی پڑی ضائع ہو جائیں تھے، حق تعالیٰ نے قلب میں بہت عطا فرمائی
اور شرال مشرق و مسمو کے تفسیر پر اسطو طر سے اس کا کام شروع کر دیا، اور وہ دیکھ
مشرق و مسمو کو سورہ بقرہ کی تکمیل پر کر کے بہت دیکھتے تھے، دیکھ اس کے بعد میں
بیماری و معذور کی حالت میں یہ کام نہ کر سکتا تھا، چنانچہ اس کا کئی پرکھ کر اس کے ساتھ تک
میں جہسید اختیارات کی نیاس میں لگا ہوا، ایک طر فانا کھڑا کر دیا، میں اگر کچھ عرصہ روز سے سیاست
سے باہر نکلتا ہوں چکا تھا، مگر اختیارات نے پاکستان میں خاص اسلامی حکومت کے بجائے
کیونہم اور موشل اور پڑی چلنے کے ضرورت کی کر دیا، اور موشل پر مسمو اسلام باروں کے
کے لئے جہسید وچہا و دیکھ دیکھ میں ہو گئے، اس مسئلے کی اہمیت نے میرا پرکھ دیا اور وہ کہہ کہ انکم
اسلام اور موشل پر مسمو میں پڑی، اور مشرق و مسمو کے خطرات کا علاج سے قوم کو آگاہ کرنے کی حد تک
اس سیاسی میدان میں پڑنا چاہئے، اس کے لئے تفسیر کی مقالہ بھی بھیجے تھے، اور مشرق و مسمو
پاکستانی کے اہم مواقع میں جلسوں میں شرکت بھی کرنا پڑی، مسئلہ کی وضاحت اور تفسیر دیکھ
ہوئی ہوئی، مگر سیاست کے میدان میں مسافر اور محتاط نے بدوہ ضرورت کام کر کے وہی آگاہ
کا نتیجہ باکل خلافت اور پھر مسئلہ اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال کا اتفاق ہوا گیا، وکلیو
الکھن میں قتل کی صورت ہوئی۔

اختیارات کے بعد آخر نے میرا سیاست سے مستعفی ہو کر پتا یہ کام شروع کیا، اور پھر مشرق
علی کر کے جب مسئلہ تک میرا باروں کی معارف القرآن پر نظر ثانی اور دوس میں متروک آیات
کی تفسیر میں مکمل ہو گئی، اور سورہ آل عمران سے سورہ فتح تک وکلیو لکھی تفسیر میں کھسکی گئی
اب قرآن مجید حضرت کے قریب ہو گیا تو اس تعالیٰ نے بہت عطا فرمایا، اور باقی ملا لڑائی

تفسیر کتاب کی یہ تفسیر ہے، اس کے لئے تو کتب دیوانہ و دانشورانہ شکر گزار رہی کہ نے ایک تذکرہ
تجزیہ کر کے ان کے ذوق کی چیز بنائیں، اس کے باوجود اس نے لکھ کر ان کو میری اس جہاد سے کاندھ
معلوم کر دیا ہے۔

یہ کتاب پہلے عربوں کو لکھا ہوا ہے، مفسر قرآن پر مستقل تصنیف کے لئے جرأت کرنے کا جس
لئے درود و رحمت کوئی احتمال نہ تھا، مگر خیر الادی طور پر اس کے اسباب ہوتے چلے گئے، البتہ زمانہ گذر
کا ایک فرقہ ان میں بھی کہ عجم الوقت کبر و الملت تشری حضرت مولانا مفتوح علی صاحب قاضی
تفسیر سبزواری تفسیر قرآن جو ایک جہانگیر مختصر کر جائے تفسیر اور سلف صاحبین کا تذکرہ
کتاب پر ہے، لیکن وہ علمی ذہان اور علمی اصطلاحات میں بھی گئی ہے، آج کل کے عوام اس سے
مستفادہ کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں، اس کے مصنفین کو پہلے زبان پر آجی کر دیا جائے، مگر یہ کام بھی
فی الحمت اور فرصت چاہتا تھا، پاکستان میں آئے سے پہلے کچھ شروا بھی کیا پھر دیکھا تھا،
معارف القرآن کی اس تحریر نے جو فائدہ و کمزور وہیں پوری کر دی، جو کہ اس تفسیر کی بنا و مقرر نے
بیان القرآن ہی کو بنایا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

معارف القرآن کی خصوصیات و التزامات

۱۔ تفسیر قرآن جو طریقہ کے علاوہ کسی اور زبان میں جو اس میں مستحکم اور احتیاطی
جز قرآن کا ترجمہ ہے، کیونکہ وہ اس کے کلام کی حکایت ہے، اس میں ادنیٰ کسی کی ہوشی بھی اپنی
طوت سے زیادہ نہیں، اس لئے جس نے خود کو ان ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی، اور اس کی ضرورت
بھی نہیں تھی، کیونکہ اگر علماء کا کام بڑی جہاد کے ساتھ انجام دے چکے ہیں، اور وہ اپنی
اس خدمت کو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے وافر زہاد و جہاد حضرت شاہ ولیچہ انور
اور حضرت شاہ عبدالقادر نے اپنے اپنے لئے طرز میں اختیار کیا، وہ ان کی فکر ترجمہ میں بالکل خستہ لفظ
ترجمہ کو پیش کیا گیا، اور وہ کار و کار کی بھی زیادہ رعایت نہیں کی تھی، اور طریقہ کمال کے مع
قرآن کے الفاظ کو اور دوسری مثالیں فرمایا ہے، اور دوسرے ترجمہ میں تحت اللفظ کے ساتھ اردو
کار و کار رعایت بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبدالقادر نے چالیس سال میں محنت و فکر
پر کیا، اور یہاں تک کہ اگر آپ کا جہاد و جہاد سے تھکا ہے، وافر اصول و روئے بندہ کے پہلے مؤرخ کا
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا فرمایا ہے کہ علامہ ترجمہ ادا ہے، انسان کے ہر
بات نہیں کیا، اور ترجمہ کر کے، سب سے اعلیٰ العرب و اعلیٰ تفسیر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے
اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے مفادات بدل جانے کی وجہ سے لہجہ و لہجہ میں

قرآن کی ضرورت ہو، انہوں نے اسی طرح کی، یہ ضرورت ان کا بھی، جو ترجمہ معنیٰ لہجہ کے نام سے
ضرورت دیکھو، وہاں، اس قدر نے قرآن کریم کے زیر بحث اسی ترجمہ کو پسند لیا ہے۔

(۲) متبذری حضرت عظیم الامت مفتاح الادی قدس سرہ نے اصل تفسیر بیان القرآن کو اس
انداز میں لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تفسیر و توضیح تو قسین کے دریا
فرمائی ہے، ترجمہ کو اس کے اوپر ضرور کہہ کر دیکھو، جو قسین لکھ کر دیا گیا ہے، اس طرح
تھکا کثیرہ الفاظ میں ترجمہ فرمائیں، یہ اورینہ القومیل اس کی تفسیر ہے، بہت سے دلوں نے
اسی شکر کثیرہ ترجمہ کو لکھ کر قرآن مجید کے زیر بحث جو ترجمہ لکھنے کے نام سے خود محقر
کے زمانے میں شائع بھی کر دیا تھا۔

مجھے چونکہ بارہا بہت سرائی کی کہیں کامیاب پہلے سے پیش نظر تھا اس وقت احتیاط سے
کی اس تفسیر کو بنام مکتوبات تفسیر شروا میں، لیکن صرف ایک فقرہ کے ساتھ نقل کر دیا ہے،
دوہرہ اس تفسیر میں جس جگہ خاص مدح و تعریف کا شکل الفاظ میں ہے، وہاں اس کا سا نقل
میں منتقل کر دیا، اور اس کا نام علامہ تفسیر و کتا اس لئے مقرر کیا، جو ان کو حضرت نے خطبہ
بیان القرآن میں، اس کے مصنفین فرمایا ہے کہ اس کو تفسیر یا ترجمہ مقرر کیا جائے گا۔
اور اگر کوئی مفسر وہی خاص مدح و تعریف کا اس کو یہاں سے لکھ کر کے مقرر کرے

یہ اپنی آسانی عبارت میں لکھ دیا، تاکہ مفسرین کو ان کی زیادہ ضرورت ہو، اس علامہ تفسیر سے
ہی کو ان کے مفسرین قرآن کو دیکھ لیں، ان دو دلی چیزوں کا التزام جلد اول کی طبع اول میں باور
الکفر کے ترجمہ اولیٰ آیت نمبر ۴۴ معارف جلد اول صفحہ ۵۲ ایک نہیں ہو، مگر مکتوبات طبع
ثانی میں اس حصہ کو بھی شکل کر کے پوری تفسیر کے مطابق کر دیا گیا ہے، البتہ ایک التزام جو
جلد ثانی سے ضرور ہوا، جو کہ مفسر قرآن کے نیچے ترجمہ معنیٰ لہجہ لکھا جائے، یہ چلی طاعت کی پوری
جلد اول میں نہیں تھا، بلکہ ثانی میں اس کو بھی تحت المعنی لکھ کر سب کے مطابق کر دیا گیا،
یہ دونوں کام تو اکابر علماء کرتے۔

۳۔ تیسرا کام جو اس تحریر کی طوت سورب کچھ وہ تعداد و مسائل کا عنوان ہے، اس میں بھی
فرد کیا جائے، تو اس کی ضرورت اور وجوہات یہ ہے، منہا میں سب علماء مفسرین تفسیر سے ہونے
ہیں، جن کے حوالہ پر مکتوب دیتے ہیں، اس میں اس قدر چیزوں کا التزام کیا ہے،
۱۔ علماء کے لئے تفسیر قرآن میں سب سے پہلا اور اہم کام لغات کی تحقیق، غرضی
ترکیب، ادبی بلاغت کے نکات اور اختلاف قرائت کی کہیں جس پر علامہ باہلی علم کے لئے
نہیں قرآن میں سب سے اہم کیفیت رک ہیں، اسی کے ذریعہ قرآن کے صحیح مفہوم کو پہنچا سکتا

بسی عوام تو عوام ہیں اسکل کے بہت سے اہل علم بھی ان تعلیلات میں اہم حصہ نہیں کرتے ہیں، اہل علم کو عوام کے لئے تو یہ ہمیشہ ان کی اہم ہے باقادر اصل مقصد میں مکمل یابی میں وہ سمجھتے تھے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا مشکل کام ہے، حالانکہ قرآن کریم کو اصل مقصد یہ کہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ کوئی برا اور اس کے پیچھے میں مادی تعلقات اعتدال پر آجائیں کہ وہ میں کو رہ میں رکھوٹ نہ ہیں، وہ دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر پیدا ہوا اور انسان اپنے ہر عمل کی وضاحت پر سوچنے کا عادی ہو جاتا کہ اس میں کوئی چیز انشاء اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف تو نہیں، اس چیز کو قرآن نے انسان کو سکھایا کہ یہ کہ رسولی حکم پڑھا آدمی خود بخود کہہ کر اکل ان چیز جو ہاں میں کہیں ہے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے قرآن کریم کے خواص کا ہوا تو فرمایا ہے **وَلَقَدْ جَاءَكُمْ أَنْبَاءُ الْمَلَائِكَةِ بِالْحَقِّ فَكُنْتُمْ مِنْ شَكَّائِينَ** (۱۰۸: ۱۰۹) تفسیر علامہ قرطبی میں عوام کی ہولت کے پیش نظر قرآن میں اور اصلاحی چیزوں کی ہولت کی تعلیم نہیں دی گئی، بلکہ ان تفسیر کے افعال میں جسکو چاہتے تھے راجع قرار دیا ہے اس کے مطابق تفسیر کے معنی اور کوئی نہیں بخود سمجھ سکتے تھے کہ وہ ان میں اس کا حال رکھا گیا کہ بعض اعلیٰ اصطلاحات اور طرح و صفت اور مشکل الفاظ یاد آئیں، اور اس لئے ایسی مباحث علیہ کہیں چھوڑ دی گئیاں۔ جو عوام کے لئے غیر ضروری اور ان کی سطح سے بلند ہیں۔

(۱۱) مقتصد معتبر تفسیر سے ایسے معنائیں کو ماہیت کے ساتھ تعلق کیا گیا ہے جو انسان کے دل میں قرآن کی عظمت اور انشاء تعالیٰ اور اس کے رسول کی عظمت و رحمت کو چاہے اور قرآن پر عمل اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف مائل کریں۔

(۱۲) اس پر تو قرآن کا ایمان ہے کہ قرآن کریم کیا حد تک آئے والی فسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اور کیا حد تک پہنچا ہوئے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، لہذا جبکہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے، اور اس میں پورے تدبیر کے کام آیا جائے، اسی لئے ہر زمانہ کے علماء تفسیر نے اپنی اپنی تفسیروں میں ان کی جدید مسائل اور مباحث پر زیادہ زور دیا ہے قرآن کے زمانہ میں پیدا ہوئے یا بعد میں اپنی اہل کی طرف سے شکوک و شبہات کی صورت میں پیدا ہو کر آئے تھے، اسی لئے قرآن مسئلہ کی تفسیر میں معتزلہ، مجتہد، صفویہ وغیرہ فرقوں کی قریب اور ان کے شبہات کے انزال سے پرہیز فرمائی ہیں، اسی لئے ان کے اہل اصول کے تحت ایسے ہی مسائل اور مباحث کو بہت دور سے چھوڑا تو اس زمانہ کے بعض لوگوں نے نئے نئے پیدا کر دیئے، اور ان زمانہ کے بعض اہل بدی اور فضلی مستشرقین نے مسائل کو کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کوشش کر دی ہے، جدید مسائل کے حل کے لئے مقتصد و ہیراس کی کوشش کی ہے

کہ قرآن و سنت یا فقہا یا محقق کے اقوال میں اس کا کوئی شوبہ نہ ملے، بلکہ ان کو اس کی کوئی نظیر ملے، اور انھوں نے اس میں کامیابی پائی، ایسے مسائل میں دوسرے علماء نے عورت مشورہ لینے کا بھی استراہ کیا تھا ہے اور محدثانہ شکوک و شبہات کے خلاف میں بھی مقتصد و ہیراس کی کوششیں رہیں ہے کہ جواب انھیں ان کی تفسیر میں ہوا اور اس جواب دہی کے لئے اسلامی مسائل میں اولیٰ قریم کو گواہ نہیں کیا جیسا کہ وہ دوسرے بعض حنفیوں نے اس جواب دہی میں خود اسلامی مسائل میں تاویس کر کے ترمیم کر دی کہ طریق اختیار کیا ہے، یہ سب کچھ اپنی معلومات اور اپنی کوشش کی حد تک ہو جس میں بہت سی خطا اور غلطیوں کا احتمال ہے، انشاء تعالیٰ صحت فرمائیں، اور ان کی اصلاح کا راستہ نکال دیں۔

۱) ذکر العبد اور امتزاجات کے لئے تفسیر معلوف، القرآن کو مندرجہ ذیل چیزوں کا جامع مانا ہو گا۔
 (۱) قرآن مجید کے دو مسئلہ قرآن مجید حضرت شیخ الاسلام ابو جواد اصل شاہ عبد القادر صاحب کفریہ کے درمیان حضرت علیہ السلام حضرت خاتونِ کاثرہ۔

(۲) خلافت تفسیر ابو جواد حضرت بیان انہوں نے کا خلاصہ تفسیر ہے جس کو علامہ فریضی کے مطابق چوبیس کر دیا جائے تو تفسیری فصاحت، اولیٰ کے لئے اہم قرآن کا مقتصد اور بہترین ذریعہ ہے، اس نے ایک اور ضرورت کو پورا کر دیا کہ اسی کی طرف مجھے اعلیٰ فی انشاء فرمایا جو عالم صاحب ہاں جسے عربیہ مندوب نے علامہ فریضی کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر دیکھا کہ قرآن مجید کی معنی کو کاش اولیٰ میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہو تو اس کی طرح مختصر اور آسان ہو، انشاء تعالیٰ اس سے یہ آواز دہی پوری فرمادے، یہ دونوں چیزیں پورا کا بیڑا، کی مقتصد اور ضرورت ہیں۔

(۳) تیسری چیز معادرت و مسائل ہیں جو تیسری طرف منسوب ہیں، اور تیسری محنت کا محور ہوا اور انھوں نے اس میں کامیابی نہیں سمجھ سکتے تھے، لہذا ہوا، وہ انھوں نے اہل علم و اہل علم کو اس میں شریک نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی تفسیر نہیں کرتے، اس پر انشاء تعالیٰ کامیاب کر دے اور انھوں نے اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں رہا۔

ابن جریر حنفیہ دیکھا اس پر ہے، بے غایت اور عوام پر اس پر
 دانشمندانہ و فاضل اسباب الغرائب و انوار فی العبد العار و با صفتیں من زلہ انقدم ضما
 علت والاظر ایاء اسان ان یجلاہا غایت لوجہ انکم وان یتجمل من کا تفسیر میں مسائل حجاب و ان
 بلعنہ یوم لا یجمع علی ولا یزنی لا یجوز ولا یخاف ولا یطہر ولا یسأل انشاء تعالیٰ علی غیر غفر و مغفور
 خاتم انبیاء و علی انوار اصحابا جمیعہ و انک وسلم کما یفرغ
 بزم ضعیف کاہر محمد بن شمس خان دارالعلوم کراچی
 ۲۵ شعبان ۱۳۷۲ھ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

أَيُّهَا سُبْحَانَكَ يَا قَائِمُ جَسَدِي بِحَبْلِكَ وَرَكْعَتُهُمَا دَاوُدْ

اس میں شانِ آستین	سورہ فاطرہ فطرہ میں	نارول ہوئے	اور ایک دیکھو
-------------------	---------------------	------------	---------------

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

مذہب اللہ کے نام سے جو سب پر ان کی ہدایت فرمے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكٌ

سب لوگوں کے لئے جو اپنے والدین کی اطاعت اور جہاد میں حصہ لیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

يَوْمَ الدِّينِ ۖ إِيَّاكَ تَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿٥﴾ اهْدِنَا الصِّرَاطَ

روزِ حسنا کا، میری ہی، کہ بند کی کوئی ہے اور مجھ کی سے درجہ چاہتے ہیں، بسا بہم کو

الْمُسْتَفِيمِينَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۚ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ

سیدھی : دادا ان کوں کی جی پر وے نصی فرمایا۔ بھوپر نے بڑا عقیدہ ہوا۔

عليهم ولا الضالين ﴿٥﴾

اور یہ ہے کہ گمراہ ہو گئے۔

خلاصہ فقیر

[illegible]

بزرگوں جس منظر اور دکھوں والی شکل نظر آئے اور کھڑوں میں چٹان جیسے انسان کے دایہ والی کو
بروقت اپنی طرف کھینچ رہی ہیں اور بائیں طرف سے ہرگز نہیں آئے ہیں اگر وہ ان کو گھبرا جائے تو ان سب
چیمبروں کے پرے میں ایک ہی دست قدرت کا دسترا نظر آئے ہے اور دنیا میں جہاں کہیں کچھ
کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کسی شخص کی عمارت تصور کر کے اس شخصیت
کی تعریف کی جائے کہ سب تعریفیں و حقیقت انسانی اور موصو کی حیثیت کی ہوئی ہیں اس لیے
مکڑوں کے عالم میں پہلے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھل کر رہا ہے کہ وہ اس کا
کمر بن کر ایک ہی وحدت سے مل جائے اور اس کی تعریفیں و حقیقت ہی ایک قادر و مطلق کی ہزاروں
کی روشنی کی تعریف جتنا نظر ابھرتی ہے اتنی ہی ہے

حررہ و اقلیت است در سن

بر و بر کر و رفت بر و رفت

اور یہ ظاہر ہے کہ ساری کائنات میں لائق حمد و حقیقت ایک ہی ذات پر مملکت
کی مستحق ہیں وہی ذات برکت ہے اس سے معلوم ہو کہ اگر آتش چلتا ہے اگرچہ خود نہاں ہے اس لیے
لا جہلیہ ہے لیکن اس میں ہیں ایک جزاء انعام سے مخلوق پر کسی کی سبب یا نعم کر دینی اور دل نہیں
طریق پر توجہ کی تعلیم دی گئی ہے

خود کچھ کو فخر ہے کہ اس مختصر سا بندہ کی جملے میں ایک طرف تو حق تعالیٰ کی مڑنا کا بیان
ہو اس کی ساری مخلوقات کی تخلیق میں آگے ہوئے دل و دماغ کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کر کے
مخلوق پر کسی کی جڑ کاٹ دی گئی اور وہ جزاء انعام سے انہیں کے سبب پہلے کی توحید بائی کا نقش اس میں
جاوا گیا کہ جو مخلوق کو اس میں مل کر تو فی اپنی دلی میں ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ
اور مخلوق بنانے کے لیے کے بعد انسانی مخلوق کی صفات پر حق تعالیٰ نے
ذکر کی گئی ہے مختصر الفاظ میں اس کی بھی تشریح دیجئے

لفظ **تَقْوِيم** کے معنی جوئی نعت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں اور یہاں
اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ درجہ آگے بڑھا جائے
یہ ایک کردہ و تم کمال کو پہنچ جائے

یہ الفاظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات آپ کے لیے مخصوص ہے کسی مخلوق کو یہ ان اعانت کے
دست کا ہونا نہیں کیونکہ یہ مخلوق خود بخود اپنے تربیت پر کسی اور سے کسی کو بہت کر سکتا ہے

اللَّهُ يَتَقَوَّمُ عَالَمَهُ مِمَّنْ فِي ذِيكَ تَامِ اَنَسَسْ اَسَانِ اَمَانِ سَوَجِ اَوْنَامِ
ساتنے اور چراغ انعام، برقی و روشن، فخر سے چمکتا، زمین اور اس کی تمام مخلوقات و حیوانات انسان

نہایت، جمادات سب ہی داخل ہیں اس لیے تو یہ الفاظ حق کے معنی پر نہ کر انہ تعالیٰ قسم
انہما کی کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں اور یہی کوئی بہرہ نہیں کہ یہاں ایک عالم ہے جس میں ہم
پہنچے ہیں اور اس کے تمام مسمی و مرقی اور برق و باطن اور زمین کی مکھن مخلوقات کا ہر مشاہدہ کر رہی
ہے اس کا ایک ہی عالم ہو اور اس جیسے اور ہزاروں مکھنوں و دسترخرو عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی مخلوق
موجود ہوں، امام ہوائی نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک مستثنیٰ مخلوق کا درجہ
والی علیہ صلی علیہ وسلم ثابت ہوا اور یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس کے لیے کیا
شکل ہے کہ کسی سے اس کی ناستی بخلاہ میں جائے یعنی نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں مکھنوں
عالم بنا رکھے ہوں

حضرت جو سعید و مدنی سے منقول ہے کہ عالم چالیس ہزار ہوا ہے دنیا مشرق سے مغرب تک
ایک عالم ہے اسی میں کے ہوا ہے اسی طرح حضرت عثمان امام تفسیر سے منقول ہے کہ عالم ہی ہزار
ہیں مرقمیں اس پر ہر شے رہا جائے خاک غلا، ہوا، انسانی مزاج کے مناسب ہزار نہیں ہوتی اس
لئے انسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں ہو سکتا، امام تفسیر نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ مرقم
ہے کہ اس عالم سے خارج غلا، ہوا و دوسرے عالم کے باشندے ہوں ان کا حاکم بھی ہوا ہے عالم کے باشندے
کی طرح ہر چیز غلا، ہوا و دوسرے عالم کے باشندے ہوں ان کا حاکم بھی ہوا ہے عالم کے باشندے
ہوئے ان کی غلا و ہوا ان کے باشندوں سے باطن مختلف ہوں

یعنی وہاں سے سات سو ستر سال پہلے کے اسلامی کالہ سلو امام وازی کا کھسا ہوا ہوا
نفاذ و غلا کی ہوا اس کی پائش کے آہستہ زوال ایجاد ہوئے تھے، آج ناکھوں اور واسپیکٹوں کے
خانے میں غلا کے مسائرسوں کے ہر کچھ آکر بنا دیا ہو اس سے فواید نہیں کہ اس عالم سے باہر کی
غلا کی کوئی حد نہایت نہیں ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی غیر مسمیٰ غلا میں کیا کچھ موجود ہے
اور اس لیے قریب ترین سیستوں، مائدا اور زمین کی آدھ کے اپنے میں جو قیاسات کچھ کے ہر چیز
ماتریکس سے پہنچ کر پہنچے ہو یہ وہی جی کی کر گراں سیسات کچھ اور کچھ آدھ میں تو ہر چیز میں
کرو، انہیں خصوصیات اس مزاج و طبیعت کے ہوں جو اس عالم کے انسان اور جمادات و نباتات
کے اندر وہی کیے جاتے ہیں، بلکہ ستر سال پہلے کے کچھ کے مزاج و طبیعت ان کی غلا و خصوصیات
میاں کے مرقم سے باطن مختلف ہوں اس لیے ایک کچھ کو دسترخرو قیاس کرتے ہی کوئی وجہ نہیں

امام تفسیر کی تائید اور اس سلسلے کی حد و مصلحت کے لئے اور ملاحظہ کیا ہے ہمارے غلا کی مسافر
ہاں تعلیم نے سال میں غلا کے دسترخرو میں آ کر شائع کرنا ہے جس میں شمس سال کا نام اسے کر ایک
طریق منزلت و مسافت کا پانچ نام لکھا اور اس کے اوپر اپنی وصیت لکھ کر ایک غلا کا کچھ ہوا ان کا

اور پھر اس قدر کہ ان میں سے جو ایک کا گناہ کی دست کشی نہ ہو گا اور کسی گناہ کی

تسکین کے اس مندرجہ کے ساتھ تمام عالم راہِ راست کی کائنات پر نظر ڈالے اور بھیج
بصیرت دیکھ کر حق تعالیٰ نے نہایت عالم کا اس مہبوط اور کفر کو عقل و نظام بتایا ہے، اے ملک کے
رے کہ حاضر ملک سہارا و بزم سے لے کر ذرات تک پھر جس میں سلاطین و عظام ہیں وہی اور کیم
مطلق کی خاص ملک اس کے اخذ ہر چیز اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، ایک طرف انسانی کے قدر
تک پہنچا ہے مگر اس کی وہی عظمت پر انسان طور کرے و مظلوم ہو گا اس کی تباہی میں آسمان اور
زمین کی تمام قومیں اور درگاہوں و افسانوں اور بادلوں کی خلقیں مشاغل ہیں، ساتھ عالم کی فوجیں پیکر
مصر و بخت خدمت رہیں پھر نہاد ہوں، اور ہر سب کو اس نے تمام انسان اس میں خود غور نہ کرے
کام ہے، اور کچھ کاشہ غافل سے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں
لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے خود م کائنات بنا رکھا ہے وہ بھی بیکار و بیہودہ نہیں ہو سکتی،
اس کا بھی کوئی کام ہو گا، اس کے لئے بھی کوئی خدمت ہو گی۔

اور اور مرد و خوشہ، ملک و دکاندار، آفرانے بخت آوری و مصلحت بخوری
بہار و ہیر و سرگشتہ و مسافر و بار، شرط و اضاعت ناشکر کو فرار ہری
فرانہ مکمل سے انسانی آفرینش اور اس کے مقصد و حالت کو اس کی بخت میں واضح منسرا ہے،
وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِعِبَادَتِي
اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَائِرِ الْمُرْسَلِیْنَ

نعمہ مذکورہ سے معلوم ہو کہ قرآن العظیم ایک عہد سے پہلے پہلے اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَائِرِ الْمُرْسَلِیْنَ
ہر گناہ تمام کائنات کی نسبت و پروردگار کے ذمہ اور صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے و حمد و ثناء
کی معنی بھی جس میں ہر چیز جو ہے، اس لئے پہلی بخت اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَائِرِ الْمُرْسَلِیْنَ میں حضرت
کے ساتھ اہل ان کے سب سے پہلے رکھ کر خود باری تعالیٰ کا بیان بھی فرمایا ہے، کیا،
و امری بہت میں مصدقہ صحت کا ذکر لفظ صفت و تحقیق و تحقیق کہا گیا ہے، و ہر فرد
جینے والے کے جس میں ہیں، و صحت خداوندی کی دست و کمرش اور کمال کا بیان ہے، اس صفت
کے ذکر کرنے میں شایع اس امرت اشاہد ہو کہ تمام کائنات و مخلوقات کی نسبت و پروردگار کی
ذمہ داری جو حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ کی ہے وہی اپنی خود دست و آفرانہ ہو رہی ہے نہیں، بلکہ
سب کو اس کی خدمت و رحمت کا تقاضا ہے، اگر چہ وہی کائنات شہر و قریہ کا کچھ نقصان نہیں، اور
ہو جائے تو اس پر کچھ اثر نہیں ہے

شاہنشاہی چو گناہ گشتہ نبیہ و ذوال کرم و شہر و نعمت فرمود

مُطَلَّبَاتِ دَعْوِہِ الدِّیْنِ لفظ مطلق، ملک سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا
تہمید کہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (عاموس) لفظ جو حق کے معنی جسوارہ دینا
لِطَلَبَاتِ دَعْوِہِ الدِّیْنِ کا مطلق ترجمہ ہو (مناکدہ و زہد) اکا، یعنی روزِ جزا، میں ملکیت رکھتا ہوں،
وہ ملکیت کچھ پیسہ ہر ہول؟ اس کا ذکر نہیں کیا گیا، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس میں اشارہ عموم کی
طرف ہے، یعنی روزِ جزا، میں تمام کائنات اور تمام امور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو گی (کشاف)
اور جس کی خدمت
اور حلقہ اس کی خدمت
دوسرے کے کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح وہ چاہتا ہے، وہی ہو گی ایسے ہی آج بھی
ہے، پھر وہ جو اس کی خاص خدمت ہے؟

پہلی آیت کا جواب ہے کہ روزِ جزا، اور اس کا نام ہے جس کو اللہ نے ایک روزِ اعلان کا بدلہ
دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے، لفظ روزِ جزا سے ایک عظیم الشان فائدہ حاصل ہو گا اور دنیا تک بد
اعمال کی جزا و سزا کی جگہ، بلکہ ایک دارِ اعلیٰ فرض ادا کرنے کا مرکز ہے، خود باطل و صلہ کرنے
کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہو گا کہ دنیا میں بھی کوئی وحش و وحش، دولت و راحت سے مالا مال
رہ کر م نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مہربان و محبوب ہے، آپس کو کچھ وصیت و عہد سنبھلا
اگر نہیں ہوتا اور باہر جاسکتا کہ اللہ کے نزدیک مہربان و محبوب ہے جس طرح دنیا کے روزِ جزا اور کافروں
میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروف نہ رکھا جائے تو کوئی عقیدہ اس کی مصیبت و زہ نہیں ہوتا،
اور وہ خود اپنی مشقت کے اور جو آپ کو کفر و مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس نعمت و شفقت کو
اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہے، اور کوئی گناہ اس میں اس کی مشقت سے بیکار نہ کرنا چاہیے تو وہ
اپنا تہن و شکر خیال کرتا ہے، ہو کر وہ اس میں روزِ جزا سے کہ پہلے یہ وہی راحت کو کہہ دے گا
جس کو تو خود کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں عظیم الشان ارادے کے بدلہ لیا دے سکتا ہے بارِ مصیبت
بلکہ مصیبتا بھی ہے، اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بالمرعات سرور نظر کرتے ہیں۔
نور و نصیب، دشمن کو شرم و خاک پہنچاتا
سورۃ مستان سلامت کو توخیر آفرینا

الزحرف دیا گیا کہ دشمن حق و صداقت کی اور دین و مصیبت پر عمل کی معنی طاعت نہیں کہ
ایں بھی کسی کی کسی عمل کی جزا و سزا بلکہ اس میں دنیا میں بھی تباہ کر دیا جاتا ہے، اور اس کا بدلہ
نہیں ہو گا، بعض متذکرے کے لئے ایک مہربان ہے، اس کے متعلق فرقان کا اشارہ ہے،

وَلَقَدْ عَلَّمْتُمُ الْقُرْآنَ عِلْمًا مُّحَقَّقًا
ذُرِّيَّتَ الْإِنْسَانِ أَنْ يَقْرَأَ
فَلْيَسْمَعْ أَصْوَاتَ الْوَعْدِ
(۱۱۴-۱۱۳)

اور دوسری جگہ شاعر ہے

عَلَّمَ الْقُرْآنَ الْعِلْمَ وَتَقَرَّرَ الْعِلْمَ
فَلْيَسْمَعْ أَصْوَاتَ الْوَعْدِ
(۱۱۴-۱۱۳)

ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب
بہت بڑا ہے اگر وہ سمجھیں

آخر میں دیکھیں راست و صحیح بات بعض اوقات دو آواز ملتی پڑتی ہے، اور کسی خدا
بہی ہوئی ہے کہ مرد عکلا پر دبا رہے نہیں ہوتا، بلکہ ایک نرود ہوتا ہے، کیونکہ سب کچھ چند ذرا اور
مادہ ہے، مدار و مدار و دست و کفایت پر ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، اور اس عالم کے گرد
کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے، اس کا نام روزِ جزا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ایک
عمل کا بدلہ دیا جائے اور بدلہ میں نہیں ملتا، اور بدلہ و انصاف اور عقل کا انصاف ہے کہ ایک
اچھا اور بُرا پیر ہو، بلکہ ہر عمل کی جزا یا عذاب ملنا چاہیے۔

اس لئے مژدہ ہو کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم ہو جس میں ہر عمل کے بدلے اور اچھے برے
عمل کا حساب، اور اس کی جزا یا عذاب انصاف کے مطابق ملے، اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روزِ جزا
یا عذاب و آخرت کہا جاتا ہے، قرآن نے تو اس مشہور کورس مضمون میں وضاحت بیان فرمائی ہے:

وَمَا تَنْبَغِي إِلَّا أَنْ تَقُولِي مَا تَشَاءِينَ
وَأَنْتِ بَيْنَ يَدَيْهِ عَرْشٌ عَظِيمٌ
فَلْيَسْمَعْ أَصْوَاتَ الْوَعْدِ
(۱۱۴-۱۱۳)

میں یہ بتاؤ کہ کیا تو اور ایک اور جگہ جو
ہماری ہے، اور انھوں نے اچھے کام کی اور
دوسرے کے کردار، اچھے کردار پر جو دیکھتے تھے
وہ بہت ہی کم تھے، یہ وضاحت خود ہی
اگر دیکھ کر دیکھ کر ہم کو اس کا واسطہ ہو
من جانبا اس کے لئے کسی طرح کا شائبہ
ہی نہیں، مگر اگر وہ نہیں دیکھتے؟

مالک کہہ رہے ہیں: **مَالِكٌ يَقُولُ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَ خَاسِرٌ** یعنی دوسری مثال یہ دیت ہے کہ ہر اہل عقل کے نزدیک
یہ بات یہ کہ ہر اہل عقل ظاہر ہے کہ انسان کو تمام کائنات کے لئے تو ذلے کے ذلے دینا ایک ہلکا ہے،
جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھا، تربیت کی، اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے، ظاہر میں بھی باطن میں بھی
نرود ہر بھی نرود دیکھیں اور جس کی ملکیت کی عکس میں انہما ہے نہایت، عکس انسان کی ملکیت
کے کردار انہما کے دائرے میں محدود ہے، پہلے تو نہیں یعنی اور پھر نہ ہوگی، نیز اس کی ملکیت

تصرف ان شایہ کے ظاہر ہے، باطن پر نہیں، اور وہ بہت نرود نہیں، اس لئے ہر اہل بصیرت کے
نرود ایک صرف، روزِ جزا کی نہیں بلکہ دنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی ملکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی
ہے، پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روزِ جزا کا مالک فرماتے ہیں کیا عکس ہے؟
سورۃ قیامت کی دوسری آیت میں غور کر کے یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں بھی حق تعالیٰ اور مکمل ملکیت

تمام کائنات پر صرف حق تعالیٰ ہی کے ہیں، لیکن اسی کے لئے کرم اور رحمت، ہر شے ایک قسم
کی انھیں ملکیت، انہیں کو کسی حلقہ فرمان کی ہے، اور وہ ان کے قوانین میں اس کی ملکیت، لاکافی احرام
میں کیا گیا ہے، آج کی دنیا میں انسان مال و دولت کا مالک ہو، زمین کا تیار دلا مالک ہو، کوئی
بلکہ اور سر پرچہ مالک ہو، چشم و خشم کا مالک ہو، اور دنیا میں بھی اس کی ملکیت جو اس کو کھن کرنا
کے لئے دی گئی تھی، وہ اس میں مفرد و بدست ہوگا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے تخلیقِ یقین کا
مفسر مالک اس مفرد و قائل انسان کو گاہ فرمایا کہ ملکیتیں جو اس کو دے دی ہیں، وہ اس کی ملکیت ہیں، اور اس کی ملکیت
چند دن کے لئے ہیں، ایک دن ان کے لئے اور ایک دن ان کے لئے، یہ کوئی نہیں جو کچھ ظاہر میں ہو، ایک
دن ہے، گا، نہ کوئی بھی کا فادہ دے گا، نہ خود دے گا، نہ کوئی کا فادہ دے گا، نہ ظلم، نہ ظلم کا عذاب
کی جنگ اور ملک صرف ایک ذات پاک اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روزِ جزا کی وضاحت سورۃ غفرہ کی آیت میں ہے:
يَوْمَ تَشْهَدُ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ لَكَ يَوْمَئِذٍ عِلْمٌ عَظِيمٌ
يَوْمَ تَشْهَدُ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ لَكَ يَوْمَئِذٍ عِلْمٌ عَظِيمٌ
يَوْمَ تَشْهَدُ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ لَكَ يَوْمَئِذٍ عِلْمٌ عَظِيمٌ
يَوْمَ تَشْهَدُ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ لَكَ يَوْمَئِذٍ عِلْمٌ عَظِيمٌ
(۱۱۴-۱۱۳)

اس میں روزِ جزا کا بیان کرتے ہوئے فرمایا،
میں، ان سب جگہ ہوا کہ میں نے ان کو ان بات خالصہ دوسری
حق تعالیٰ نے دیکھی، آج کے روزِ جزا کی حکمت بھی اس آیت میں ہوگی، ہر کائنات اور مالک ہے،
آج ہر شے کو اس کے کے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی ظلم نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بہت حسیل
حسب اپنے دالے میں ہے

سورۃ فاتحہ کے شروع میں بیان کرنا چاہتا تھا کہ سورۃ کو میں ابتدا میں آجوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد
نہا کا بیان ہے، یہ تینوں آیتیں انھیں اور ان کی تفسیر میں آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ پہلی دو آیتوں
میں حمد و ثناء کے ضمن میں ایمان کے پسندیدہ اصولی اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی حمد کا بیان
ایک مجوزہ آواز میں کیا ہے، اس ہماری آیت کی تفسیر میں آپ نے اب یہ معلوم کر لیا کہ اس کے
صرف دو اظہار ہیں، حمد و ثناء کے ساتھ اس کے حکم اور ان افعالِ عظیمہ یعنی فاعل و آخرت

کی مدد مانگتا اس کی واسطہ سے کہ ہوا دستہ اللہ تعالیٰ سے رہا، مانگتا دوا باہت حدیث اور شایانہ
فرقان سے اس کا بھی جواز ثابت ہو، وہ بھی اس شہادت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے
مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام و منکر ہے۔

اب وہ مخصوص شہادت اور امداد جو اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھ کر غیر اللہ کے لئے منکر ہو گئی ہو
اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا نبی اور انسان کو خدا تعالیٰ
کی طرح قادر مطلق اور مختار مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، تو ایسا کھانا ہو اگر کفر ہے کہ عام مشرکین
نہیں سمجھتے اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بڑوں اور ولیوں کو یا اہل خدا تعالیٰ کی مثل قادر مطلق اور مختار مطلق
سمجھ کر بھی نہیں مانگتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کھانا خدا کر دیتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو اہل و شرک قرار
دیتا ہے، اور باقی کتب جہت میں یہی حراز ہے، کہ ان کی شہادت اور امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں
پا سہ، وہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا نبی اور انسان کے خلق ہے، عنیدہ رکنا اگر اگرچہ
قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور کامل اختیار اس کی ہے، لیکن اس نے اپنی قدرت و شہادت کا
کچھ حصہ نقلی شخص کو سونپ دیا ہے، اور اس قدر سے وہ خود مختار ہو گیا، وہ استعانت را ستوار ہے
و موسیٰ کا فر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو منکر و حرام قرار دیتا ہے،
بہت ہرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملہ میں جو حکم ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے استحقاق پر ہی
نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، وہ سمجھئے اور اس معاملہ میں چڑھ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ
نے یہ چیز سزا پورا کر دی ہے، اب انہی علیہم السلام کے ذریعے بہت سے ایسے کام و جو دیئے گئے ہیں
جو مامور انسان کی قدرت سے خارج ہیں، لیکن جو عزت کا ہوا ہے، اس طرح اولیاء اللہ کے ذریعے
بھی ایسے ہی بہت سے کام و جو دیئے گئے ہیں، جس کو کرامات کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظر اٹھائی کرے
مناظرہ لگ جائے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و شہادت اس کو سپرد کرنا قرآن کے مانر سے
ہر کچھ و جہد میں آئے، اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کے ایک درجے میں تھکا کر دے گا عقیدہ بنائے ہیں
حالانکہ حقیقت یوں نہیں بلکہ جہزات اور کرامات برام راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف
اس کا جو رتبہ بڑا ہوا ہے انہیں ہر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے سزا جاتا ہے، پیغمبر و ولی کو اس
کے درجہ میں ملنے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، فرقان یہ کہ بنے شہادت اس پر شاہد ہیں، مخلوق آیت
قرآنیہ و آیت قرآنیہ و تفسیر اللہ تعالیٰ (۱۸: ۱۷)، یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کا ذکر
ہے جس میں آپ نے وہ دشمن کے لشکر کی طرف ایک نفی سنگروں کی سبیل اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے

وہ سامنے لشکر کی آنکھوں میں جا لگیں، اس کے متعلق اور شلو ہے کہ آپ نے نہیں بھیجی کھانا
نے بھیجی تھی، جس سے معلوم ہو کہ معجزہ جو حق کے واسطے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ
کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے کہا کہ اگر آپ بچے ہیں تو جس مذہب
ڈرا ہے میں وہ بدل جائیجے، تو انہوں نے فرمایا، ایشا یا نیکو کہو ایشا یا نیکو کہو (۲۱: ۲۲) میں نے
کہا کہو یا آل عذاب ازل کا میرے فیض میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو یہ مذہب بدل جائے گا
پھر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔

سورہ البراقیم میں جانا تو رسول کی ایک شہادت کا یہ قول ذکر فرما ہے تے ما خلقنا آتاف
تاجیہ و متعلقین الا بذی الشکوہ (۱۳: ۱۳) میں نے کسی چیز کو اس کا صدور کرنا ہوا ہے، نہیں، اللہ تعالیٰ
کے اذن و مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اس سے کہنے کی سبب اور کوئی ولی جب چاہے ہو یا یہ
معجزہ یا کرامات و کھانا ہے، یہ تھا کہ کسی کے بھی نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری
انبیاء سے بہت سے متین معجزات کا کھانا پیش کر دیا ہے، لیکن اس نے اپنی قدرت و شہادت کا
جس کو خود چاہا نہیں ہوا، پھر اللہ تعالیٰ اس کی شہادتوں سے بہرہ لیا ہے۔

ایک محرمی مثال سے اس کو بھی سمجھ لیجئے کہ جب آپ کرے میں بیٹھے ہیں اس میں کمال کی قدرتی شہادت
اور جو امداد پیچھے سے آپ کو پہنچ رہی ہے، مگر یہ اللہ پر لکھا اس وقت میں اور جو پہنچنے میں تھا
نہیں، بلکہ ہر اس چیز کو دکھانے کے محتاج ہیں جو کہ ذریعے اور اوس کے سامنے کو حاصل ہے
ایک سینکڑہ کے لئے جو زوٹ جاتے، تو ذہب آج کو دشمن سے نہ پکھا ہوا ہے نہ سکھتا ہے، کہ جو
درحقیقت وہ عمل اور لکھنے کا ہے ہی نہیں، بلکہ یہی کی ذکا ہے، جو ہر اداؤں سے یہاں پہنچ رہی
ہو، انبیاء اور اولیاء و سب فرشتے ہر عمل میں برکات ہیں، ہر ان حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اس کی قدرت و
مشیت سے سب کام و جو دیئے گئے ہیں، اگرچہ انہوں کو اس باب اور کچھ کے طرح انبیاء و اولیاء کے
استحقاق پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ اختیار انہی پر ہوا
ہو کہ انہیں مقرر کیا جو دوا جو دہی سے اہل بے دخل بھی نہیں، بس یہ اللہ پر چھوٹے کے بغیر کچھ کو دشمن
اور جہاں نہیں پہنچ سکتے یہ معجزات و کرامات بھی انبیاء اور اولیاء کے بغیر نہیں ملے، اگرچہ یہ فرق ضرور
ہو کہ یہی حدیث اور کتب در دستہ ہونے کے باوجود آپ کو بغیر اللہ کے روشنی اور بغیر کچھ کے جہاں
کا ملنا مافوق نہیں ہے، اور جو عزت و کرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے، کہ بغیر واسطہ
پیغمبر و ولی کے بھی اس کا پورا پورا فرماوی، مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ کوئی کا صدور بغیر واسطہ اور اولیاء یا نبی کے

نہیں ہوگا، مگر اگر ایسے خدان مادات کے اظہار سے جو مقصد ہو، اس کے بغیر خدا نہیں آتا۔
اس لئے معلوم ہوگا عقیدہ تو یہی رکھنا ہوگا کہ سب کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہوا ہے
اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء اکل عقلت و ضرورت کا بھی اعتقاد ضروری ہے اس کے بغیر دماغ
ہوئی اور طاقت احکام عبادت سے محروم ہوگا جس طرح کوئی شخص سب لوگوں کے لئے خدا نہیں بنے
اور ان کو شائع کر کے اور دشمن اور خواہ مخواہ محروم رہتا ہے۔
وسیلہ استقامت اور امتداد کے مسئلے میں بکثرت کو کفر و کمال دہنا ہے اس پر کہ کس
تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہی معلوم ہوجائے کہ تمہیں سب اور دنیا کو وسیلہ بنا
نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفریق ہے جو آپ کو دیکھ گئی ہے کہ کسی کو کھانا
کھانے کے وسیلہ بنا جائے تو شرک و کفر ہے اور شخص راہب اور زنیہ کو کھانا جائز ہے اور کھانے کے واسطے
ہی عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والاعمال والسنن والحدیث والاسان

مسئلہ مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو
اور اصل مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو
اور اصل مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو

اس کا اصل یہ ہے کہ ہر حال میں مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو
اور اصل مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو

بسم اللہ تعالیٰ تفسیر سورۃ البقرہ
و اللہ اعلم بالصواب والاعمال والسنن والحدیث والاسان

سورۃ البقرہ

اور اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا نام سورۃ البقرہ رکھا، اور اس کا نام سے حدیث اور آثار و صحاح میں اس کا ذکر
ہوگا ہے جس حدیث میں سورۃ البقرہ کو منسب کیا ہے وہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ اس کی آیات و مشوہہا میں
اور کلمات جو ہر دو سو گیسواں حرف و کلمہ ہیں، اور ان کی
وہ بے نزول ہے سورۃ مدنی ہے یعنی ہجرت مدینہ علیہ کے بعد نازل ہوئی، اگر اس کی بعض آیات کو
میں جے کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باسقاط مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۃ البقرہ قرآنی کریم کی سب سے بڑی سورۃ ہے اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول فرمایا
ہوا اور مختلف ذوالی میں مختلف آئین نازل ہوئی ہیں، یہاں تک کہ آئین سورۃ کے متعلق ہر آیت میں
اور حضرت علی علیہ السلام کی آخری عریض میں جو کہ بعد از انبیا و اولیاء کا ایک آیت ہے
نیز حضرت علی کی بیعت میں جو کہ بعد از انبیا و اولیاء کا ایک آیت ہے
نیز حضرت علی کی بیعت میں جو کہ بعد از انبیا و اولیاء کا ایک آیت ہے
نیز حضرت علی کی بیعت میں جو کہ بعد از انبیا و اولیاء کا ایک آیت ہے

اور اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کو ہر حال میں مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو
اور اصل مستقیم کی دایہ و بائیں صورت و وضاحت سے آگاہی ہے کہ شرعی کریم نے جس
دین میں عہد کا سنبھالی ہے وہاں جو شخص کے لئے ہر حال میں انتخاب و مشورہ ہو

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارقِ عادات کے اظہار سے جو مقصد کر وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔
اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہو کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہے
اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے
الہی اور مطاعت احکام خداوندی سے محروم رہیگا، جس طرح کوئی شخص بلب اور پتکے کی قدر نہ پہچانے
اور ان کو ضائع کرنے تو دشمنی اور نواز سے محروم رہتا ہے۔

وسیلہ، استقامت اور ہمت اور اہمیت کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، امید ہو کہ اس
تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نبیؐ و اولیاء کو وسیلہ بنانا
مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو خوارقِ
بجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور رضائے واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس
میں عام طور پر لوگوں میں اذیاد و تعریض کا عمل نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب والستدروسین المبین والمعاد

مسئلہ مستقیم کی ہدایت و نیاں اور اہل تفسیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس
میں کلیہ کا مبیانی ہے دعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہو
وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اس صراطِ مستقیم پر موقوف ہو، جو انسان کو
جنت کی طرف لیجاتا ہے اس طرح دنیا کے سامنے کاموں میں بھی غور کر دو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے،
جس کام میں وہ آلات و ذرائع خستہ یا کئے گئے، جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عاویۃ لازمی ہو تو کامیابی
عاویۃ لازمی ہوتی ہے، چنانچہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم
ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے
نا کامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہو کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص
نہیں، دنیا کے سب کاموں کی درستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دعا ایسی ہو کہ نومن
کو ہر وقت عز و جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہو کہ انحصار اور نیست کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ
کا پڑھ لینا نہ ہو، واللہ الموفق والمعین۔

بسم اللہ تعالیٰ تفسیر سورۃ فاتحہ ختم ہوئی،

و اللہ اعلم بالصواب والستدروسین المبین والمعاد

بسم اللہ تعالیٰ

سورۃ البقرہ

۱۱ اور تعداد آیات | اس سورت کا نام سورۃ البقرہ ہے اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہ میں اس کا ذکر
موجود ہے، جس روایت میں سورۃ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں، دین کثیر، تعداد آیات دو سو تھپاسی ہیں
اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسویں (دین کثیر)

زمانہ نزول | یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ
میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۃ البقرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع
ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آئین نازل ہوئی ہیں، یہاں تک کہ دہائی سورۃ کے متعلق ہر آیت میں
وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں پہنچ کر کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت وَاقْعُوا
يَوْمَئِذٍ كَعَقُوذٍ فِي دَوَابِّ اللّٰهِ (۱۸۱:۲) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو سندِ ہجری میں ۱۰ ہجری کو مرقی کے مقام پر
نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، و قرطبی، اور اس کے
اسی نوے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔
مضامین سورۃ البقرہ | یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سورۃ البقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت
اور بد نصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔

قرطبی نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جاودہ گریں، مراد یہ ہے کہ اس سورت
کے پڑھنے والے پر کسی کا جاودہ نہ چلے گا، قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے ہٹا جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۃ بقرہ منام القرآن اور ذرۃ القرآن ہے، اسم اور ذرۃ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت اسی فرشتے اس کے جکو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی) حضرت علیؓ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: سورۃ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو رات میں پڑھے تو اس رات کو جہنم، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، بچہ و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑیں تو اس کو فاقہ ہو جائے گا، وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۃ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں پھر آخر سورۃ بقرہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مفہوم و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۃ بقرہ کو ایک خاص ہستی یا حاصل ہے، ابن عربیؒ منبر مانتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ہزار اور ایک ہزار تہی اور ایک ہزار چھتیس، ایک ہزار تہی اور تھیں ہیں قرطبیؒ و ابن کثیرؒ ایسی وجہ ہے کہ حضرت فاروقؓ اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت علیؓ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبیؒ)

سورۃ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مفہامین یہ ہیں: اول اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگار عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا سچا عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلب ہدایت، سورۃ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب ہے اور درحقیقت پورا مسترآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہو قرآن ہی میں ملے گا۔ اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورۃ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذلک الکتاب سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈ رہے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اول ایمان کے بنیادی اصول، توحید، رسالت، آخرت اجمال طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، جہتلات، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور ان کے ساتھ بہت سی جہیز نیاات بیان ہوئی ہیں۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ آيَاتُهَا ۲۸۶ رُكُوعَاتُهَا ۲۰

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۲۰ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الْم ۱ ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۱

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دبی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُونَ ۲ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ

ان کو اس میں خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لاتے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِنْ قَبْلِكَ ۳ وَالْآخِرَةُ هُمْ يُوَفِّيهِمْ ۴ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى

کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِنْ تَرْتِيمٍ ۵ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۵

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں رہیں قرآن کے مخائب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی غائبانہ نہیں، اگرچہ کوئی انہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے، راہ ہٹانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں ان کے حواس و عقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسول کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان سراسر آبی پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور ایمان بچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو بچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھ کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تحریف کی ہے وہ غلط ہے، وہ کیا عمل سزاوارت صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہو گئیں، ان پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی ان کے لئے ہے) :

حلّ لغات ذیٰلک کسی دور کی چیز کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرینہ شک و شبہ،
 ہندی ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، متعین جن میں صفت اتویٰ ہو
 تعوی کے نقلی معنی بچے کے ہیں، براۓ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غیب نقلی معنی ہر دو چیز جو انسان کی
 نظر اور دوسرے کو اس سماعت و غیور سے باہر ہو، یقیناً اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے
 کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، رزقہم رزق سے
 بنا ہے، جس کے معنی باروری اور گزارنے کا سامان دینا، یفعلون اتفاق سے بنا ہے، اخراج کرنے کے معنی
 میں آتا ہے، اخیر لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرہ کہا جاتا ہے، اس جگہ عالم دنیا کے مقابلے
 میں عالم آخرت بولا گیا، یوفیون اتفاق سے ہے اور یوفین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں
 کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، متعینون فلاح سے اور وہ فلاح سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف و مسائل

حروف مقطعه جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں ان کی تحفہیں

التَّاءُ بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروف سے مرکب

ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے التَّاءُ حَمْدُ التَّائِيَةِ دُغْوِہُ ان کو

—

↓

اصطلاح میں حروف مقطعه کہا جاتا ہے، انہیں کبر حروف مجزا کہتے ہیں، ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسبابِ اربعہ کے رموز ہیں، مگر جہو رحھا ثو و ا ب ی ن اور علما یہ امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو جس کی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کو ختم کیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

تعارف میں۔ سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت قدسہ نے فرمایا ہے کہ ہر آسان کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ خروف و اعداد مستتر ان میں جن تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ ان منشاہیات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اذلی تو ان پر ایمان لانا ہمارے ان کا پڑ پنا ہمارے لئے ثوابِ عظیم، دوزخ و سرے ان کے پڑنے کے منہی خواہ و برکات ہیں، اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر فریاد ہے: وہ ہمیں بڑھ چکے ہیں ۝

پیشہ فرمایا۔

حضرت صدیق اکبرؓ، فاروقی اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، سید المرسلینؐ، مسعودؓ وغیرہ جہود صحابہؓ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ان پر ایمان لانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور جن طرح آئے ہیں ان کی کلامت کرنا چاہیے، مگر کسی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تفصیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہو اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ لَفْظٌ ذَلِكَ كَيْسٌ دُورٌ كِي چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہوا اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْب کے معنی شک و شبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۃ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی ہتر آن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۃ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۃ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا ہتر آن اس درخواست کا جواب بصورت قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا مانگی اور قرآن

يُخَذُّ عُنَى اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخَذُّ عُنَى إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝ وَإِذْ أَقِيلَ لَهُمُ الْقِسْدُ وَإِذْ يَبْغُ الْوَقْرُ مِنَ الْحَرِّ وَقَدَفَا لَهُمُ سَنَاءٌ طَلْمِذًا لَهُمْ لَهْمُ الْقِسْدِ وَإِذْ يَبْغُ الْوَقْرُ مِنَ الْحَرِّ وَقَدَفَا لَهُمُ سَنَاءٌ طَلْمِذًا لَهُمْ لَهْمُ الْقِسْدِ وَإِذْ يَبْغُ الْوَقْرُ مِنَ الْحَرِّ وَقَدَفَا لَهُمُ سَنَاءٌ طَلْمِذًا لَهُمْ لَهْمُ الْقِسْدِ

دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو
 یسعیوں ۱۱؎ فی قلوبہم مرضؕ فزادہم اللہ مرضاًؕ ولہم
 اور نہیں سوچتےؕ ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کیلئے
 عذاب اہلیم ۱۲؎ بما کانوا یفکرون ۱۳؎ واذ اقیل لہم القسید ۱۴؎ واذ یبغ الوقر من الحر
 عذاب دردناک ہو اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے اور جب کہا جاتا ہو ان کو فساد نہ ڈالو
 فی الارض قالوا انما نحن مصلحون ۱۵؎ الا انهم هم المفسدون
 ملک میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے
 ولکن لا یسعرون ۱۶؎ واذ اقیل لہم امواتکم من الناس
 لیکن نہیں سمجھتے اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لاتے
 قالوا انؤمن گناہ امن الشفاء الا انہم هم الشفاء ولکن
 سب کچھ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان پور قوت جان لو وہی ہیں پور قوت لیکن
 لا یعلمون ۱۷؎ واذ القوا الذین امنوا قالوا امنا ۱۸؎ واذ اخلوا
 نہیں جانتے اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں کو تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب پہنچا
 الی شیطانیہم قالوا انما معکم انما نحن مستهزون ۱۹؎
 ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں کو)
 اللہ ۲۰؎ یستہزیئ بہم ویمدہم فی طغیانہم لعلہم یعمہون ۲۱؎ اولئک
 اللہ ہنسی کرتا ہو ان سے اور ترقی دیتا ہو ان کو انکی سرکشی میں (اور) حالت یہ کہ وہ عقل کے اندھ ہیں یہ
 الذین استروا الصلۃ بالہدی فسار یجت تجارۃم وما
 وہی ہیں جنہوں نے مولیٰ مگر اسی ہدایت کے بدلے سونا فح نہ ہوئی انکی سوداگری اور
 کانوا امہتدین ۲۲؎ مثلہم کمثل الذی استوقد نارا ۲۳؎ فلما
 نہ ہونے والے پالنے والےؕ ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب

أَصَاعَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا يَبْصُرُونَ ۝ صُمُّ بَكْمٌ عُمَىٰ فَمِمَّا لَا يَرْجُونَ ۝ أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمٌ أَوْ سَاقٌ وَبَرَقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي فُجُورِهِمْ لِيُرَآهُمْ سَائِرٌ ۝ وَتُرْجَىٰ أُولَٰئِكَ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْذَلَّةِ يُرْجَىٰ مِثْلُ النُّجُومِ ۝ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَانُوا يَصْنَعُونَ الْفُجُورَ ۝ وَإِذْ أُنزِلَتْ الْوَحْيُ إِلَىٰ مُحَمَّدٍ ۝ وَتُرْجَىٰ أُولَٰئِكَ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْذَلَّةِ يُرْجَىٰ مِثْلُ النُّجُومِ ۝ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَانُوا يَصْنَعُونَ الْفُجُورَ ۝ وَإِذْ أُنزِلَتْ الْوَحْيُ إِلَىٰ مُحَمَّدٍ ۝ وَتُرْجَىٰ أُولَٰئِكَ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْذَلَّةِ يُرْجَىٰ مِثْلُ النُّجُومِ ۝ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الَّذِينَ كَانُوا يَصْنَعُونَ الْفُجُورَ ۝

روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے انکی روشنی اور چھڑا ان کو اندھیر میں
 یبصرون ۱۱؎ صم بکم عمیؕ فمما لا یرجون ۱۲؎ اوصیب من السماء فیہ ظلم اوساق و برقؕ یجعلون اصابعہم فی
 کچھ نہیں دیکھتے بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سورہ نہیں تو میں گے یا انکی مثال ایسی ہو
 السماء فیہ ظلم اوساق و برقؕ یجعلون اصابعہم فی
 پیچھے زور دینے پڑا ہوا آسمان آس میں اندھیر میں اور گرنے اور کل دیتے ہیں انگلیاں اپنے
 اذ انہم من الصواعق حذر الموت واللہ معیط بالکفرین ۱۳؎
 کانوں میں مایے کر ملک کے موت کے ڈر سے اور اللہ احاطہ کرنے والا ہو کافروں کا
 یجاد البرق یخطف ابصارہم کلما اصاع لہم مثرافیه
 قریب ہو کہ بجلی آپک لے ان کی آنکھیں جب بجکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں
 واذ اظلم علیہم قاموا ولو شاء اللہ لذہب بصرہم وابصارہم
 اور جب اندھیر ہوتا ہو تو کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر چاہے اللہ تو جانتے انکے کان اور آنکھیں

ان اللہ علی کل شیء قدير ۱۴؎
 بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لاتے اللہ پر اور آخری دن پر
 حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں بلکہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان
 لائے ہیں اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا
 شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چالبازی کا انجام بد خود اپنے ہی کو جھگستا پڑے گا) ان کے دلوں میں
 بڑا مرض ہے سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے ان کا مرض داس مرض میں ان کی بد اعتقادی اور اسلام
 اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر حسد میں جلتا اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر و خلجان سب
 داخل ہیں مسلمانوں کی ترقی سے ان کا مرض حسد اور بڑھتا واضح ہے اور انکے لئے سزا دردناک

ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں ان کی روشنی روشنی سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی غیر خواہنے فساد کی کراہی کا بروقی موجب فساد ہو کر گئی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بھائے مفسد کے صلہ بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غیارت کا بیان ہے کہ اپنے عیب ہی کو گنہگار سمجھتے ہیں) آگے دوسری حیالت کا بیان ہے کہ دوسروں کے گنہگار یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لادیں گے جیسا ایمان لے آؤ؟ یہ یہ بوقوت، یاد رکھو کہ جنگ ہی میں بوقوت لیکن اس کا علم نہیں رکھتے یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات، بظاہر عسریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا، وردِ مآ طور پر توروہ اپنے گنہگار کو چھپاتے پھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب غلو میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمھارے ہم مشرب ہیں) آگے ان کے استہزاء کا جواب ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں جہان دہر گرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء ہی ہو کہ ان کو صلت دی جا رہی ہے جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور مجرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لے جا دیں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل ان کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے (یعنی ان کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلہ میں گمراہی لے لی) ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہو جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرد اگر دی سب چیزوں کو ایسی حالت میں سلب کر دیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہوا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالنے نہ ہوں، تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آ جانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے

دالوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ (پہرے میں گھومتے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے، رکنا ان کے خواہش حق کو دیکھنے سے بچنے کے قابل نہ رہی، یہ مثال تو ان منافقین کی تھی جو خود دل کھول کر کھنسر پر جمے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اس گردہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ متبطلان بدل جاتا تھا، یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور برق بھی ہو چو لوگ اس بارش میں مل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کرکٹ کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لے ہوئے ہو کافروں کو، برق کی یہ حالت ہو کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بنیاد اس نے لے لی جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفان باد و باران میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں کبھی موقیع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں یہی حال ان متردد منافقین کا ہے) ۴

معارف مسائل

رابط آیات جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں قرآن کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بتائیں آیتوں میں اس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اول پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ متقین کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مؤمن نہ تھے، ان لوگوں کا نام قرآن میں منافقین رکھا گیا کہ مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں لیکن ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں بلکہ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے برائیاں لایچے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی جاہل نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے ۴

اس میں ان کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے

بظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا، اور غالباً یہ لوگ بھی ایسا سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ کے
گروہ کو دے سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے ان کی کمال بازی کو کبھی
جیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ چاہی ضرور اسے کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چاہنا ہی
کرتے ہیں وہ قریش میں امن

اس لئے اس کا نتیجہ بنا گیا کہ ہم بے وقت و لے والہ کی کے ساتھ چاہنا ہی نہیں کر رہے ہیں
یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوکہ فریب سے لانا نہیں ہی اس کے رسول اور زمین میں رہی، انہی کی وجہ سے
ہر دھوکہ فریب سے ملنا ہوا ہے، ان کو نقصان ان کی کو نہیں پہنچا، البتہ ان کے دھوکہ فریب کا وبال
دنیا آخرت میں خود انہیں ہی پہنچا ہے۔

تیسری کیفیت میں فرمایا کہ ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اس دلوں میں بڑا علاج اور اللہ تعالیٰ کے
مرض کو مریضوں کو جاری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدالی مناسبت میں مل جائے، اور
اس کے اعتدالی میں مل پیدا ہو جائے یہ کہ آخری تیر چار کثرت و عورت ہوتا ہے۔

مسنار اور یہی کثرت کے اصطلاح میں ان انسان کیفیت کو بھی مرض کہا جاوے جو نفسی، انسانی
کے کمال میں غلطی، نافرمانی، اور زمین کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہو کر پانچ جیسے بھی
آخری تیر وصال موت و طاعت ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دلوں کے امراض و خواص غائب انسان کے انما
سے پیدا ہوتے ہیں، پیچھے دن انسان کے امراض و اختلاط انہیں کیے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں
اس آیت میں ان کے دلوں میں بھی عسکر کو مرض فرا گیا ہے، ہر دھوکہ اور مسلمانوں دھوکہ اعتبار سے
بڑا مرض ہے، ہر دھوکہ مرض ہونا تو ظاہر ہے کہ اولیٰ قرآن سے پیدا کرنے والے اپنے دلوں کے ناسمجھی اور
اس کے احکام سے سرکش ہیں کا نام کفر ہے، یہ خود روح انسان کے لئے ہے کہ ہر مرض اور مسلمان
انسانی کے لئے ہر مرض و داغ ہے، دوسرے دن ان کی ذلیل افواض کی خاطر اس کی چھپانے رہتا اور
ان کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ ہوا، دوسری ذات ہے جو روح کا بہت بڑا مرض ہے
اور نقصان کا جہاں مرض ہوتا اس جگہ ہے کہ کثرت کے دلوں میں، یہ مسلمان نہ دھوکہ دے کہ انہیں میرا
اصل حال نہ مشکل جائے، شب و روز اس کی فکر میں رہتا اور ایک جہاں مرض ہے، اس کے علاوہ اس
مرض کا لازمی نتیجہ حسد ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر منافقوں میں جوگی، مگر وہ مسکین اپنے دل
کی سوز کا اظہار بھی نہیں کر سکتا، یہ سبب قس کے جہاں مرض بھی ہیں مانتے ہیں۔

اور ہر چہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض دلوں میں بڑا علاج اور اس کا مطلب بھی ہے کہ لوگ
مسلم اور مسلمانوں کی نفی سے جلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کہ ہم ترقی دیتا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہد

ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان کا مرض بڑا ہی رہتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں منافقین کا و منافقوں کے ذہنوں پر ہے کہ ان کا علاج کیجئے اور اپنے آپ کو
صالح کہنے لگتے، مسلمان کہہ کر یہ مانع کیا کہ ان کا علاج ذاتی دھوکہ پر دانا نہیں رہے، ہر دھوکہ
چراغ کو بھی اپنے آپ کو منصف کہہ کر تیار نہیں، بلکہ وہ ان کا اس کام ہے کہ جہاں جاتا ہے وہ ان کا
نوکری لے کر منصفی کا جانے لگا خواہ اس کی بہت مشاوری ہو۔

پہلی آیت میں منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک سبب دیا گیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا
انشاء کہیں ایمان دے دیا ہے ایمان دے اور لوگ اس میں غلطی سے ملو اور انسانی نفس میں سبب
ہیں، یہ کہ دھوکہ و حیل میں جو زمین و زمین کے وقت ایمان لائے تھے، کہ انسانی کے نزدیک صرف وہی
ایمان مزید ہے جو صراطِ کریم کے ایمان کی طرح جو بہت بڑی میں کہبت کے سامنے ان کا ایمان کی

اس طرح کا ایمان دوسروں کو بگاڑنا ایمان کہا جائے گا، دوسری میں اس سے معلوم ہوا کہ صراطِ کریم کا
لیکھ کر دے، جس پر ایمان کی ساری بہت کے ایمان کو کہنا مانے گا، اس کو ساری پہنچ نہیں دے کر
ایمان اور ایمان کے لئے دے کر زمین دیکھا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور دل خواہ ظاہر میں
کستہ ہی، چنانچہ لڑنے اور سختی میں کب نہیں سے کیا جائے، اللہ کے نزدیک ایمان میں نہیں ایمان کرنا
لے صراطِ کریم کہنا، میں جو فخر کہا، اور یہی ہر زمانے کے گراہوں کا طریقہ ہے کہ جو ان کو صحیح
داد بظاہر اس کو ہی وقت جاہل مسلمان دے ہیں، مگر قرآن کریم نے بنا کر دھوکہ دے خود ہی
یہ فخر ہیں کہ انہیں امت میں منافقین کے ایمان اور دوسری اس کی طرح ذکر کیا گیا کہ وہ لوگ

ساتویں آیت میں منافقین کے ایمان اور دوسری اس کی طرح ذکر کیا گیا کہ وہ لوگ
جسے مسلمانوں سے ملنے تو کہتے تھے کہ ہم زمین مسلمان بن گئے، مگر جب اپنی قوم کے کارفرموں سے ملنے
تو کہتے تھے کہ ہم تو مشرک ہی، منافق ہیں، ہر دھوکہ اور مسلمانوں کے ساتھ جو حسن
مشرک و مشرکوں کے، زمین کی جو بوقت، ماننے کے لئے ملے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان کی اس اعتدالی گفت کو کا جواب دیا کہ بے شک، کہیں ہیں کہ ہم مسلمانوں
ہستہ ذکر ہے، اور ان کی جو فخر بنا رہے ہیں، ان کا دھوکہ و حیل خود ہی جو فخر ہے میں
اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کریم سے ان کو ذلیل کر دیا کہ ان کے انشراح کا سامان کر دیا ہے، کھانا
میں کسی مذہب کے مذاکرے سے وہ دھوکہ ملے ہیں، دھوکہ، اور ایمان مسلمانوں میں بڑھنے چلے گئے،
یہاں تک کہ ان کا ہر دار و گھن بڑھا، پھر دھوکہ بڑھ گئے، انشراح کی طرح سے یہ مل چکے گئے
استہوار کے جواب میں حق اس نے اس میں بھی پہنچا، اسے تعبیر کیا گیا۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انہوں نے اسلام کو بھی فریب سے دیکھا

اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مستلک ہی تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے بچنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، ان کے اس عمل کو مسترآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا، کہ بہترین قیمتی چیزیں یعنی ایمان دے کر دوسری اور نکلیت چیزیں کفر خرید لیا۔

آخر میں چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابل نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بناء پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دنیوی اغراض سامنے آکر ان کو اس ارادہ سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔

یہ تیسری آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

دعا کیا کہ وہ نفاق جہد نبوی کے ساتھ اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچانتا اور اس کو منافق مخصوص تھا، اب بھی موجود ہو؟ مسترآر دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلادیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے کبھی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب ان کے سچانے کی پہلی صورت قربانی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قلع و عمارت کی مخالفت یا ان پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی ہے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام مسترآن کی اصطلاح میں ملکہ ہے، **الَّذِينَ يُبَدِّلُونَ دِينَهُمْ** آیتاً ۲۱، اور حدیث میں اُس کو زندقہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مگر چونکہ اس کا کفر و میل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علماء اہل بیت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو تو من نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالک سے عمدہ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زامہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

(۲) ایمان و کفر کی حقیقت آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف ایمان کا دعویٰ **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ** میں، اور قرآن کریم کی طرف سے ان کے اس دعوے کا غلط ہونا و **مَآ هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** میں ذکر کیا گیا ہے، یہاں حسد بائیں غور طلب ہیں۔

اڈول یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مسلم ہو، اور جو چیسز ان کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں، ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں ان کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں ان کو جھوٹا قرار دینا اور ان کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے! بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب بڑا قادر مطلق مانتے ہیں اور مشرکین ہندوستان تو پرتو کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان سبتر ہے جو اس کی بتلانی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و احصاء کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملہ میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہوں، ان سے آخرت میں کوئی باز پرس ہوگی اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معقول ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے ان کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں غلط اور بھوٹ ہوا۔

(۳) کفر و ایمان کا ضابطہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر ادر سورہ بقرہ کی تیسری آیت میں کیا **وَرَوٰۤا۟ اَقْبِلْ لَہُمْ اِیْمٰنًا مَّکْمَلًا** آیت ۱۷۷، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص مسترآنی عقیدہ کا مضمون قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدہ کو ماننا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آج کل قادیانی گردہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدہ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرامؓ کے ایمان سے بالکل مخالفت شریعت کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کیلئے جگہ نکالتے ہیں، قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو مَاحِقٌ مَبْذُورٌ مَبْشُورٌ کہاجائے، یعنی وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہؓ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مؤمن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز و زکوٰۃ میں شریک بھی ہوا مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک کہ قرآن کی اصطلاح میں مؤمن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ | حدیث و فقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ ”اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا“ اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متنبہ ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں

جو ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رد بقبلہ نماز پڑھنا ان کے ایمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہو کہ ان کا ایمان صحابہ کرامؓ کی طرح تمام ضروریات دین پر نہیں تھا۔

۴۴ جھوٹ لکھ گھنائونی چیز ہے | یہاں منافقین کے قول اَمَّا بِالنَّبِيِّں الْاٰخِرِیْنَ غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانت میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعویٰ ایمان کے لئے صرف اللہ اور وہ قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایمان ان بزرگوں کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندمی اور گھنائونی چیز ہے کہ کوئی شریعت آدمی خواہ کافر فاسق ہو جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان باطل و باہوم الآخر بھی مشرانی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجہ جھوٹ ثابت ہوا۔

۴۵ ایمان وادیان کے ساتھ براسلوک کرنا | آیت مذکورہ میں منافقین کا ایک مال یہ بتلایا ہے یَخَادِعُونَ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بُرائی کرنا ہے | اللہ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، حالانکہ گردہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شیعہ حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا مشراردے کر یہ بتلادیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا ولی کے ساتھ

کوئی بُرا معاملہ کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے، دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

۱۶ جھوٹ بولنے کا وبال | آیات مذکورہ میں منافقین کے مذہب الیم کی وجہ بتلایا گیا اِنَّکُمْ لَیَکُنُنَّ بِکُوفٍ مِّمَّنْ اُنْ کَ جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد ان کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر مذہب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جہرم تھا، اسی بُری عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑی ہوئی ہے مگر ان سب خرابیوں کی جبر اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بُت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

فَاَجْتَنِبُوا الزَّیْفَ الَّذِیْ هُوَ اَنْ یَّحْسِبَ الرَّسُولُ کَاذِبًا
وَاَجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّیْرِ الَّذِیْ هُوَ اَنْ یَّحْسِبَ الرَّسُولُ کَاذِبًا

(۴) اصلاح و فساد کی تعریف | آیات مذکورہ میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنی نفاق اور مصلح و مفید کی پہچان کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ اس میں لفظ اِنَّمَا جو حصراً و انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، لیکن ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے ان کے جواب میں فرمایا اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰکِنْ لَا یَشْعُرُونَ، یعنی یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

اس پر آدمیوں میں معلوم ہوئے، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقتہً زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ مشرانی کی تصریح وَلَٰکِنْ لَا یَشْعُرُونَ سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے ان میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فتنہ و فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکہ، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر سمجھدار آدمی ان کو فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریعت آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر ان کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق پر باؤ ہوتے ہیں، اور انسانوں کی احسن لائق گراؤٹ سائے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی

ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکہ، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفید ہونے کا انکار اور صلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر ففاق اور کینہ و حسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی پھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کو ہٹا دیتا تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان نہ رہا تو قانون کی جوگت بننے لگی اس کا تماشا آج کل کی آنکھوں پر غصہ ہر شخص ہر جگہ اور ہر وارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن مرنے پر ہے، تعلیم و تعلم کے اور دنیا کا جال بگاڑوں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، تہذیب و تہذیب کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلسوں کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری انتظامات کی بھول بھالیاں ہیں، مگر جرائم اور فتنے فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، دہر اس کے سراپا نہیں کہ کوئی قانون خود کار نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کو ہٹا دیتا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسان کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنادیں، تو پھر فساد و جبرائیم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیم و ہدایت پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی روح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جبرائیم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں خستہ پار کی باگ کردہ جرائم کے اسداد کے لئے نئے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس رُوح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب ہتیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ یہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں رد اکی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گردوں کا علاج سہل ہے، مگر ان انسانیت فراموش

انسانوں کا فساد ہمیشہ ہر رنگ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ لغزب اصلاحی اسکیم بھی سنا رکھ لیتے ہیں، اور خاص ذاتی اغراض فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر (فَسَادَاتُخُنْ مُصْلِحِيخُونْ) کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲۲-۲۱)، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟ جس میں اشارہ فرمایا کہ فساد و اصلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نینوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیک اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے

تعلّمكم تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ

تمہیں تاکہ تم پر ہیز گار بن جاؤ، جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بھونکا اور آسمان کو

بِنَاءً ۝ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا

بھست اور انکار آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میرے تمہارے کھانے

لَكُمْ ۝ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

کے واسطے سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو

خلاصہ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، عبادت نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ، شاہی محاورہ میں عجب نہیں کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے، وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر پردہ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے ہو جتنے ہوا (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابل میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے)۔

ہو جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں تخلیق کیم کے ساتھ اَلَّذِي خَلَقَ مِنْ قَبْلُكُمْ کا اضافہ کر کے ایک قویہ بتلادیا کہ تم اور تمہارے آباء واجداد یعنی تمام بنی نوع انسان کا خالق وہی پروردگار ہے، دوسرے صرف مِنْ قَبْلُكُمْ کا ذکر فرمایا، اَلَّذِي خَلَقَ كَسَمَاءُ یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی دوسری امت یا دوسری ملت نہیں ہوگی، کیونکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا، نہ اس کی کوئی حبیہ یا امت ہوگی۔

اس کے بعد اسی آیت کا آخری جملہ ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ میں دنیا میں گمراہی اور آخرت میں عذابِ نجات پانے کی امید تمہارے لئے صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ توحید کو اختیار کر دو اور شرک سے باز آؤ۔

پھر دوسری آیت میں "رب" کی دوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ

یعنی رب وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برسیا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعہ پردہ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے۔

پہلی نعمت اس سے پہلے آیت میں اُن انعامات کا ذکر تھا جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذکر ہے جو انسان کے گرد و پیش کی چیزیں متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں "الغنی" اور دوسری میں "آفاق" نعمتوں کا ذکر فرما کر تمام انعامِ نعمت کا احاطہ فرمایا گیا۔

اُن آفاق نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے، کہ اس کو انسان کے لئے فرش بنا دیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر مشرانہ ہو سکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہو کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے استعمال نہ کر سکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا ہونا چاہیے جو عام انسانی ضرورتِ زندگی میں کام دے سکے۔

فِرَاش کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو، کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور مشران کا عام طرز یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو بردیکھنے والا عالم، جاہل، شہری و دیہاتی سمجھ سکے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزین اور نظر فریب چھت بنا دیا، تیسری نعمت یہ ہو کہ آسمان سے پانی برسیا، پانی آسمان سے برسانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں ہو

بلکہ محاورات میں ہر ادب سے آنے والی چیز کو آسان سے آنا بولتے ہیں۔

خود قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بادلوں سے پانی برسانے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً ارشاد ہوا: وَأَنزَلْنَا سُلَّالًا مِّن مَّوَدِّهِ مِنَ الْمُنْزِلِ | تمہارا بارش کا پانی سفید بادلوں سے نکلنے والا آہم تَخْلُقُ الْمُنْزِلُونَ ۵ (واقعه: ۶۹) | جو پانی ہم اس کے کنارے والے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً | ہم نے آسمان پانی مہربسے ہونے بادلوں سے کجاً جاً (نبا: ۱۳) | پانی کا ریحہ

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعہ پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے انسان کی غذا پیدا کرنا ہے، پروردگار عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں انسان کی سعی و عمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں، بیجا ہے انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا، جب زمین اور آسمان پیدا ہو چکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کر رہے تھے، ان کے متعلق تو کسی ہر قوتِ جاہل کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہ کے کسی انسان یا بت یا کس اور مخلوق نے کئے ہوئے ہوں یا زمین سے پھل اور پھلوں سے انسانی غذا نکالنے میں کیسے سادہ لوح اور سلی نظر رکھنے والے کہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی سعی و عمل اور اس کی دانشمندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں، پھر بیج ڈالنے اور جانے میں، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہو، لیکن قرآن کریم نے دوسری آیات میں اس کو بھی صاف کر دیا کہ انسان کی سعی اور محنت کو درخت اُگانے یا پھل بیکالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل رکاوٹوں کو دور کرنے سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رکاوٹیں دور کرے اور بس۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں بیج چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ کو دور کرنا، اس میں کھاد ڈال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا ابتدائی کام ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا محنت کے اندر سے جو نازک کوئیل قدرتِ خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاڑ اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، بیج میں سے کوئیل نکالنے اور اس میں پھول پتیاں پیدا کرنے میں اس بیجا ہے کاشتکار کی محنت کا کیا دخل ہے۔

اس طرح کاشتکار کا دوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کوئیل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہو کہ قدرتِ خداوندی سے پیدا ہونے والے کوئیلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کسی

کے ٹھٹھے اچھلتے مچھلتے ہیں بجز ریلے سوانح کے تو کو کیا دخل ہے؟ ان باتوں سے مجھے والے بچکی نور اس سے ٹھٹھنے والے دوست کی غذا تیار ہونا ہے، اور اسی سے وہ پھلنا ہوتا ہے، لیکن ان کا شکار کا پھل کیا پڑا نہیں اس میں کسی کا شکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا ہونے والی کو تھکا کر کے پیدا کرے ہوتے، رخت تک ایک مناسبت وقت میں اور مناسب مقدار میں پہنچا دے۔

تھکے دیکھو کیا کہ دوست کی پیدائش اور اس کے پھلنے پھونکنے میں ازل سے آفرینک انسان کی محنت اور توجہ پر اس کے سوا کوئی اثر نہیں کہ ٹھٹھنے والے دوست کے دانے سے دوڑے پھاوے، یا اس کو مٹانے سے بچائے، ان ہی دوست کی پیدائش، اسی کا پڑ پھلنا، اس میں بچے اور شاغبین پر پہل اور پھل پیدا کرنا سوا اس میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی صورت کو مستحق رحم نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔
 اَفَرَأَيْتُم مَّن مَّاءٍ يَخْرُجُ مِنْ فَوْقِ ثَنَاءٍ ثُمَّ يَصْرُفُ فَضَاءً ثُمَّ يَجْعَلُ لِكُلِّ وَادٍ مِّنْهُ نَهْرًا ثُمَّ لَا تَجِدُ فِيهِ سَائِلًا
 اَفَرَأَيْتُم مَّن مَّاءٍ يَخْرُجُ مِنْ فَوْقِ ثَنَاءٍ ثُمَّ يَصْرُفُ فَضَاءً ثُمَّ يَجْعَلُ لِكُلِّ وَادٍ مِّنْهُ نَهْرًا ثُمَّ لَا تَجِدُ فِيهِ سَائِلًا
 قرآن کے اس سوال کا جواب انسان کے پاس بجز اس کے اور کسی ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس سبب و رشتہ کو جاننے والے ہیں۔

پس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدائش اور برق و باران کے متعلق مسئلہ کا میں انسانی مسمیٰ محنت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح گھنٹیں اور دو فوٹوں کے پیدا ہونے اور ان سے پہلے کیل ٹھٹھنے اور ان سے انسان کی غذا تیار ہونا یہ بھی اس کا دخل صرف ہوتا ہے اور وحیہ میں سبب کا اور اور صرف حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ اور حکمت ہے، انسان کا نہیں۔

غور یہ ہو کہ اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایسی پادشاهت کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں یا انسانی نہیں ہو سکتی، اور جب ان دونوں آیتوں سے معلوم ہو گیا کہ انسان کو عدم سے وجود ملا اور کھوس کی غذا، روزی کے سامان زمین اور آسمان بارش اور دھیل پہلوں کے ذریعہ پیدا کرنا تو خدا جن میں شادانے اور کسی کا کام نہیں، تو ہزاروں کچھ اور کچھ رکھنے والے انسان کو اس پر توجہ کرنے سے سرگرداں پیدا نہیں کرتا کہ عبادت و اطاعت کے لائق اور مستحق ہیں صرف وہ ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی مخلوق نہیں کہ انسان کے پروردگار اور اس کے بقا، اور تعلق کے سامنے سامان یا غیر انسانی پیدا کرے، اور داخل انسانی اور مردوں کی کھوپڑی پر بند کرتا ہے اور دوسری چیزوں کی بسندگی میں مشغول ہو جاتا ہے، ہوا لکھ دے، اسی ظاہر انسان کی زبان پر فرمایا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ
 لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ
 نعمت از توں بغیر سے حق قسم

ان تعالیٰ نے اس کو اپنی مادی مخلوق کا سرور اس سے بنا، اس کا سرور اس کا شکت اس کی خدمت کرے اور صرف ربت کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طاعت نظر نہ کرے، اس کا یہ رنگ جو جاتا ہے

بِجْزَارٍ وَأَوْحَلٍ وَغَلِيظٍ كَرِيمٍ
 بِجْزَارٍ وَأَوْحَلٍ وَغَلِيظٍ كَرِيمٍ
 دو دھن اور اسان جزو کرمی آباد نیست

لیکن قائل انسان نے اپنی حرافت سے اللہ تعالیٰ کی کو تھکا دیا تو اسے کب خدا کی شامی کے جانے سرگرداں ہونا کی شامی کرنا پڑی ہے

أَكْبَرُ وَجْهًا لَّيْسَ لَكَ كَمُتٍ
 أَكْبَرُ وَجْهًا لَّيْسَ لَكَ كَمُتٍ
 ہم نے اولوی علی کا سرور حرافت

اس ضرور کی شامی سے غیبت والے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے وشر فرمایا
 قُلْ أَتَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ عَلِيمٌ
 قُلْ أَتَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ عَلِيمٌ
 پر جو یہ یعنی جب چاہے ہے جان باکو کم کو نیست سے ہست کرنے والا، مخلوقی حرافت کو ہم وشر کے سامنے سامان ہونا کر کے کب غلو سے صبر و میل، حساس اور عاقل انسان بنائے والا، مضامین میں جس کے لئے زمین اور دوسری ضرورت ہست کے لئے آسمان بنائے والا، آسمان سے اپنی پر سامان ہونا والی سے میل اور میل سے غذا تیار کرنے والا، جو حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق و سرکار کون ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابلہ یا ہم وشر کرے، شر اور امانت، اگر وہ اپنی غور کرنا ہے، اس میں اس سے بڑھ کر کوئی ظم اور حق فیہ فعل نہیں ہو سکتی کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر غلو سے دل لگا لیا جاتا ہے اور اس پر کبر و سر کیا جاتا ہے

أَبَاكَ يُبْسِرُ يَوْمَ يُجَاوِزُكَ
 أَبَاكَ يُبْسِرُ يَوْمَ يُجَاوِزُكَ
 کو نہ نظر انداز کر کہ نظر اس اند

مخلص ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی کتابوں کے اور تمام انبیاء کے پیغمبر کا اصل مقصد ہے، یعنی صرف ایک خدا کی عبادت و بندگی میں کا کام کو خدا کے ادب اور خدمت کی نظر ہے، جو انسان کے تمام اعمال و احوال اور اس مخلوق و مباحث پر مہم اور تمام چیزوں پر مہم صرف ایک ذات ہے، بغیر اس کی مشیت اور ارادے کے نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے، نہ کوئی کسی کو فانی یا نقصان پہنچا سکتا ہے، تو اس کی چوٹی تو بہ ہر صیبت و راحت اور ہر گنج و فراخی میں صرف ایک ذات کی طرف ہوجاتا ہے، اور اس کو وہ بصیرت عاقل ہو جاتا ہے گی

اس کے ذریعہ اس سبب ظاہر کی حقیقت کو بیان کیے گا کہ یہ مسئلہ اسباب و حقیقت کے لیے ہے جس کے پیچھے دستِ مہر کی طرف اشارہ ہے۔

برن اور بھاپ کے چمچنے والے دانا پانی پر جب اگر اس طہنت کو کہہ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ برن اور بھاپ کے آگے بھی کوئی حقیقت ہے، اور حقیقی طور پر وہ طہنت نہ صرف برن سے نہ بھاپ ہی، بلکہ سب طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ اس ذات حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس نے برن اور بھاپ پیدا کیے، اس کو کہنے کے لئے بصیرت چاہی ہے، اور جس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دنیا پر کتنا کج دانشمند، غلامِ کفر کا موگر، اس کی مثال داس و دیوانی برفوت کی سی ہے، جس کو جس کے پیشانی پر جو غلام اور بھگتا گاؤں کے ہاتھ میں وہ جھنڈیاں شرح اور سبز چمچ، سبز کے کھلائے سے دوڑنے لگے، گئے ہیں اور شرح جھنڈی کھلائے سے دلی تھر پاتی ہے، یہ وہ کج کردہ ان جھنڈیوں کی کوڑا دست کرنے لگے، اور کہے کہ وہ جھنڈیاں ہی طاقت کی انگلی ہیں کاش بڑی ہیرو قاتل، پیرا کی طرح برہمن کا ڈیو کا کھانا اور دوکان کا کام ہے، جس طرح دیا داس و دیوانی پریشیں ہے کہ اس جانے کو جبر نہیں کہ جھنڈیاں صحتِ طہنت ہیں اور کام و حقیقت ڈھانڈے رکھے، کہ وہ دلی کو کھانے کے لیے اور دوکان کے لیے جگہ اس کا نہیں مہین کے غل پر بند کر کے، اور جس نے ذرا غلام کو کہہ کر کہا تو اُسے یہ نواز چکا ہے کہ وہ حقیقت اس کا چھوٹا ڈھانڈا نہیں ہے، بلکہ اصل طاقت اس اسٹیر کی ہے جو انجن کے ساتھ چلا رہی ہے۔ اس طرح ایک غلام انسان اس طہنت پر چلتا ہے کہ حقیقت کو سمجھنے بھی نہیں پاتا، دگر دلقر سنسنل ایسا یاد آگے ہے، وہ نہ غلام کو تیز کر دے اور نہ وہ کام کو، تو معلوم ہو چکا کہ اسٹیر اور آگ دلی ہی کچھ نہیں، طاقت و قوت صرف اسی ذات کی ہے جس نے آگ اور دلی پیدا کی ہیں اور اسی کی مشیت و امر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ذریعہ آباد کر رہی ہیں۔

شک و ریب و تشویش بندہ اند

ایمن و درودہ با حق زندہ اند

کسی کا حق اس کی غناوت اور قتل کے لئے قتل ہے، اس جرم میں خدا تعالیٰ انسان کو مشرما لیا ہے جو دنیا و دینی امور میں ایک سے بھی امن ہے، اور ایسے موافق پر لیا جاتا کہ جو چاہی کسی قتل کا وقوع پیش نہ ہو مگر ہمارے دوسرے کے تجربہ میں غناوت اور جنت کا حصول اور اجتناب کے حکم کی تعلیم ہے، مگر اس میں شے کو امر و نہی کے خلاف سے جان کرنے میں سخت ہے، ہذا کے کہ انسان کو کوئی عمل اپنی ذات میں غناوت و جنت کی قیمت نہیں ہیں، بلکہ فضیلتِ خداوندی اس کا اصل سبب ہو، ایمان و عمل کی توفیق پر اس کا عملی خداوندی کی کامیابی ہے، طہنت نہیں۔

عقیدہ توحید و دنیا پر ایمان داناں اعتقاد توحید پر اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ان سکون و اطمینان کا شام ہے، ایک نظر میں نہیں بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے، انسان کی تمام شکلات کامل اور ہر حالت میں اس کے لئے پکا، اور ہر قسم و شکل میں اس کا گھاسا ہے، مگر جو عقیدہ توحید کا ماحول ہے، ہے کہ عناصر کے کون و نساء اور ان کے ساتھ تعلقات صرف ایک ہی کی مشیت کے تابع اور اس کی حکمت کے مظاہر ہیں۔

ہر نفس پر جو طہنت کی آواز

ہر عقیدہ میں جو ہزاروں دواز

اور دیکھ رہے کہ جب یہ عقیدہ کی، غلبہ و ممانہ پر چھا جائے اور اس کا حال میں جانتے تو وہ دنیا ہی اس کے لئے حقیقت ہیں جانتے، اس لئے بھگتے، اس لئے وہ ہر شاؤ کی بنیاد ہی میں منہدم ہو جائیگی، مگر کہ اس کے سامنے یہ سبیل ہو گا کہ

انوارِ امانِ خلافت و شمس و دو دست

کو دلی پرورد و نورِ نصرتِ اوست

اس عقیدہ کا ایک ساری دنیا ہے بنیاد پر غرور و خطر سے بالاتر زندگی گزارنا ہے، اس کا حال یہ ہر گز ہے

نمود پرانے بڑی روش

امید و حسن بنیاد رکھیں

کھانا اور دوا اور جو کچھ توحید کا ہے اس کا ہی مفہوم ہے، مگر ہر بلا ہے کہ توحید کا بعض بنیادی انداز اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ ہے اس کا تائید اور تعین کے ساتھ تفسیر و ترویج ہو، کیونکہ توحید خدا واحد و جان پرورد و احد و غنی

کھانا اور دوا اور جو کچھ توحید کا ہے اس کا تائید اور تعین کے ساتھ تفسیر و ترویج ہو، کیونکہ توحید خدا واحد و جان پرورد و احد و غنی ہے، لیکن ہر طور پر صرف دلی میں خراج ہے، توحید کا ایک ان میں دنیا میں اور دین کا بھی دلی حال پر کیا ہو چکے بزرگوں کا عقائد کہ دلی سے بڑی قوت و طاقت ان کو محبوب کر سکتی تھی، اور دیکھ کر ہماری ہمدردی کمزور ہو، ان پر ناراضا ہو، کیونکہ حق دلی سے بڑی قوت و طاقت ان کے قلب کو غفلت و غی میں طرف تھکا کر تھی، ایک پیچیدہ اور کمرامی دنیا کو لگا کر کہہ رہا تھا کہ ہم پر کچھ نہیں چلا سکتے، کیونکہ دلی خدا تعالیٰ کے ہدایت پر چلتی ہے جو خود ہی خدا تعالیٰ میں دنیا پر چلائے، ان کی طاقت و قوت اسی توفیق توحید میں مغرور ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رسالت محمدیؐ کا اثبات

بدریعا عجزا و شرا آن

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو ائمہ اہم نے اپنے ہندے پر قلمے آؤ ایک سورت

يُنِيلُهُمْ وَيَدْعُوهُمْ إِلَى الْكُفْرِ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٧﴾

اس جیسی اور بلائے اس کو جو تمہارا دوست و کار ہو اللہ کے سوا اگر تم پہنچے ہو :

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي دُفِنَتْ فِيهَا النَّاسُ وَ

پھر اگر اباؤں کو کہو اور ہرگز نہ کر سکوئے تو پھر ہرگز اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور

الْعِبَادَ ۖ أَفَلَا لَكُمْ فِئَةٌ ۚ ۝١٧

پھر ہی تمہارے کہنے پر ہے کافروں کے واسطے۔

خُلاصَةُ تَفْسِيرِ

اگر تم کو یہ معلوم ہے کہ جو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نقل کیا ہے، وہ اپنے ہنر سے
خاص پر تو چاہا ہے، نہ لاؤ گے، خود دیکھا اور اس کا نام ہے، جو اس کے ہر حرف کی زبان جاننے
والوں اور اس کی نقل و نقل کے مشاقق ہیں، جو صریحاً اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی
اور جب اس کے بارے میں فہم کن کے ایک خط لکھا ہے کہ یہ نقل دیکھ کر تو اسے اللہ تعالیٰ نے
ماہر ہو جانے لگا کہ یہ عجیب مہیا ہے، اللہ کی اور ایک امانت کے بغیر ہی، اور جو اپنے خاص حیلوں
اور اخلاص سے لکھا (اگر تجھے پتہ نہ ہو کہ ہے، اگر تم جانتے ہو، پھر اگر تم بہ کام دیکر سکو اور قیامت تک
بھی دیکر سکو گے تو پھر لکھو، جو دوزخ سے جس کا اینٹن کو کسی اور چیز کی تیار رکھی ہوگی
یہ کافروں کے واسطے۔

معارف و مسائل

رَبُّطِ آيَاتٍ وَخُلَاصَةُ مَضْمُونِ یہ سورہ ہجرت کی تفسیر اور چھ سو سیاحتیں ہیں، اس سے پہلے دو آیتوں میں جو حد کا ثبوت تھا، اب دونوں آیتوں میں وسالت
نے ان کو پھر نہ غور نہ سمی نہ شکیں علیہ السلام کے ساتھ۔ اور

[illegible]

اور صحت کا خداوند تعالیٰ ہے، خدا کو جب یہ کام ادا کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں رہ سکتا تو قسمی جہاد بھی اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں رہ سکتا، اور ان دونوں چیزوں میں ایک الیہ السلام علیہ السلام کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اور وہی الیہ السلام علیہ السلام کی فرود جا جات اس کی مثال و نظیر دیکھتے ہیں جس طرح زمین و آسمان کی بناوٹ، اپنی برسات اور اس سے پہلے پہل چھلانے سے انسان طاقت کا عاجز ہوا اس کی دلیل عقل کی یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے جس کا یہی طرح کا ہے، اپنی جہاد کے لیے پیش کرنے سے یہ پوری مخلوق کا عاجز ہونا اس کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جس مخلوق کا نہیں اس آیت میں قرآن نے پوری دنیا کے انسانوں کو خطاب کر کے پہنچا دیا ہے کہ اگر تم اس کو اللہ کا سلام نہیں، بلکہ کسی طعن کا سلام کہتے ہو تو تم بھی انسان ہو، ہمیں بھی الیہ السلام علیہ السلام پر قدرت ہے، چاہے یہ اللہ کا سلام ہو تو کیا تم اس سلام کے ایک چر سے بے غم نہ کیے کی نظیر و مثال بنا کر دکھاؤ، اور اس پر غماخے نے یہ مزید آسانی دی جاتی ہے کہ تم اپنی آدمی نہ بنائے تو تمیں بہت سی باتیں سامنے ہیں، اپنے حلیہ اور دوکار رعب کرو، اور کتب میں اعلیٰ کاغذ میں کر کے اس مشن کی کچھنی سی صورت کی مثال بناؤ۔

پہلے ہی میں نہیں کیا دوسری قیمت میں اس کو حیرت و لاف کی گھنٹی بجائی کہ میں نے اس کی ایک سو روپے کا بیچو، پھر غلاب سے ڈرنا کہ جب ستم ستم کا کمیشن کا مثال نشانے سے اپنا جھوٹا محسوس کرتے ہو اور یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ یہ فساد کا کلام نہیں، بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے باخود اور بلند و بالا ہے جس کی قدرت کا علم سیدہ عادی سے، تو پھر اس پر ایمان دلانا اپنے انھوں میں ہی اپنا ٹھکانا ہے اس سے بچ۔

حاصل ہے کہ قرآن میں قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل مجوزہ بہت کم ہے۔ آپ کی رسالت اور حلال کا ثبوت چلی کر رہا ہے، اس اندیل اندیل مذہب کے صحیحیت کو توڑ دینا اور دینے کے بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن اس سب میں سے اس نیکم آپ کے علمی حیرت سے نین قرآن کے ذکر کا تقاضا کر کے، بتلا دیا کہ آپ کا سب سے بڑا دشمن قرآن ہے، اور اس مجوزہ کو قبول کیا ہی نہیں۔

کہا کہ جان تک میں نے غور کیا تو گوں کی یہ سب دہیں غلام ہیں، ان کا کلام در شرع ہے، ذکاوت بڑی، دیندارانہ کمالات ہیں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

اور زہراؑ نے یہی کہہائی اس سے کلمات منکر میں سے کہ کا سفر کیا، اور سہ حرام میں اگر چہ گیا نہیں، اور میں نے اس طرح گذارے کہ سوائے زہراؑ کے باقی کے سب پیٹ میں کچھ نہیں گیا، اس نام عرصہ میں مجھے بیوک کی طبیعت معلوم ہوئی، تو انکی شفقت محسوس کیا، خاص میں ۱۲ ج ۱،

دہیں گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے زہراؑ اور فاطمہؑ کے قصداً وہ زہراؑ کے کلام بہت سے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور مجاہد کے کلمات بہت سننے میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سنی، تم سب میری بات مانو، اور کہتے کہ ان کا نگرہ، چنانچہ مجھے کچھ سال میں ان کی پوری قوم کے فقر بنا ایک ہزار آدمی مسکے ہوئے کہ مسلمان ہو گئے، اور خاص میں ۱۲ ج ۱،

اسلام اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن، ابو جہل اور افس بن شریحہ و جہو بھی لوگوں سے سب سے بڑا دشمن بنا کر دے، اور اس کے عجیب و غریب تر مثل دیکھنے اور لذت سے متاثر ہوئے تھے، عجب قوم کے کہ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے فہم بناؤ گے

تو اس کو قبول کریں نہیں کرتے، اور وہ بھی کا جواب ہے کہ کہی حدیثات میں مانا ہے قبیلہ میں بہت سے رقابت اور معاصرت مقابلہ کیا کرتا ہے، وہ میں کلام میں آگے بڑھتا ہوں، یہ بھی اس کا جواب دینے میں آج تک وہ دونوں پر برتری کے ایک ہی قریب وہ کہتے تھے کہ میں ایک ہی چیز ہوں جو تم سے آسانی سے دینی ہے، اب یہ اس میں کیسے ان کا مقابلہ کریں، میں تو کہی

اس کا انفرادہ ذکر کیا تھا و خدا تعالیٰ

کلام کلام یہ کہ کہ ان کے اس دعوے اور پہلے یہ صرف کہی نہیں کہ ہونے وہ نے دار مان لی، اور نہ کہتے کیا، بلکہ اس کے بے مثل دیکھنے ہوئے اور بے فکر کا کھیلے طور پر اعتراض بھی کیا ہے، اگر کسی انسان کا کلام ہو تو اس کی کوئی وجہ نہیں کہ سارا عجب بلکہ سادہ و دلناس کا حال

فانے سے عاجز ہو جاتی۔

مستور آن اور میری شہرت کے مقابل میں جان وال، اولاد و آہر وہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے توفیق دیا ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ مستور آن کے پہلے کو قبول کرے کہ وہ سولہ ماہ کے مقابلہ میں پیش کر دیا۔

اس کو جب یہ بھی کہ وہ لوگ اپنے باپ اور اہل و عیال کے اور جو صنعت مزاج تھے، و جہت کے اس دے دیا تھے، جب انھوں نے قرآن کو سن کر یہ کہہ دیا کہ وہ رضی اللہ عنہما کلام کی مثل نہیں ہیں، دیکھتے تو محض دھانسی اور کھانسی کے طور پر کوئی کلام نہیں کہنا اپنے لئے کہا، کہا کہ وہ یہ بھی ہدایت

تھو کہ ہم نے کوئی چیز نہیں بھی کر دی جو ہمے عرب کے قصداً و لیاغ اس اہل حقانی مقابلہ میں نہیں قبل کر دی گئے، اور زہراؑ کو تو رسولی ہوئی، اس نے بڑی ذمہ سے سکوت چست کیا، اور سزا کا

مزا جیسے انھوں نے عاف طور پر دست اور سنبھل گیا جیسے کہ وہ قاتل پہلے بیان ہو چکے ہیں، اسی مسئلہ کا ایک اور قصہ یہ کہ عرب کے سردار اسعد بن زواہد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؑ کے سامنے ان کو قرار کیا،

کہم نے جو کلام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے اپنے دیکھنے، دیکھنے تو اسے اور نہ نکالتے، غراب کے، میں انھیں کے ساتھ کرتا ہوں کہ وہ اس مشہرہ اشہرہ رسول ہیں، ہر گرجہ ہے، اس کا کلام وہ دیکھتے ہیں، اس کا کلام میں سنا

(خاص میں ۱۲ ج ۱)

قبیلہ میں صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کی قیس بن سیدہ رسولی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ قرآن سننا اور چند سرائے سننے میں کا وہ اسبے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹا دیا، اور آپ نے دھن مسلمان ہو گئے، اور میری قیوم میں دہیں گئے، تو لوگوں نے کہا،

میں نے تم زہراؑ کے قصداً و لیاغ کے کلام سنے، وہ بہت سے کلام کے کہتے تھے، کا یہ وہاں، عجب چیز کے عقابت شمار ہوں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے

ان تک کہ میری قیوم میں سنا، تم سب میری بات، اور وہ ۱۲ ج ۱، انھیں کی طرف،

کشتی پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی تھے کہ میرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف حاصل کر رہے تھے،

(خاص میں ۱۲ ج ۱)

ہاں اور انھیں صرف اپنی ہی لوگوں سے متعلق نہیں جو آپ کے معاملات سے مجبور ہو کر جاندار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں گئے ہوتے تھے، قرآن کے منتقدین کا بھی یہی حال تھا، مگر ابی ضرار و حسن کی وجہ سے اس کا انکار ہو گیا

ہر دے کرتے تھے۔

مگر وہ سب نے ان کے قصداً انھیں کہی میں ہوا اور یہی مثل کہا ہے کہ ایک مرتبہ ابو جہل اور ابوسہیل اور افس بن شریحہ راست کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلا کہ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں ہر ایک نے غصہ و غلہ کیا، ایک کی دوسرے کو خبر دے، اور غلہ، عاصمہ و زہراؑ میں چھپ کر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسے خوب ہونے کہ ساری رات گذر گئی، جب تک کہ وہی کو سب

راہیں ہوتے، اتفاقاً راستہ میں مل گئے، اور ہر ایک نے دوسرے کا فقر سنا، خوب آپس میں ایک دوسرے کو سلامت کرنے لگے، کہ تو تم نے بڑی حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ اے خدا کو ایسا دے کرے کیونکہ اگر وہ آپ کے جہاد کو کسی کی خبر ہو گئی تو وہ سب مل جائیں گے۔

یہ کہ منکر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آنی چھوڑاں میں سے ہر ایک کے دل میں یہی بات تھی کہ منکر ان میں، اور پھر اس طرح چپ چپ کر ہر ایک نے قرآن سنا، یہاں تک کہ رات گزر گئی، صبح ہوئے ہی، صبح ہوئے ہی، وہ خبر آپس میں ایک دوسرے کو سلامت کرنے لگے، اور اس کے ترک پر سب نے اتفاق کیا، مگر عسری رات آنی تو پھر قرآن کی تلاوت و تلاوت نے انھیں چلنے اور سنے پر مجبور کر دیا، پھر پھر پھر قرآن منکر کرنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، تو آپ سب کے کہا کہ آؤ ہم آپس میں مہاجرہ کریں کہ اگر اللہ کرے گی، چنانچہ اس معاہدہ کی تعمیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھر کی طرف چلے گئے، مگر کوئی بھی شرفی نہیں لے گیا، وطنی مار چیلے انصاف کے پاس پھر چلا کہ جتنا اس کو سلام کے بارے میں تمنا ہو گیا تھا اسے ہے، اس نے دے دے وہی منظور میں منسٹر ان کی حقانیت کا اعتراف کیا، اور اتفاق نے کہا کہ ہذا میری بھی تھی رائے ہے، اس کے بعد وہ ابو بکر کے پاس پھر چلا، اور اس نے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے خود کے کلام کو کیا پایا؟

ابو بکر نے کہا کہ اس بات سے ہے کہ ہمارے خدا ان اور جو یہ منافات کے خدا ان میں ہمیشہ سے جنگ چلی آتی ہے، تو تم کی باور و قیادت میری ہی عمارت پر آگے بڑھتا پایا ہے، میں نے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے حکومت و شہنشاہی کے ذریعہ قوم پر اپنا دھڑا ٹانچا تو ہم نے ان سے بڑھ کر یہ کام کر لیا، انھوں نے تو گویا کی زندگی دیا، انھوں نے سرے میں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے بھی نہیں دیکھ کر یہاں تک کہ پھر باوجود اس بات کے کہ ہم دونوں خدا ان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں ان کے خدا ان سے بڑا آدمی کو ہانے میں، ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر تو اس سے وحی آتی ہے، اب بلا ہر جہ کہ اس کا مقابلہ کرے گی اس لئے تم نے تو بڑے کر لیا، مگر بہتر و درو طاف سے ان کا مقابلہ کر لیا، اور ہر گز ان پر ایمان نہ لائیں گے، انھیں انصاف ص ۱۵۱ ج ۱) یہ کہ منسٹر ان کا رکنا ہو سچا ہے، میں کا شرف کو بھی انصاف کو ٹاٹھرتا ہے، تمام واقعات علامہ حسن علی دہلوی نے مختصر میں تحریر کی ہیں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ عمارت منسٹر آنی کی یہ ہے کہ اس میں فیض کی ادنیٰ تندرہ نہیں آئے والے تیسری وجہ عمارت منسٹر آنی کی یہ ہے کہ اس میں فیض کی ادنیٰ تندرہ نہیں آئے والے

چلی آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، منسٹر قرآن نے خبر دی کہ وہ منسٹر کے مقابلہ میں اپنے آپ کو فائدہ نہیں دے گا، اور وہی منسوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی خبر دی کہ قرآن سال گزرنے کے باوجود آپس میں ہر دوری اپنی خاص بہ غلبہ کا ہیں گے، کہ جسے سننے والوں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق اکبر سے اہمیت کی مشورہ کرنی اور پھر شک قرآن کی خبر کے مطابق روی غلبہ آئے، خوب کہانی بار مانتا بڑی اور بار لے لے چلا، پھر مال دینے کی مشورہ کی تھی، دو مال ان کو دیا چلا، دوسری کریم اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں منسٹر ان کا بیکار، ایک ہفتہ کا بچا تھا، اس طرح اردو بیت سے واقعات اور خبریں ہیں جو اس واقعہ کے متعلق منسٹر ان میں دیکھیں اور ان کی سہائی بالکل درود کو سن کر طبع واضح ہو گئی۔

چوتھی وجہ عمارت منسٹر آنی کی یہ ہے کہ اس میں پہلی آیتوں اور ان کی شرائط اور تاریخی حالات کا ایسا احاطہ نہ کر سکا کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء، یہود و نصاریٰ جو پہلی کتابوں کے ماہر تھے، جانتے تھے ان کو بھی فنی سلاطین، دغلیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دیکھ کر اس کتاب میں قدم رکھا دیکھ مال کی نسبت اضافی، دیکھ کتاب کو بڑا لگاؤ، پھر عمارت منسٹر آنی کے زمانہ تک تمام اقوام عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور بے سوائے اور ان کی منسٹر لیت کی تفصیلات کا بیان تھا، ہر جہ کہ اس کے نہیں ہو سکا کہ بکلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو خبر دی کہ ان۔

پانچویں وجہ عمارت منسٹر آنی کے اعتراف کے لئے ان کی فاقوں کی اطلاع دی گئی، اور ہر گز ان کے اعتراف سے گہر ہو گیا کہ وہ باور میں آئے، یہ کام بھی عالم انصاف والا تھا، وہ یہ کہ سب سے کسی پریشہ سے ملو انھیں نہیں، منسٹر اور شلو قرآنی ہے و

اور اللہ تعالیٰ نے ان کے خدا ان سے بڑا آدمی کو ہانے میں، ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر تو اس سے وحی آتی ہے، اب بلا ہر جہ کہ اس کا مقابلہ کرے گی اس لئے تم نے تو بڑے کر لیا، مگر بہتر و درو طاف سے ان کا مقابلہ کر لیا، اور ہر گز ان پر ایمان نہ لائیں گے، انھیں انصاف ص ۱۵۱ ج ۱) یہ کہ منسٹر ان کا رکنا ہو سچا ہے، میں کا شرف کو بھی انصاف کو ٹاٹھرتا ہے، تمام واقعات علامہ حسن علی دہلوی نے مختصر میں تحریر کی ہیں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ عمارت منسٹر آنی کی یہ ہے کہ اس میں فیض کی ادنیٰ تندرہ نہیں آئے والے تیسری وجہ عمارت منسٹر آنی کی یہ ہے کہ اس میں فیض کی ادنیٰ تندرہ نہیں آئے والے

دوست اور ولی کہتے ہیں تو انہیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہوتا چاہئے، وہ زنا و سرقت کی تمنا کر کے نکاح نہیں اور ہر اور شاد و فراہ!

وَلَا يَجْنِبْنَ أَنْ يَأْكُلْنَ مِنْ ثَمَرِهِمْ أَنْ يَكُنْ لَهُمْ خِزْيَانٌ عَلَيْهِمْ ۚ

سوئی کی تمنا کرنا کسی کے لئے مشکل نہ تھا، جو وہاں لوگوں کے لئے جو زنا کو جھٹکے تھے، مشران کے شاد و فراہ کی وجہ سے ان کو تمنا سے موت میں خوف و ہراس کی کرنی وجہ داخلی، بہرہ کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا نیست تھا کہ فوراً خزانے موت کا ہر مجلس و محل میں مسلمان کرتے۔

مگر یہودیوں یا مشرکین زبان سے کتنا ہی مشران کو جھٹلا بھی ان کے دل جاننے تھے کہ زنا چاہے اس کی کوئی بات نہ ملے نہیں پر حق، اگر عورت کی تمنا بھی اس وقت کریں گے تو فوراً ہر بائیں چپ اس لئے قرآن کے اس کلمے سے پہلے کے باوجود وہی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک عذر نہ زبان سے تمنا سے موت کا اعلان کر دے۔

اور خاص کیفیت یہ کہ جو مشران کے سینے سے ہر خاص و عام اور زمین و آسمان پر ساقی و صاحب طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبریل علیہ السلام کا لے جانے سے پہلے پیش آ کر اقامت انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورۃ طہ پڑھنے کا حکم دیا، جب آپ آفریں آیات پر پہنچے تو جبریل نے آپ کی سریر اور لایا اور لے لگا دیا یہ سیکھ چلا ان تھا کہ میرے دل میں اسلام نے افرق کیا، وہ آیات یہ ہیں،

ذُنُوبُهُمْ وَأَنْزَلَ غَوَاشِيَهُمْ ۖ آمَنُوا بِذُنُوبِهِمْ ۖ فَاذْكُرُوا أَنْ تَكُونُوا مِنَ الْكَاذِبِينَ ۚ
وَالَّذِينَ سَمِعُوا مِنَ اللَّهِ لَا يُؤْمِنُونَ ۚ
أَمِنْ عَذَابِ اللَّهِ مَنْ يَخْلُفُ عَنْ تَرْكِهِ ۚ
أَمِنْ عَذَابِ اللَّهِ مَنْ يَخْلُفُ عَنْ تَرْكِهِ ۚ

یہ ہے کہ اس کو یاد پڑنے اور سنتے سے کوئی کلمہ نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اس کا شوق اور پڑھنا ہے، ورنہ کوئی بہتر پڑھنا اور خوب کتاب کے لیے اس کو دور جہاد پر چلا جائے تو انسان کی طبیعت اس جاتی ہے، پھر پڑھنے کو ہی چاہتا ہو نہ کہ نہ صرف قرآن کا خاتمہ ہو کہ جتنا اس کو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کو شوق و دلچسپی بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلام بھی ہوتے ہی کا افر ہے۔

نہیں وجہ یہ ہے کہ مشرک نے ان اعلان کیا کہ اس کی مخالفت کا زور و حد و شعاع انی نے کیا ہو

و قیامت تک ہر کسی کو انی تیز و تیز کے ہائی رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب قرآن اعلان ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہوئے کرتے ہیں ہر فرقہ ہر زمانے میں انھوں انسان اپنے وہ ہیں اور دہیں گے جن کے سزا میں پڑا مشران اس طرح محفوظ و کامیاب رہے کہ انھیں ایک نیکو کار امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد و عورت، بچے، بھڑے اس کے مائل طبعی ہر سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زبردست نیکو کار کے ساتھ قرآن دلائے گئے وہیں نیکو کار گئے، دنیا کا کوئی مذہب اپنی اپنی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا ہر سواں حصہ بھی پڑھنا نہیں چھوڑتا بہت سے ناہب کی کتاب میں قرآن ہے، پتہ چلے، ابھی تک بیکل بڑ گیا ہے کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی اور اس کے کئے اجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر فرقہ ہر زمانے میں معنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، آج کل کا بیچ شاید کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد وہاں نسبت سکری اور کافروں کے بہت کم رہی اور اولیٰ انھوں نے اشاعت میں پہلے مسلمانوں کو ملل دے دیں مسلمانوں کو اس کا کوئی معذرت نصیب نہ تھا، گمان ہوا کہ ان کے باوجود کس قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دنیا میں اپنی شائع نہیں ہوئی نہ قرآن نہ سائل ہوا۔

پھر قرآن کی مخالفت کو اللہ تعالیٰ نے صرف مسلمانوں اور مسلمانوں پر موقوف نہیں رکھا، بلکہ جلی جانے اور جو ہر زمانے کا امکان ہو، بلکہ اپنے ہندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگرچہ ساری دنیا کے مشران (معاذ اللہ) کا دیکھ کر دینے جائیں تو اللہ کی یہ کتاب ہر کسی اس طرح محفوظ رہی، چند ماہ نظر نہیں کرے جائیں تو چند گھنٹوں میں پھر ساری کی ساری کتبیں جاسکتی ہے، یہ بے نظیر حالت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلام انہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے کہ ہر طرح اللہ کی دہا ہمیشہ اپنی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تصرف نہیں چل سکتا اس طرح اس کا کلام بھی ہر نام مخلوقات کی دستبرد اور تصرفات سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ اپنی رہے گا، قرآن کی یہ شہادت گواہی چودہ سو برس تک مشاہدہ میں آچکی ہے، اور قیامت انشاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی، اس کے کلمے جو کہے کے بعد مشران کے کلام انہی ہونے کے لیے کیا کسی کو شکست شیک کا ناقص رہ سکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ معلوم و محقق ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے کتاب میں کیا ہے، آج کل کے ہندو جو کہ ان کے عقیدے میں اور وہ دہکات میں آتے علوم و فنون سے کئے جاسکتے جو تمام کائنات کی راقی خد و است و حکمرانی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق ہر وقت اور ہر بہت ساری تمام پیش کرے، شخصی ہر حال زندگی کے لئے کرنا ہی اور شہر کی زندگی تک اور دیگر عزائیات و اجتماعیات اور سیاسیاب و ملک کے ہر پہلو پر مددگار نظام میں کرتے۔

لوگوں کی باتا مدہ تحصیل علوم، استادوں کے ساتھ طویل ملازمت و محبت، وسیع مطالعہ، مدقوں کی مشاقی ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؛ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہو؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کسی کتاب قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں صدی اور لاکھوں فیضی اس پر مشربان ہو جائے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہو کر اس کو بھی آپ ہی کے فیض تعلیم کا اثر مستراردیں، اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بمثل دے کر نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی جس کے نتیجے میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر مشرکان کی صرف فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کایا پلٹ ہو گئی، عرب کے تند خو، گنوار، حلم و احتیاط اور علم و حکمت کے استاد مانے گئے، ان حیرت انگیز اعتلانی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان ہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام شہادۃ الاقوام علی صدق الاسلام تحریر فرمائی کہ اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مستادلی بان نے اپنی کتاب تذکرہ عرب میں ص ۷۸۱ سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، ان کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:

”اس پیغمبر اسلام اس نبی اُن کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم کو پہنچا کر جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی اُن کی اپنی قہرنگ اندر سے لاکھوں ہندوگان خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

مشرود دل جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے لکھتا ہے کہ:

”جتنا بھی ہم اس کتاب دینی قرآن کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اُس قدر پہلے مطالعہ میں اس کی ناز و غلی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں محو کر دیتی ہے، متغیر نہادتی ہو اور آخر میں ہم سے تعلیم کر کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے،

عقیدت مالی شان اور تہذیب و تہذیب اور جہاں اس کے مضامین سخن کی غایت رنوت تک پہنچ جاتے ہیں

غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا زور اثر دکھاتی رہے گی۔“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتی بہک زا غلول نے مشہور ۱۹۹۵ء میں مسٹر کونٹ ہنری کی کتاب الاسلام کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فریچ زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

”تفکر حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر نکلے جو بالکل اُن کی تھا تمام مشرق نے استرا کر لیا ہے کہ نوع انسانی مفقودہ یعنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند و نشاء پر رازی نے عربی خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا مستر بنانا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے چلے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پیش تو اس کی آنکھوں سے میا خستہ آنسو جاری ہو گئے، اور ہشت چلا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا“ (شہادۃ الاقوام، ص ۱۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶ ص ۵۹۹ میں ہے:

”قرآن کے مختلف حصوں کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، ہر بانی اور خدا قوت کی یاد دلاتی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، رت پرستی اور مخلوق پرستی کو بالکل نا جائز و مشرک و یا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔“

انگلستان کے نامور مورخ ڈاکٹر گین اپنی مشہور تصنیف رسلطنت روما کا اخطاط و زوال کی جلد ۱ باب میں لکھتے ہیں:

”قرآن کی نسبت ہر اٹلانٹک سے لے کر دور یا نے گنگا تک نے ان لیا ہے کہ یہ پارہائے کی رُوح ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصولی مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیری کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہو، جن کو حیات انسانی کی ترتیب تسمیق سے گہرا تعلق ہو، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر مادی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سامنے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی“

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلا دی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر دنگر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلا دیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ ان کو توڑتے ہیں جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوضَةً فَمَا فَوَّحَهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ بچھڑا دیا اس سے بھی زیادہ اس جگہ زیادہ سے مراد یہ ہے کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (منظری)

فَيُضِلُّ بِهِ الْكَاثِرَ أَتَهْدِي بِهِ الْكَاثِرَ، قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعہ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ۔ فاسقین فسق کے لفظی معنی خسرو ج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں، اور اطاعتِ الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور علیٰ ناسرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ فاسق کا فرق کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین کا مشروہ ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اور مؤمن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی پہلے استعمال ہوا ہے، اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی تقسیم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنائے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (منظری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علامتہ جرات کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ناجر کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعتِ خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہو وہ قرابت ہی حاصل کرتے ہیں۔

الَّذِينَ يَنْفَعُونَ عَثَرَ اللَّهِ مِنْ بَغْيٍ مُبْتَلَاً بِهِ، جتنا اس صورت، حاملہ اور سادے کو کہا جاتا ہے جو وہ شخصوں کے درمیان لے ہو جائے، اور مبتلا ایسے معاملے کو کہتے ہیں

جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجام کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکش کرتے ہیں، جس کی دوجہ ہیں،

اول یہ کہ ایسا کرنے والے اُس اذلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ یعنی کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟ اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا بلیٰ قیٰن آپ رب کیوں نہ ہوتے؟ جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا استراہ ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی اطاعت سے سربموجہ و تراز نہ کریں، اس لئے یہ عہد اذلی انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ہو چکا، اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آئے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی سفید پیر یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں نے ان تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہو جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے چڑوسی اور دوسرے شرمکار کار کے ساتھ ہے، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پائے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعتِ اسلام ہے، اور راہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد آتا ہے، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا وَ يُضِلُّونَ فِي الْأَرْضِ، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں، آخر آیت میں ان کے انجام بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب گناہ ہو، چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے، یں کسی حقیر ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب گناہ ہو، اور نہ قائل کی عظمتِ شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علماءِ ملت کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عرفاً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عربی شرم و حیا کی پرواہ کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

بَلْخَصَّوْاْ لِلْعَالَمِیْنَ اَنْفُسَکُمْ ۚ اَیُّکُمْ اَشَدُّ حُبًّا لِّدِیْنِکُمْ ۚ وَرَدِّیْ سُبْحَانَکَ یَا اَرْحَمَ الرَّحِیْمِینَ
 جس کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام نبیوں سے محروم ہو جائے۔

تعلقات کے متعلق شرمندہ کارنا اَوْ بَلْخَصَّوْاْ مَا اَحْزَنَ اللّٰہُ یَا اَنْفِیْ قُوْتِیْ سَلِّیْ سَلِّیْ سَلِّیْ
 واجب اور اس کے خلاف کرنا حرام تعلقات کو قائم رکھنے کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے ان کا
 قائم رکھا ضروری اور قطع کرنا حرام ہے، خود کیا جائے ذہن و ذہب نام ہی ان حدود و حدود کا ذکر
 جو موقوف اللہ اور مومن العباد کی ذاتیں کے لئے مقرر کی گئی ہیں، اور اس نام کا صلح و فساد نہیں
 تعلقات کو درست رکھنے یا توڑنے پر موقوف ہے، اس لئے یہ تعلقات کے قطع کرنے کو
 جَعَلْنَا قُلُوْبَہِیْۤ اَلْاُتْمٰنَیْنَ اَلْفَاظِیْنَ دہ فساد عالم بظاہر ہے۔

اَوْ لَکُمُ الْاَحْزَنُ الْاَحْزَنُ قُلُوْبِیْ شَاوَدُ ۚ سَوْتُ اَسِیْ شَمِیْ کُرْ قَرَادِیْ ہِیْ مَذْکُوْرہ
 احکام کی خلاف ورزی کرے، اس میں اشارہ ہے کہ اسل خواہ اور لغو مسائل آخرت کی کا ہے، دنیا
 کا اشارہ کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں۔

کَیْفَ تُلَکُمُوْنَ وَاَنْتُمْ اٰمَآنًا فَاَحْیَاکُمْ ۚ ثُمَّ مِمَّا لَکُمْ
 ہماری طرح کا فرمے ہو حدانہ حال سے مالا کو تم نے جانے پھر چلا ہم کو پھر مارا تم کو

ثُمَّ مِمَّا لَکُمْ ثُمَّ اَلِیْہِۤ اَشْرَحُوْنَ ۝۱۰۰ ۚ هُوَ الَّذِیْ یَخْلُقُ لَکُم مِّنَ
 پھر چلا تم کو پھر اس کی طرف لڑتا ہے مارے، دیکھ کہ اس نے پیدا کیا تم کو واسطہ پر

اَلْاَرْضِیْنَ جَعَلْنَا لَکُمْ اَسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ سَوَیًۭا تَحْتَ سَمٰوٰتِ
 گھر زمین میں سے سب پھر سمویا آسمان کی طرف سو چک کر باہر گئے سات آسمان

وَهُوَ یَحْیِیْ شَیْءًا عَلَیْہِمْ ۝۱۰۱
 اور خدا خالق ہر چیز سے خبردار ہے۔

خلاصہ تفسیر

مجاہدین کو زامستہ کرنا تم اللہ کے ساتھ ذکر اس کے اسمائت کو بھلا دیتے ہو اور
 غزوان کا حکم چاہتے ہو اسکا کلام پر دلائل واضح قائم ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی سچے جہالت پر

مٹانے کو کہتے تھے تم نے جان دہین لفظ میں جان پڑنے سے پہلے اسوم کو جان دیا ہو کر حکومت
 دیں گے پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) ایمان والوں کے پاس ہے جانے جاز گئے زمین میدان
 قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جائیں گے اور ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تصدیق
 فائزہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا حساب وہ فائزہ عالم ہے کھالے چنے کا ہوا چھینے اور
 مٹانے کا یا حکمت اور روح کو ناکامی چلنے کا، اس سے معلوم ہو کہ روحانی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے
 انسان کو فائدہ نہ ہو پھر پتہ چلا، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر سبب اس حال پر بیٹھتی تھیں
 خاک کو بھی فائدہ انسان سے خالی نہیں، مگر ان کا تھانہ عقلا کے نزدیک مفید ہے (پھر توجہ فرمائی
 آسمان کی طرف، یعنی اس کی تخلیق و تخلیق کی طرف) اور درست کر کے بنا دینے ان کو سات آسمان اور
 وہ تو سب چیزوں کے جانے والے ہیں ۝

معارف مسائل

کربط آیات | بھیلی اجنبی میں حسد اقبال کے وجود، تو حید اور رسالت کے
 دلائل واضح اور مستحکم و محققین کے خیالات باطلہ کا رد

مذکورہ مذکورہ روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے اسمائت اور افعال کا ذکر کر کے اس پر اقبال
 ٹھہر گیا ہے کہ کتنے احسانات کے ہوتے ہوئے کیسے بے فائدہ کفر و انکار میں سبک دیا ہے جس میں
 اس پر تیسرے پر اگر دلائل میں غور کرنے کی دست گوارا نہیں کرتے تو کم از کم کہیں کا احسان مانا جائے
 کی تعلیم و اخلاص کرنا تو ہر شریعت انسان کا طبی اور فطری تقاضا ہے، اس راستے سے تم اللہ
 کی اطاعت پر آمادہ۔

پہلی آیت میں کہ مخصوص مشرک کا ذکر ہے جو ہر انسان کی ذات اور نفس کے اندر موجود ہے
 کہ پہلے وہ ہے جان و ذات کی صورت میں خدا پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا اور سرمانی،
 و سرمدی آیت میں کہ عام لغتوں کا ذکر ہے جن سے انسان اور تمام مخلوقات فائدہ اٹھاتی
 ہیں، اور وہ انسان کی زندگی اور دنیا کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا
 ذکر کر لیا ہے جس سے انسان کا سرمدی بطن ہے، پھر آسمانوں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی
 حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

ثُمَّ مِمَّا لَکُمْ ثُمَّ اَلِیْہِۤ اَشْرَحُوْنَ ۝۱۰۰ ۚ هُوَ الَّذِیْ یَخْلُقُ لَکُم مِّنَ
 کا انکار نہیں کیا، مگر رسولی خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا عقاب
 کیا، ہے۔

حادثہ ہوا، اہل بیت علیہ السلام نے اس آیت کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سلویٰ کا نجات کو
نجات دے دیا اس لئے پہلا فرمایا کہ اساری کا نجات تمہاری ہوا اور تم اللہ کے لئے ہو، اس کو عقلمند
کا کام ہے کہ جو چیز اس کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اس ذات
سے غافل نہ رہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ (محرر محمد)

اعلیٰ عالم میں اصل اس آیت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں
وہامت ہے اور امت اصل یہ ہو کہ وہ انسان کے لئے طلال و دساح ہوں، کیونکہ وہ اس کے لئے پیدا
کی گئی ہیں۔ جو ان چیزوں کے ہیں کہ شریعت نے حرام قرار دیا، اس لئے ہم تک کسی چیز کی حرمت
قرآن و سنت سے ثابت نہ ہو اس کو حلال سمجھنا جائز ہے۔

اس کے بعد اقل بعض علماء نے یہ قرار دیا کہ انسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کو حرام نہ
ہو اس کا طلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے اصل اس میں حرمت ہے، جب تک قرآن و سنت
کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو ہر چیز حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے تو قوت فرمایا۔
تفسیر ہر فرقہ میں اختلاف ہے فرمایا کہ صحیح یہ ہو کہ اس آیت میں اقوال مذکور ہیں سے کسی کے
لئے جہت نہیں، کیونکہ خلق کا کلمہ میں حرف لام سببیت ہلانے کے لئے آیا ہے، کہ تمہاری سببیت
یہ چیز پیدا کی گئی ہے اس سے خدا تعالیٰ کے لئے ان چیزوں کے طلال ہونے پر کوئی دلیل قائم
ہو سکتی ہے، نہ حرام ہونے پر بلکہ طلال و حرام کے احکام ہونا کلام قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں
انہیں کا اتباع لازم ہے۔

اس آیت میں زمین کی پیداوار پہلے اور آسمان کی پیداوار بعد میں ہونا لفظ علم بیان
کیا گیا ہے اور یہی صحیح ہے، مگر سورہ و الانعام میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک
و خلقا وہ... یعنی زمین کا آسمان کی پیداوار کرنے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی
پیداوار آسمان کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ زمین کی وقتی اور اس میں سے پیداوار
نکلنے و فروگے تفصیل کام آسمان کی پیداوار کے بعد ہو، اس لئے اصل زمین کی تخلیق آسمان
سے پہلے ہو چکی تھی (محرر محمد وغیرہ)

اس آیت سے آسمان کی تعداد و سوات ہونا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ میل
و بیت والوں کا آسمان کی تعداد تو نیکو غلط ہے، دلیل اور معنی خیالات پر مبنی ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۚ وَ قَالَ اِنِّیْ

اور جب کہانیز سے پہلے نے فرشتوں کو کہیں بتائے وہاں زمین میں ایک انبیا کی فرشتوں نے

اَنْتَجِعَ فِیْہَا مَنْ یَّقْبِلُ فِیْہَا وَ یَسْبِغُ فِی الْیَمِّ ۚ وَ یَنْصَحُ نَصِیْحَ
کہا کہ تم کہتا ہے زمین میں اس کو نہا کر اس میں سے انہیں بنائے وہاں زمین میں سے انہیں بنائے
یَحْنِیْکَ وَ یَقْبِلُ فِیْہَا ۚ قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۚ وَ

اور اگر کہتے ہیں کہ اس آیت کو، مگر ایسے شک ہو کہ معلوم ہو کہ نہیں جانتے، اور

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلَٰٓئِكَةِ فَقَالَ

سبحوا اللہ اللہ نے آدم کو تمام سب چیزوں کے نام بتائے کہ ان سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا

اَنْسُوْا فِیْ اَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَاٰتٰوْا

ہاتھ ہاتھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو، اور

سَبِّحْتَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْنَاۤہٗ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝

ایک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تو نے ہم کو سکھایا، جبکہ تو باری تعالیٰ عت والا،

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْہُمْ بِاَسْمَآئِہُمْ ۚ فَلَمَّا اَنْۢبَاہُمْ بِاَسْمَآئِہُمْ

فرمایا اے آدم بتا دے انہیں ان چیزوں کے نام، پھر جب بتا دے ان کے نام

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ اَعْلَمُ

فرمایا کہ میں نے تم کو کہیں خوب جانتا ہوں، پھر انہیں اس آیت کا اور انہیں اس آیت کا

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

مَاۤمِثْلُہٗۤ اِنْ کُنْتُمْ رٰسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ ۚ وَ اَعْلَمُ

وہاں کیا دیکھتا ہے کہ اس آیت میں جو یہ لوشا ہے و الا ترحق بقتل ذلک

کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو خدا کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم
برابر تہیج کرتے رہتے ہیں بعد ازاں اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں فرشتوں کی یہ گزارش
نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جاننے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم
ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں ایک وہ ہر طرح کے لوگ ہونگے، بعض لوگ
اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے
سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور اگر وہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے
کوئی نیا عمل بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیلئے ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق
میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں ہم
ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی (حق تعالیٰ نے
ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق
بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلا دیں گے وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا
اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جہی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے
تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود ہم فرما سہاراؤں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا،
اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں
نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے نوزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا
عنصر موجود ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی،
آگے اسی حکمت الہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی
ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ ہم دیکھا اللہ تعالیٰ نے
آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا یعنی سب چیزوں کے نام اور ان
کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دیا گیا، پھر وہ چیزیں فرشتوں کے رد ہر ذکر دیں پھر فرمایا
کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم پہنچے ہو (یعنی اپنے
اس قول میں پہنچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ
آپ تو پاک ہیں اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا ہم سے پوشیدہ رکھا
کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے
لگ کر دی گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام
کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انھوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت
اس کی متحمل نہ تھی ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا، مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں ذکر جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا
اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراض تو ثابت
ہو گیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ
کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے
سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے احق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم
تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے جب
آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے رد ہر بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے
کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیے ان کو
آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا رد بھو
میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں
آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو
اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف مسائل

رابط آیات | پچھل آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے
انسان کو ناشکری اور ناشکرانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی،

اس آیت سے آخر رکوع تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے،
کیونکہ نعمت و وقیم کی ہوتی ہے، ایک صوری بین محسوس، جیسے کھانا، پینا، روپیہ، مکان، جائیداد
دوسری معنوی، جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم، پچھل آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر
تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے، کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو
دولت علم دی، اور سجدہ ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔
خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیق آدم اور دنیا میں اس کی خلافت
قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے لفظ ہران کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا،
جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی
کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، ان کو زمین کی خلافت اور
انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں، کہ

نیکی ان کی فطرت ہے، بُرائی کا صدور ہی ان سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دنیا کے متطلباً بھی وہ درست کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے ہم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدم کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمین خلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متعلیٰ نہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہو کہ حضرت حق جل و علا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرنا اس کا منشاء تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق و دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن ہر چیز ان کے علم و بصیرت کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں!

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہو، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس سب ان کی مخلوق و ملک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، لَا يَسْأَلُ عَنْهَا شَيْئًا وَهُمْ يَشْكُونَهُ (۱۳۱) اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جاتا ہے۔

بات یہی ہو کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحب وحی ہیں، تمام معاملات اور ان کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے،

مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تائید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا رکمانی روح البیان، دوسرا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ اَلَيْسَ تَخْلُقُ اللّٰهُ خَلْقًا اَكْبَرًا عَلَيْنَا مِمَّا ذَلَا اَعْلَمُ رَبِّنَا اللّٰهُ تَعَالٰی كَوْنِ مَخْلُوقٍ هُمْ اَفْضَلُ اَوْ اَعْلَمُ بِمَا هُمْ فَرَادِیْں گے، حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام خلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیاز مندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنائے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادہ بھی ہے، وہ دوسروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خویشی کا بھی مرکز ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطا و غلطی سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبارت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا، کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے!

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی تم خلافت الہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیل علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سمجھتے اور بتلاتے تھے، مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، ان چیزوں کے حصول کرنے کے لئے طبیعت ملکی متعل نہیں، فرشتہ کیا جالے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، انسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بھوکا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم ہی کو سکھایا جاسکتا تھا، انہیں کو سکھایا گیا، پھر فرشتوں کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تبتائی میں فرشتوں سے ملنے دی گئی، اس لئے ہر کتاب کے تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی فطرت میں تھا وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدم اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتدا سے آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، بچے کا بچہ قیرنا جانتا ہو، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہو، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر ان کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو ان کو کیوں نہ سکھایا گیا، مگر اس کا ماحول تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدل جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے، بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ کہ زمین مخلوقات کے اسماء اور ان کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں پتے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ ماکم کے لئے ضروری ہو کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج و طبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پروراد اہت ہو، اس کے بغیر وہ ان پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کرے کہ بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟ غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم و موزوں ہیں، بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پروراد اہت ہو، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے اثرات کو جانتا ہو، اگر تمھارا یہ خیال صحیح ہو کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر و غرور یا اپنا استحقاق جملانے کے لئے نہیں، بلکہ بعض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے قرآن بول اٹھے، سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم رکھتے والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رجوع اور اس کا افسردہ تھا کہ زیادہ اعلم و افضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہوا کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انھیں علم غیب تھا؟ یا محض اہل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے ان کو بتلایا (روح المعانی) اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد و خوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمائا کیسے حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علی تفوق کا اظہار فرما کر دیا گیا، اور فساد و خوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب اپنی إِنِّي آخِذٌ بِمَا لَكُمْ مَعَكُمْ میں اجمالاً دیدیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت و خلافت کے منافی سمجھو، ہو درحقیقت وہ ہی اس کی الہیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب

علیہم السلام پر چھ چیزوں میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیایت جس طرح خاص خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت دنیایت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنا دیا، کہ آپ کی خلافت دنیایت قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین و آسمان قائم اور زمانہ کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، مسترآن خید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے قواعد و الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ حَافِظُوهُ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۹۱: ۵)

ہم نے ہی مسترآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو حدیث کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرما دیا، کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو نشانہ نہ کیا گا اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مٹ و محو ہو جاتے، اور بالآخر دنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایات حدیث سب کی سب اپنے اصل خود و خال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفہ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت دنیایت جو محدود و جزا کے لئے ہوتی تھی ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول مخاب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت دنیایت و نیابت و قیامت کے بعد نظام خلافت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفہ اللہ ہیں، آپ کی خلافت کے بعد نظام عالم کیلئے جو نائب ہوگا وہ خلیفہ الرسول اور پیکار نائب ہوگا، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

كَانَتْ بَيْنَ رَسُولٍ وَرَسُولٍ مَثَلُ بَيْنِ نَبِيٍّ وَنَبِيٍّ
أَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۖ كَلِمَاتُهَا هَلَكٌ مَتَّعِي
خَلْقُهُ نَبِيٌّ دَلَّيْتُهُ لَا نَبِيَّ
بَعْدِي شَيْءٌ وَتَسِيكُونُ خُلَفَاءَ
فَتَكْفُرُونَ

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دیا، کہ آپ کی پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا منظر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماع امت تسلر دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فَنُجِّتِجَ أُمَّتِي عَلَى الْفِتْلَانِ ۖ

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے بھی واضح ہو گیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جب کہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابت زمین اور نظم حکومت کے لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہو گیا، یہ امت جسے خلافت کے لئے منتخب کرے وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظام عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سائے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کے آخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز

اور ایک درجہ میں امت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان متعلق منبرایا:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء
الراشدين

خلافت راشدہ کے بعد خلافت راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کو بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک ہر قوم کا ملحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی، تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا، کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا امیر اور اول الامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد: **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ** (۲۸۱:۲) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہلیاں اسی طرز عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ جمہوری ملکوں کی اسمبلی اور ان کے ممبران شورا میں مسروق بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھا یا برا قانون بناتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلس شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر ان کی قانون سازی بھی شریعت کے تحت کے تحت کے تحت کے اصول کے دائرہ میں ہو سکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔ آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی ازل: یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہ کا ہے، چند اہم دفعات کا ثبوت دوسرے: یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت اہلبیت کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافت رسول کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب کے تحت ہوتا ہے۔

وَاذْكُنَّ لِمَلِكِكُمْ اسْجُدْ وَالْإِذَا مَسَّجِدُ وَإِلَّا ابْلِيسَ

اور جب ہم نے حکم دیا کہ فرشتوں کو کہ سجود کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے، مگر شیطان

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۳۰﴾

اس نے نہ مانا اور تکبر کیا، اور تمہارے کامندوں میں سے

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباس رضی عنہما سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سب سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافر میں سے۔

معارف و مسائل

ربط آیات | پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت

خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے کہ ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، ان کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرما دیا جائے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعلیم کرائی جائے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ ان دونوں سے کامل اور صادق

آئینہ خواہاں ہر دو گروہ کو تہنیت داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قومی کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعلیم کرائی جائے کہ علم بھی یہ امر ظاہر ہو جائے کہ یہ ان دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعلیم کر رہے ہیں، اور گویا زبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو آدم صفا ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یک جا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا، اور غرور میں آگیا۔

تعطیلی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں غیر اللہ کے لئے تعطیلی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو مکہ دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے، (مگر اس شریعت میں تعطیل مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)۔

یہ حدیث میں صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے، اصول حدیث کی معروف کتاب تدریب الراوی میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہو جاتی ہے، جو بشران کی طرح قطعی ہے، یہاں تو میں صحابہ کرام سے منقول ہے، یہ میں صحابہ کرام کی روایتیں ماسیہ بیان القرآن میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

مسئلہ :- ابلیس کا کفر محض علی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل پس حکم بپائی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

مسئلہ :- یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا ہے کہ اس کو طواغوس الملائکہ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے کبر کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی نفی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کر لی، اس لئے اس کی حالت کا کام کر بیٹھا، بعض نے فرمایا کہ کبر و غرور اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا، تفسیر روح المعانی میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے،

إِذَا الْكَفْرُ تَكُنَّ غَوًى تَنْزِيلُ اللَّهِ يُلْعَثُ شَيْ
فَأَوَّلُ مَا يَنْجِي عَذَابُهُ إِجْتِهَادُهُ

روح المعانی میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہو جو آخر عمر اور اول منازل آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غرور نہ ہونا چاہئے اور

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
اور ہم نے کہا اے آدم رہا کرو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو

حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ
جہاں کہیں سے چاہو اور پاس مت جانا اس درخت کے، پھر تم ہر جاؤ گے ظالم

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا

پھر بلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اترو

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ الْحِينِ

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہو اور نفع اٹھانا ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی رجن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا طر سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مارہ لے کر بنا دیا تھا، بہشت میں پھر کھاؤ و پوئوں میں سے ہار اغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائو اس درخت کے ورنہ تم بھی اپنی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرمادیا، اور پھر آٹا کو اختیار ہو کر اپنے گھر کی چیزوں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، اور جس چیز کو چاہے منع کر دے) پس بعض سن دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو بر طرت کر کے رہا ان کو اس پیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ بیچو اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ بٹھرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

معارف و مسائل

یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا مکمل ہے جس میں بیان کیا گیا کہ جب آدم کی فضیلت اور خلافت ارضی کی مصلحت فرشتوں پر واضح کر دی گئی، انھوں نے تسلیم کر لیا، اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر کمال دیا گیا، تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو، اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا، یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا، شیطان جو آدم کی وجہ سے مردود ہوا، خار کھاتے ہوئے تھا اس نے کسی طرح موقع پا کر اور مصلحتیں بتلا کر ان دونوں کو اس درخت کے کھانے پر آمادہ کر دیا، ان کی لغزش کی وجہ سے ان کو بھی حکم ملا کہ اب تم زمین پر جا کر رہو، اور یہ بھی بتلا دیا کہ زمین کی رہائش جنت کی طرح بے غل و غش نہ ہوگی، بلکہ وہاں آپس میں اختلافات اور دشمنیاں بھی ہوں گی جس سے زندگی کا لطف پورا نہ رہے گا۔

آیات مذکورہ سے متعلق مسائل واحکام شرعیہ

اَشْكُنْ اَنْتَ وَرَوْحُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے اَشْكُنَا الْجَنَّةَ یعنی آپ دونوں جنت میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد مَکَلَّا اور لَا تَعْلَمُ تَابِیْنِ دَرْنُوں کو ایک ہی صیغہ میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَرَوْحُكَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب صرت حضرت آدم کو قرار دیا اور اپنی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے۔

مسئلہ اول یہ کہ یہودی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دوسرے یہ کہ سکونت میں یہودی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ لفظ اَشْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شان ملکیت کی ہوتی ہے وہ ختمی، کیونکہ لفظ اَشْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دیا گیا یہ تمہارا مکان ہو، درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاق ملکیت ایمان اور عمل صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے جو قیامت کے بعد ہوگا، اس سے حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ میرے گھر میں رہا کرو یا یہ کہ میرا گھر تمہارا مسکن ہو، اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا (قرطبی) فَاَوْفُوا بعهْدِیْ دَعَاۤءِیْ یعنی کھاؤ تم دونوں جنت سے با فراغت اس میں بطور تذکرہ سابق خطا

شوہر کے تابع نہیں حضرت آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے مَکَلَّا مَکَلَّا فرمایا اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں یہودی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے اور یہ اپنی خواہش کے مطابق ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی

اِنَّ هٰذَا لَفِیْ شَکَکٍ لِّیْطٰیظُوْا لَفْظًا رَّفَعًا، باتوں میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کا فطری حق ہے جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں کاٹو اور رانٹ نہیں اور لفظ یُطٰیظُوْا میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے، کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خط ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں ہوتا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہو اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ حَبِیْثٌ یُّطٰیظُوْا فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سُزُوْا لَکَآ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمٰنُکُمْ الشَّجَرَةَ یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ اس سے اصول فقہ کا مسئلہ سد ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں سَدِّ ذَرٰعٍ ہے۔

مسئلہ عصمت انبیاء

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی تنبیہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو ناپاک گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیر گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور امت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیر صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جاتے گا، اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں شکانا ہے۔

البتہ فسران کریم کی ہیئت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہو کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے ایسی کام صدور ہو جائے کہ کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ یہود نسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور

تشریح سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا ہونسیاں ہو سکتا ہے (تفسیر بحر المحیط)
مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے
بھونٹیں غلیبی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات
کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتباراً
سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعہ کے متعلق علماء تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں
ان میں چند یہ ہیں:

اول یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف
اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس
کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لیکر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں
میری امت کے مردوں پر حرام ہیں، ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں
تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے، بلکہ تمام ریشمی کپڑے اور سونے کا یہ حکم
ہے، لیکن یہاں کسی کو یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ مانعت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ وابستہ ہو
جو اُس وقت آپ کے دست مبارک میں تھے، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ
جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا مانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی
دوسرے اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہیں کسی
ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مبغض ہو، جس درخت کی مانعت کی گئی ہے وہ
دوسرا ہے، اس درخت کی مانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ دوسرے دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی مانعت صرف
آپ کی ابتداء پیدائش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اول عمر میں قوی غذا
سے روکا جاتا ہے، بلکہ غذا دی جاتی ہے، اور وقت پیدا ہونے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہو جاتی ہے
قواب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ مانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے
کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے
کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ مانعت یاد رہی جو ابتداء آفرینش کے وقت اس
درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت فَتَنِي وَكَفَّ نَجْوَىٰ لَكَ هَؤُلَاءِ (۲۰: ۸۵) میں آدم علیہ السلام

بھول گئے اور ہم نے ان میں کھنگلی نہ پائی، یہ اس احتمال کی تائید کرتی ہے۔
بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہو کہ جان بوجھ کر نافرمانی
کا مدد در حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہو گئی، یا اجتہادی لغزش ہو، درحقیقت
گناہ نہیں، مگر آدم علیہ السلام کی شان نبوت اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے اعتبار سے
یہ سنسز بھی بڑی سمجھی گئی، اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم
علیہ السلام کی توبہ و استغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ
آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور دوسرے
ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی دوسرے ڈالے، جنات و شیاطین کو
حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں دوسرے ڈال سکتے ہیں، اور اگر داخل ہو کر
بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں
پڑنا بے فائدہ اور لافین بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی منہبہ کر دیا تھا، اِنَّ
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ نَجْوَىٰ الشَّيْطَانِ لَيَكُونَنَّ مِنْهَا رَافِقُونَ ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کر لے جس کی وجہ سے
تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں کس طرح آ گئے، اس کا جواب
بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی
ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ
شیطان ہے۔

فَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَةً فَتَبَٰءَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ

پھر یہ کہ میں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا

الرَّحِيمُ ﴿۲۰﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

بہرہاں ہم نے تم کو دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب، پھر اگر تم کو پہنچی میری طرف سے کوئی

هُدًى فَمَنْ تَبَعَ هَٰذِهِ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۱﴾

ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ

اور جو لوگ منکر ہوتے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ

فِيمَا خَلِدُونَ ﴿۳۰﴾

اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصہ تفسیر

بعد ازاں حاصل کرتے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی غلامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرمادیئے، تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ان پر زمین توبہ قبول کر لے، بیشک وہی میں بڑی توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان اور حضرت حواء کی توبہ کا بیان سورۃ اعراف میں ہے، قَالَ لَا زُنْيَا فَلَئِمْنَا آفُكُنَا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اترنے کا حاکمانہ طور پر بطور مزا تھا، اب یہ حکم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا فَلَئِمْنَا آفُكُنَا اِمْثِلْنَا جَنَّتْنَا (یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ بچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آدے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پر وہی کر چکا میری اس ہدایت کی تونہ کچھ اندیشہ ہو گا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے ان کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہزل اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، حزن وہ کیفیت ہے جو کسی مصرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن و غم دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ ان پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا) اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ کورہیں گے۔

معارف و مسائل

رابطہ آیا پہلی آیات میں شیطانی دستور حضرت آدم کی نافرمانی اور اس کے نتیجے میں جنت نکلتے اور زمین پر اترنے

کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے خطاب عتاب کہاں کئے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی بہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلافت شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دونوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھائیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ، آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، (یعنی ان کی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی میں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان مگر چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود ملے آنا اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف بنانا پھر ان میں خلافتِ ابدیہ قائم کرنا، حدود اور احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیق آدم علیہ السلام سے پہلے ہی کر دیا گیا تھا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْ الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور مزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافتِ ابدیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فَرَاقُنْ مِنْصِبِیْ کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ، ہم نے حکم فرمایا کہ بچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے، تو جو شخص پر وہی کرے گا میری اس ہدایت کی، تونہ کچھ اندیشہ ہو گا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہو گا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقَّیْ، تلقی بمعنی میں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو مستقبل کرنا (روح کشاف) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔

تَحْلِمَاتٍ، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو اِخْرَضَ توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مغفرتیں صحابہ سے کہی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو مسترآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں، یعنی رَبَّنَا اَلْهَمْنَا اَلْفَسَاوِلَ اَلْنَفَرِ تَغْفِرْ

لَتَنَادَىٰ مَخْتَمًا فَتَشَاوَرُوا مِنَ الْخَيْرِ يَوْمَئِذٍ - (۲۳: ۷)

تائب، توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندہ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اول اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوم اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا، اگر ان میں چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے اللہ توبہ کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ، تائب علیہ یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے معنی ہیں توبہ قبول کرنا، بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے تو فرمایا وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا، کہ اپنے کئے پر ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا، رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنَّا لَكَاظِمُونَ، یعنی ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر جرم نہ کریں تو ہم سخت خسارہ والوں میں داخل ہو جائیں گے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي، یعنی اے میرے ہائے دلے میں نے اپنے جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے، اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (۲۱: ۸۷)، یعنی اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں، (مطلب یہ کہ مجھ پر رحم فرمائیے، (قرطبی)

قائدہ: حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی سنسز یا بحول صادر ہوئی ہے، اولاً تو قرآن مجید نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے، فَادْرَأْنِيَا الشَّيْطَانُ عَنَّمَا فَتَاخَرَجْتُمَا اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کر کے لفظ اُخْرِجْتُمَا فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں یہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس سنسز کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے، فَصَحَّىٰ آدَمُ وَغَيْرُهُ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مشورہ رکھا ہے، اس لئے بطور پروردگار کی طرف سے اس کا ذکر صراحتاً نہیں فرمایا، اور ایک حسب گزشتہ ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا میں دونوں کی توبہ کا ذکر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہے کہ حضرت حوا

کا قصور محض نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقبل ذکر کی ضرورت نہیں بھی گئی۔ (مستطاب)

تائب اور تائب میں فرق امام قرطبی نے فرمایا کہ لفظ تائب بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے إِنَّ اللَّهَ يُجِيبُ الْمُتَوَّابِينَ (۱۱۲: ۱) اور اللہ تعالیٰ کیلئے بھی جیسے اس آیت میں هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، جب بندہ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تائب کا حکم ہی، اسی معنی کا دوسرا لفظ تَائِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں، جن کا ذکر قرآن و سنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

ممنہ سے توبہ قبول کرنا اختیار اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہ تو نصاریٰ اس قاعدے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں

مستلا ہو گئے، کہ پادریوں اور پیسروں کے پاس جاتے، اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا، آج بھی بہت سے نادان مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کر سکتا ہے۔

آدم کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں، تَحْنُتَا اَهْبَطُوا اَرْضًا جَبِيحًا جنت سے زمین پر اترنے کا حکم بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا، اس سے پہلی آیت میں آپکا ہوا، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے

میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اترنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اترنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافت الہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجے کا ذکر جو خلافت الہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوبارہ مصلح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تھنا بین آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا، کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

دعا و غم سے نجات مرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا

اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو

انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔
 خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
 مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
 انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
 سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
 میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں منسرایا کہ لا حزن علیہم بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
 اس کی ضمیر فاعل کو مستند کر کے وَلَا تَهْتَدُوا بِخَيْرٍ قُوْنٍ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
 کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
 کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
 خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
 جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہ باشد

وگر باشد بنی آدم نہ باشد

مخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے
 میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مگر ان مجید میں دوسری جگہ
 بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا آپ
 پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْعَمَلُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۱۲۵:۲۰) اس سے
 معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، مگر اس شخص کے جس نے اپنا
 تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ
 جو بچتا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی
 تکلیف یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی
 ہیبت و جلال تو ان پر اور مستحکم زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں
 یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے
 فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء
 و اولیاء کو بشری طور پر طبیعتی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا
 سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَأَوْجَسَ فِيْ فُجَيْفَةٍ خَائِفًا مِّنْهُ (۱۷:۲۰) کیونکہ یہ
 فطری اور طبیعتی خوف ابتداً بحال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔
 اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس
 بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں
 گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَیْءَ مَا یَعْمَلُوْنَ یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی
 ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ
 ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مومنین جو
 ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی کریں گے انہوں نے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے
 کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاِیُّہَا اِسْرَآءِیْلُ اِذْکُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اٰنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاذْكُرُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پر یاد کرو

بِعَهْدِیْ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاِیَّآیَّیْ فَاَرْهَبُوْنِ ۝۱۰ وَاٰمِنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن لے اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَّکُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝۱۱

کو جو میں نے تماری ہر پہچان پر کتاب کو جو تمہارے پاس ہو اور تم پہلے کفر کرنے والے

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمًا قَلِیْلًا ؕ وَاِیَّآیَّیْ فَاَتَّقُوْنِ ۝۱۲ وَلَا تَلْبِسُوْا

نہ میری آیتوں پر مول تمھوڑا اور مجھ ہی سے بچنے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْمُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

سچ میں غلط اور مت چھاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خلاصہ تفسیر اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

دعا و غم سے نجات مرنے والوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے نوازا ہوگا

اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے لئے دو

انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔
 خوف، آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حزن کسی مقصد
 مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام
 انواع و اقسام کا ان دونوں غظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس
 سے باہر نہیں، پھر ان دونوں غظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ خوف کی نفی تو عام انداز
 میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں منسرایا کہ لا حزن علیہم، بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور
 اس کی ضمیر فاعل کو مستند کر کے وَلَا تَهْتَدُوا بِخَيْرٍ قُوْنٍ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے
 کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ
 کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کر لے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا
 خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مالدار کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا
 جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے

دریں دنیا کے بے غم نہ باشد

وگر باشد بنی آدم نہ باشد

مخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے
 میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، مگر ان مجید میں دوسری جگہ
 بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے، کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا آپ
 پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا، اَلْعَمَلُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَدْخَبَ عَنْ الْكَوْنِ (۱۷:۲۵) اس سے
 معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، مگر اس شخص کے جس نے اپنا
 تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجددیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ
 جو بچتا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی کسی
 تکلیف یا کسی خواہش و مراد پر ان کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی
 ہیبت و جلال تو ان پر اور مستحکم زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں
 یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی دنیوی نعمت کے
 فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور امت

کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء
 و اولیاء کو بشری طور پر طبیعتی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاشعی کا
 سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے فَأَوْجَسَ فِيْ فُجَيْفِهِ خِيفَةً مُّؤَسًی (۱۷:۲۵) کیونکہ یہ
 فطری اور طبیعتی خوف ابتداً بحال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَخَفْ تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔
 اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس
 بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں
 گراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَیَ بَلَّوْا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی
 ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے ان کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ
 ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں یعنی کفار اور مؤمنین جو
 ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں وہ عمل کیسے بھی گنہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے
 کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءِیْل اذْكُرُوْا النِّعْمَۃَ الَّتِیْ اٰنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاذْكُرُوْا

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پر یاد کرو

بِعَهْدِیْٓ اَوْفِ بِعَهْدِکُمْ ؕ وَاِیَّآیَ فَاَرْهَبُوْنَ ۝۱۰ وَامْنُوْا بِمَا

میرا اقرار تو میں پروردگاروں تمہارا اقرار اور مجھ ہی سے ڈرو، اور امن و اس کتاب

اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرِیْنَ ۝۱۱

کو جو میں نے تماری ہر پہچ بتا دیا ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہو اور مت ہو سب سے اول منکر اس کے اور

لَا تَشْرَوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمًا قَلِیْلًا ۝۱۲ وَاِیَّآیَ فَاَتَّقُوْنَ ۝۱۳ وَلَا تَلْبِسُوْا

نہ میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچنے رہو، اور مت ملاؤ

الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُنْ لَّکُمُ الْحَقُّ ۝۱۴ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۵

سچ میں غلط اور مت چھاؤ سچ کو جان بوجھ کر۔

خِصَصَ تَفْسِیْرُ اے بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد)

یا ذکر وہم لوگ میرے ان احسانوں کو جو کہتے ہیں میں نے تم پر ان کا حق نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارا لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں، اور پورا کرو تم میرے حمد کو یعنی تم نے جو قرابت میں مجھ سے حمد کیا تھا جس کا بیان شترآن کی اس آیت میں ہے وَ تَقَعُّوا لِحَقِّهِ اَدْعَاؤُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ اَعْمَلْتُمْ اَنْتُمْ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَبِيًّا (الانبیاء: ۵۷) پھر ان لوگوں کو بتایا تھا اے حمد کو یعنی میں نے جو حمد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں لکھا ہے تَقَعُّوا لِحَقِّهِ اور صریحاً بھی ہے ذر وہ اپنے عوام متعقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جائے گی، اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہو (یعنی شترآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلائے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، یعنی تورات کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تعریضات کی گئی ہیں وہ خود تورات و انجیل ہونے ہی سے خارج ہیں ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی، اور مت ہنو تم پہلے انکار کرنے والے اس شترآن کے (یعنی ہمیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے) ان سب میں اذل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک ان کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا ہے گا، اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاد ضہ حقیر اور خاص مجھ ہی پر کھڑے ہو، (یعنی میرے احکام) چھوڑ کر یا ان کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیا سے ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ ان کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بُری بات ہے)۔

معارف مسائل

رابط آیات | سورۃ بقرہ شترآن کے ذکر سے شرودع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ شترآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مومنین اٹھائیں گے، اس کے بعد ان لوگوں کے مذاپ شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لاتے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، اور تیسرا ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مومنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور شترآن مجید کا ذکر کیا کہ سچے مومنین پر تخلیق کردہ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب اور ناشترانی سے بچنے کی فکر ہو۔

پھر کفار کی درجہ بندی جن کا ذکر اوپر آیا ہے کھلے کافروں متانہ، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک تو بت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پر بڑھ امتی تھے، جیسے عام اہل مکہ، اسی لئے شترآن میں ان لوگوں کو امتین کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاء پر ایمان لاتے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل وغیرہ کا علم ان کے پاس تھا، انکے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو یہود کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جمیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ نصا آری کہلاتے تھے، ان دونوں کو شترآن میں اس بنا پر اہل کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہل علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں مسند زاد و قابل اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات ان پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۃ بقرہ جہگہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہل کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تیس آیات آخر پارہ الحمد تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اول ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر ان کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی ساٹھ آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوت ایمان اور چار میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیل خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر پھر اہتمام کے لئے یہ بیتی اِشْرَآءِ اَیْمٰنِ شَرْمَاکْرَا نھیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو موثر اور وقیع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

بیتی اِشْرَآءِ اَیْمٰنِ۔ اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی عبد اللہ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعبد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل، شترآن میں اس جگہ ان کو بنی یعقوب کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام اسرائیل کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عیسیٰ یعنی اللہ کی عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

اور پورا کرو تم میرے عہد کو، یعنی تم نے جو مجھ سے عہد کیا تھا، تو ریت میں جس کا بیان بقول قتادہؓ و مجاہدؓ اس آیت میں ہے: **وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَكُتِبَ فِي الْكِتَابِ لَكُمْ عَشْرَةٌ آيَاتٍ** (ان، قُرْآنِ احسنًا، دیباچہ ۶، سورہ مائدہ: آیت ۱۲) اس میں سب سے اہم مادہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں نیز نماز، زکوٰۃ، اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جن کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے (ابن جریر بسند صحیح)

پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو، یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کروں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشاء کے خلاف کلمہ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے آمدنی بند ہو جائے گی۔

(۱) اُمّت محمدیہ کی ایک خاص فضیلت اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور اُمّت محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا **قَدْ كُفِّرَتْ عَنْكُمْ**، یعنی تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، اس میں اُمّت محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کا تعلق حسن و نعم سے بلا واسطہ ہی، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری اُمّتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعہ محسن کو پہچانتے ہیں۔

(۲) ایفائے عہد واجب اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدے کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی اور عہد شکنی حرام ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ

مضمون آیا ہے: **أَوْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ** رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملیگی

اس سے پہلے ہی ایک سزا دی جائے گی کہ خشر کے میدان میں جہاں تمام اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اسی جیسی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدان خشر میں رسوا اور شرمندہ کیا جائے گا (صحیح مسلم عن سعید)

(۳) جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنے، اس پر **أَوَّلُ كَافِرٍ** کا فر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد ہی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب کھاتا ہے

یہ فرمایا کہ پہلے کافر بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر پڑے گا، اس پہلے کافر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بن کر ان سب کے وبال کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فَأَوَّلُ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دنیا میں دوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی، اس طرح جو شخص دوسروں کے لئے کسی نیک کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب نیک عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا ان لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، شتران مجید کی متعدد آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

(۴) **وَلَقَدْ كَفَّرْنَا وَآيَاتِنَا**، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہے جو آیت کے سابق لمباق سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع امت حرام ہے۔

(۵) تعلیم شتران پر رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح بتلا کر یا چھپا کر اس کی اجرت لینا کیسا اجرت لینا جائز ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہو

کہ تعلیم شتران پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں، فقہ اہل اہل بیت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام عظیم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے منع فرماتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شتران کو ذریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن مشائخ حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا شاہدہ کیا، کہ شتران مجید کے تعلیم کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان تعلیم

کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم مسترآن کا سلسلہ بحیرہ بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم مسترآن پر توجہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آجکل اسی پر توجہ دینا چاہئے، کہ تعلیم مسترآن پر اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دوسرے وظائف جن پر تعلیم مسترآن کی طرح دین کی بقتا موقوف ہو، مثلاً امامت و اذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم مسترآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی (رد مختار، شامی)۔

(۶) ایصال ثواب کے لئے ختم قرآن پر علامہ شامی نے درمختار کی شرح میں اور اپنے رسالہ شفا بعلیل اجرت لینا باتفاق حجاز نہیں میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی کہ تعلیم مسترآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاحسریں فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں غفل آنے سے دین کا پورا نظام بخل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے فردوں کو ایصال ثواب کیلئے ختم مسترآن کرنا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لیکر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوتے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا، علامہ شامی نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعہ، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہیں، اور خیر الدین دہلی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصال ثواب کے لئے قبر پر مسترآن پڑھوانا اجرت دے کر ختم مسترآن کرنا صحابہ و تابعین اور اسلاف امت سے کہیں منقول نہیں، انہی نے بدعت ہے (شامی، ص ۴۳، ج ۱)۔

(۷) حق بات کو چھپانا یا اس میں آیت دَاَلْتُمْ لِسُوَالِ الْحَقِّ بِالْبَاطِلِ الْوَسْوَۃُ ثابِت ہو کہ حق بات کو غلط حیل سے ملنا کرنا حرام ہے۔ باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوت یا طبع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہو، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام شریعتی نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازم تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ابو حازم تابعی سلیمان بن عبد الملک کے دربار میں مسند دارمی میں مسند کے ساتھ ذکر ہو کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملک مدینہ طیبہ میں تھے اور جبہ و زقیام کیا تو لوگوں کو دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے

کبھی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا، ہاں ابو حازم ایسے شخص ہیں، سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلوایا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا کہ اسے ابو حازم یہ کیا ہے مرواتی اور بیروانی ہے؟ ابو حازم نے کہا، آپ کے میری کیا ہے مرواتی اور بیروانی دیکھی ہے؟ سلیمان نے کہا کہ مدینہ کے سب سے بڑے لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے، ابو حازم نے کہا، امیر المؤمنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقعہ تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیروانی کیسی!

سلیمان نے جواب سنکر ابن شہاب زہریؒ اور حاضر مجلس کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح منسرایا، آپ نے غلط کی۔

اس کے بعد سلیمان نے زونے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا اے ابو حازم! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو دیران اور دنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے دیرانہ میں جانا پسند نہیں۔

سلیمان نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ منسرایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور بُرے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا، جیسا کوئی بھگتا ہوا غلام بچہ کر آقا کے پاس حاضر کیا جاتا ہے۔

سلیمان یہ سنکر رو پڑے، اور کہنے لگے کاش میں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے، ابو حازم نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کر دو تو تیرے گناہیں سلیمان نے دریافت کیا کہ مسترآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے، اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَنُعِيْمُ قَدَاتِ الْفُجَّارَ لَعْنِ جَحِيْمٍ (۱۳: ۱۳) یعنی بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، عکلاء، شاعر و درخ میں۔

سلیمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بکاروں پر بھگادی ہے، فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱: ۱۹) یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔

سلیمان نے پوچھا اے ابو حازم اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا وہ لوگ جو موت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔ پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض و اجابت کی ادائیگی حرام چیزوں

سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا اس کی دعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ اس سے پہلے احسان جتانے اور نہ مال مٹول کر کے ایذا پہنچانے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رو رعایت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہو؟ فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص اچھا ہے؟ فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بچ دیا، سلیمانؑ نے کہا کہ صحیح منسرایا۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے، سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا، اے امیر المؤمنین تمہارے آباء و اجداد نے بڑے شمشیر و گول پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہو تاکہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو مستحکم کہا کہ ابو حازمؒ تمہارے یہ بہت بری بات کہیں ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بری بات نہیں کہیں، بلکہ وہ بات کہیں جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات تو گورن کرنا کہیں گے چھپائیں گے نہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی قسم ہے (۱۸۴: ۲)۔ یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبی نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔

سلیمانؑ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ منسرایا کہ

پیچھے چھوڑ دو، عروت نہتیار کر دو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کر دو۔ سلیمانؑ نے کہا کہ ابو حازمؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں، منسرایا، خدا کی پناہ سلیمانؑ نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عورت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلاؤ اور جنت میں داخل کر دو، سلیمانؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں، منسرایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے، تو ابو حازمؒ نے یہ دعا کی، یا اللہ اگر سلیمانؑ آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنا دے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہو تو اس کے بال پر کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؑ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں، ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی غلامی و حبس اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؑ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد تنوگنیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خطا کے ساتھ ان کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ تنوگنیاں میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے میں اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں اور نہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا ان کے نزدیک جائز نہیں۔

وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۲۱۲﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور گھٹو نمازیں گھٹنے والوں کے ساتھ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْلُونَ

کیا تم کہتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو

الْكِتَابِ مَا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۲۶۱﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ لِذِكْرِ

کتاب پھر کیوں نہیں سوچتے ہو، اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور

إِنَّمَا لِكِبْرَتِ الْإِلَهِ عَلَى النَّاسِ لِئَلَّا يَذَلُّوا ﴿۲۶۲﴾ الَّذِينَ يَنْظُرُونَ أَنَّهُم

البتہ وہ بھاری ہے مگر اپنی عاجزوں پر جن کو خیال ہے کہ وہ دوبرہ ہونے والے

مُلْقُوا رَبَّهُمْ وَالَّتِي هُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿۲۶۳﴾

میں اپنے رب کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور قائم کرو ستم لوگ نماز کو یعنی مسلمان ہو کر اور روز کوۃ کو اور عاجزی کرو و عاجزی کرنے والوں کے ساتھ علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا کیا غضب ہو کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا ستم آتا بھی نہیں سمجھتے اور مدد لو یعنی اگر تم کو حُجَّتِ مال و حُجَّتِ جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو صبر اور نماز سے یعنی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حُجَّتِ مال و جاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو میں نے کہ اور بیشک وہ نماز دشوار و فریضہ ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ عاشقین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کدہ بیشک ختم والے ہیں اپنے رب سے اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں تو اُمّت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہو گا ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی خوف بھی اور یہی درجہ پر برعل کی روح ہیں۔

معارف و مسائل

ربط آیات | بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلایا کہ ایمان اور عمل صالح

کی طرف دعوت دی ہے، پچھلے تین آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور اصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ ————— اور اگر تم کو حُجَّتِ مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہو کہ صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، صبر سے حُجَّتِ مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی درجہ سے مطلوب محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا جب ان لذات و شہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے، تو پھر مال کی تسرا دانی کی نہ ضرورت ہے گی نہ اُس کی بھنت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حُجَّتِ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حُجَّتِ جاہ و منصب اور تکبر و عشرہ گھٹے گا، اصل مادہ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال و جاہ کی بھنت تھی، جب یہ مادہ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہو گا مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ اس لئے نماز نام ہو کچھ افعال معینہ کا، اور معینہ اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔

غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان بہت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبیعت تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں پیشہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ صبر اور نماز سے کام لو، اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہے خصوصاً نماز کی پابندیوں کا تو اس دشواری کا کیا علاج ہو گا! اس کے لئے ارشاد فرمایا، بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں، اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلا دی گئی۔

اصل یہ ہو کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ انسان کا قلب مگر بیدار خیال میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضائے انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہو کہ اس کے سب اعضا بھی آزاد ہیں، اور منت از سر اس آزادی کے خلاف

ہے، کہ نہ ہنسوں نہ لوؤ نہ کھاؤ نہ پیو، نہ چلو، وغیرہ وغیرہ اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے اور اس کے تلامذہ اعضائے انسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہو کہ سبب اس دشواری اور گرانی کا قلب کی حرکت فکر یہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکون قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکون قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب کے مختلف افکار و خیالات کو براہ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بحال ہو، بلکہ اس کی مذہب سیر یہ ہو کہ نفس انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محدود فریق کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تین خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہو جانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور ان کے دفع ہونے سے حرکت فکر یہ قلب کی منقطع ہو کر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہو کر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر و غرور اور حب چاہ کہ ہو، تاکہ ایمان کے رستہ میں جو حائل ہے وہ دور ہو کر ایمان کا بل ہو جائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطلب ہے۔

اب اس خیال مذکور کی تلقین و تصدیق اس طرح فرمائی: وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب کے، تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، تو اس وقت اس کا حساب و کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت و درہست یعنی امید اور خوف پیدا ہوں گے، ازل تو ہر خیال محدود میں مستغرق ہو جاتا قلب کو نیک کام پر جادوتا ہو، خصوصاً امید و ہرجا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کر دینے کے لئے۔

ایقینوا الصلوٰۃ، صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں، اصطلاح شریع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے، مسترآن کریم میں عموماً نماز کی جتنی توجہ تاکید کی گئی ہے لفظ اقامت کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس کو اقامت صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے، اقامت کے لفظی معنی سپید ہا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادت جو عموماً بار بار یا درخت وغیرہ سپید ہا کرتا ہوتا ہوا رہتا ہے، اگر جانے کا خطرہ کم ہو تو اس لئے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

مسترآن و سنت کی اصطلاح میں اقامت صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کی رعایت کر کے ادا کرنا ہے، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامت

صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار و برکات قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامت صلوٰۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً مسترآن کریم میں ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ - (۲۵: ۳۱) | عین نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر بے کام سے روک دیتی ہے

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جب کہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں اس لئے بہت سے نمازیوں کو بڑا ہیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

أَتُوا الزَّكَاةَ، لفظ زکوٰۃ کے معنی لغت میں دواتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھنا، اصطلاح شریعت میں مال کے اس حصہ کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔

اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورۃ مائدہ میں ذَلَّلْنَا آدَمَ فِيهَا وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ وَبَعَثْنَا فِيهِمْ مُوسَىٰ عَشْرَ نَبِيًّا وَقَالُوا اللَّهُ إِنَّا مَعَكُمْ وَلَقَدْ أَتَيْنَا بِالْبَيِّنَاتِ (۱۱: ۵) الخ سے ثابت ہو کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَأَن لَّعَلَّوْا شَيْئًا كَرِهُوا لَكُمْ - رکوع کے لفظی معنی جھجکے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ عہد پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھجکے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاح شریع میں اس خاص جھجکے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ رکوع کر دو رکوع کرنے والوں کے ساتھ: یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جز، بول کر رکوع نماز مطلقاً گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ فَتَرَأَوْنَ الْفَيْجَ مَسْرُومًا ہر نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں عہدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ نماز پڑھنا نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہو کہ یہود کی نماز میں عہدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے راغبین کے لفظ سے انتہائی محکمہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امت محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اول ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

اجاعت نماز کے احکام | نماز کا حکم اور اس کا مندرجہ ہونا تو لفظ "آفِیْہِوَا الصَّلٰوۃُ" سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ تیغ الشریکین کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہ و تابعین اور فقہائے امت کی جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ اور بعض صحابہ کرام تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا غرض شرعی کے بدن جماعت پڑھی جاتے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے، جو وجوب جماعت کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ چند روایات حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

لَا صَلَٰوةَ لِبَعَادٍ مِّنَ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ (رواہ ابو داؤد)

"یعنی مسجد قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد میں جائز ہے۔"

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز اور اگر تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت | اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لیجا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کروں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اذیل تو ان کو اجازت دیدی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انھوں نے عرض کی کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گھانٹاں اور رخصت نہیں پاتا (آخر جہ ابو داؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَمِيعَ الْيَتَامَا فَلَمْ يَجِبْ قَلَامُ صَلَٰوةٍ لَهُ إِلَّا مَنْ عُلِّيَّ (صحیحہ القرطبی)

"یعنی جو شخص یتیموں کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں پھٹی مگر یہ کہ اس کو کوئی غرض شرعی ہو۔"

ان احادیث کی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابو موسیٰ اشعرنی وغیرہ حضرات صحابہؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا غرض کے جماعت میں حاضر نہ ہوا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکے، اگر مگر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔

یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور امت علماء فقہاء صحابہ و تابعین کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فخر کی طرح سب سے زیادہ مؤکدہ اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر و نہی کو تیغ الشریکین کو دوسری آیات اور روایات کی بناء پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔

اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

فقہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے، (یعنی مسجد) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن حدیثی میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے، کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافقین بین الشقاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو غدر اور بیماری میں بھی دوا آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ بھی بیان فرمادیا کہ وہ سنن ہدی میں سے ہے جس کو فقہاء سنت مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص غرض شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے، اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنت مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحق عتاب ہوگا، اور اگر ترک جماعت کی عادت بنائے تو سخت گنہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد دیران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ سب غماستحیٰ سنن ہیں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے (قرطبی ۲/۸ ج ۱)

جے عمل واعظ کی مذمت | اَتَا مُرُؤْنَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ اس آیت میں خطا اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جا رہی ہے، کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے رہو، اور دین اسلام پر قائم رہو جو علامت ہو اس بات کی کہ علمائے یہود دین اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے، مگر خود انسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کی مذمت ہے جو دوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دوسروں کو خدا سے ڈرائے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب معراج میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قیچیوں سے کترے جا رہے تھے میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا یہ کون ہیں! جبرئیل نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے دنیا دار واعظ ہیں، جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خیر نہ لیتے تھے (ابن کثیر)

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیوں نہ گر بیٹھے گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے، "ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے" (ابن کثیر)

سہا فاسق واعظ نصیحت نہیں کر سکتا! لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ سے ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہو، اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی) چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص مسجداً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کر دوں گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے پاک ہو؟ حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ

چھوڑ دیں (قرطبی) بلکہ حضرت سیدہ جحیم الامتؓ تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے موعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت اَتَا مُرُؤْنَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کا مطلب یہ نہیں ہو کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیے، اور دلوں میں فرق واضح ہے، مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا تو وعظ کیلئے جائز ہو نہ غیر واعظ کیلئے؟ پھر واعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر واعظ کا جرم غیر واعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابل ملامت ہے، کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس پشیمانی نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر واعظ کے اور ان پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکاب گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے، کہ مجھے معلوم نہ تھا، اس کے علاوہ عالم اور واعظ اگر کوئی حبس کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ ایک قسم کا تہنیز اسے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ (تفسیر سیال) باریاں | حُتِّ مال اور حُتِّ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان اورائی کا علاج کی بنیاد نہ ملے گی اور خردی نہ لے گی اور جو معافی اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک عقبنی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں اور جو نسا در پا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حُتِّ مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:

۱۔ کج فہمی اور غلط فہمی پیدا ہوتا ہے جس کا ایک قومی نقصان قویہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے، اگر معاشرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے آئے ہشیا میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت رستائی، مہر و فریب اور دغا بازی کے نت نئے حیلے نکھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

۳۔ ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ

اضافہ کر دیں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنادہ اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔
مہم حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں
کرتا جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پرے معاشرہ کا امن و چین پر باد
کڑھتی ہیں۔

غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال محبت کا نظر آئے گا، اگر اس کے نتیجے میں تکبر و خود غرضی
حق کی پامالی ہو، اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز
خراہیاں جنم لیتی ہیں جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑ دیتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ
تجویز فرمایا: **فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ** اور مدد و نصیر اور نمائندے، یعنی صبر
اختیار کرو، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کرو، اس سے سخت مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال
کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات و خواہشات
کی انفرادی پسند و پسوری چھوڑنے پر ہمت نہ ہو، تو شروع میں اگرچہ شاق گذرے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات
اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمہاری مارت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی،
اس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حسب جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی
ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی
کا تصور رہنے لگے گا، جس سے تکبر و غرور راجحہ جا گھٹ جائے گی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ قرآن سنت میں چاہیے خشوع کی ترغیب، جو اس کے مراد وہ قلبی سکون و
انحصاری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے
نتیجے میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کہیں اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب
متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی
ابواب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثار خشوع کا قصد اظہار کرنا بھی پسند نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ ہر
بھکانے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ بھی نماز کا ارشاد ہے کہ مڑنا پھٹنے، مڑنا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع
نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریعت و ذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے
جو تم پر سنائی ہے اسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فانی کر دو۔

حضرت حسنؑ کا ارشاد ہے کہ: حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو

تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔
خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و نیت سے غاصبین کی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہو اور
مذہب ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو محذور ہے۔ (قرطبی)

فائدہ: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خشوع بھی ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی
بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تفسیراً یکساں معنی ہیں، لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور لہجہ
کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو،
قرآن کریم میں جو خشوع لکھا ہے (آواز میں پست ہو گئیں) اور خشوع کا لفظ بدن کی تواضع اور
انکساری کے لئے ہوتا ہے، مفسرین یکجہ میں ہیں:

فَقُلْتُ أَفَعَبَاكُمْ بِمَا هِيَ خِشْيَةٌ لِّمَنۢ بُدِّلَ مَنۡ دُونِیۡ میں ان کی عمر میں اس کے سامنے جھکتے ہیں۔
نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:
فَقُلْتُ أَفَعَبَاكُمْ بِمَا هِيَ خِشْيَةٌ لِّمَنۢ بُدِّلَ مَنۡ دُونِیۡ اور نماز قائم کر کے یاد کرنے کے لئے:
اور نماز پڑھ کر غفلت یاد کرنے کی ضد ہو، جو نماز میں اللہ جل شانہ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا
فریضہ ادا نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:
وَلَا تَمُنُّ بِقَوْلِكَ وَلَا بِعَهْدِكَ اور تو غفلتوں میں نہ ہو۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نماز تو صرف تمسک اور تواضع ہی ہے، جس کا
ظاہری مطلب یہ ہے کہ جب تمسک اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ تمسک کی نماز اسے بے حیائی اور ہر ایموں سے نہ روک سکے وہ اللہ سے
دور ہی ہوتا ہے، اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور ہر ایموں سے نہیں روکتی، معلوم ہو کہ غفلت
کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے دور ہی ہوتا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا کہ اگر ان کا یہ تقاضا
ہو کہ خشوع نماز کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوری، حسن
بصری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسق
لیکن ائمہ اربعہ اور مجاہد و فقہاء نے خشوع کو شرط صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اسے نماز کی توجہ قرار
دینے کے باوجود صرف اتنا شرط کیا ہے کہ بھیجہ تحریر کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی

نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصہ میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارک صلوٰۃ نہیں کہلائے گا، اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارک صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تصرف اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی حد سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے اولی مرتبہ کو شرط کیا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت بعض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کر لے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مستقرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو انکی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہو جاتے ہیں، اس لئے تکلیف بالایطاف سے کہنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتدا و صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی امام غزالیؒ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود بالکل بے فائدہ نہیں ہیں اللہ سے یہی امید ہو کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھو اور لاہمی بالکل تارک صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں کیونکہ بہر حال اُس نے اسے فرض کا اقام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فانی بھی کیا کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ عذر ہے کہ اس کا نام تاسر مانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے پتہ چلتا ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بُری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتنا اور تحقیر آمیز لہجہ میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معاملہ ہم درجہ کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی امید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مستور رہبر کو بخشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا النِّعَمَ الَّتِيْ اٰتٰىكُمْ وَفَضَّلَكُمْ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعَالَمِيْنَ ۝ وَاَتَقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُشْكِلُ مِنْهَا

تمام عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ کما نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی

شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝

طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

خلاصہ تفسیر اولاد یعقوب! (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو، جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس بات کو یاد کرو،

کہ میں نے تم کو (خاص خاص برائوں میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، اور ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تم کو ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی، مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر۔

فاصلہ کا :- اس آیت میں خطاب چوتھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے، اور عموماً ایسا ہوتا ہے، کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جا سکتا ہے۔

اور دوسرے ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہو، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے، جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جا سکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرفدار کی جمل کے گی۔

فاصلہ :- آیت میں جس یوم کا ذکر ہوا اس سے قیامت کا دن مراد ہو، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بیاں کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کر کے بچا لائے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدوین ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے نوادر آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور طرفداری کی صورت یہ ہوگی کہ کوئی زوردار حمایت کر کے زیر دستی نکال لائے۔

غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدوین ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اِلٰی فِرْعَوْنَ يَسُوْهُمُوْكُمْ سُوْعَ الْعَذَابِ اِذْ يَخْرُجُوْنَ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رانی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کہتے تھے تم کو برا عذاب دینے کرتے تھے

اَبْنَاءُكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی

عَظِيمٌ ۵۱

طوت سے بڑی

خلاصہ تفسیر | اور چون خاص برتاؤں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ اور وہ زمانہ یاد کرو جب کہ رہائی دی ہم نے تم لوگوں کے آباء و اجداد کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، اگلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (ذکر) کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہوجائیں) اور اس واقعہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔

فائدہ :- کسی نے فرعون سے پیشینگوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کچھ تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے مانا گری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے اور یا رہائی دینا مراد ہے چونکہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان سنرائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب بھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھرنے کا اور ہم نے تم کو اور ڈوب دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ۵۱ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنایا

الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۵۲

بجھڑا موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصہ تفسیر | اور وہ زمانہ یاد کرو جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریا سے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعاقبین فرعون

کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ :- یہ نعمت اس وقت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو بھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پہچے سے فرعون بھی مع لشکر آپہنچا حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو بار ہو گئے، فرعون کے پیچھے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب یہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور وہ زمانہ یاد کرو، جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے رتوریت دینے کا ایک مدت گزرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر چالیس رات کا زمانہ ہو گیا تھا، پھر تم لوگوں نے دہشت کے لئے تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے اس تجویز میں صریح ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہو گئے تھے۔

فائدہ :- یہ نعمت اس وقت ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض مصر میں واپس آکر پہنچے گئے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر پھر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کو وہ طور پر آکر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور تورات آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد انظار فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا راحہ راجو غلو سے مدد کی تجویز سے پیدا ہو جاتا ہے، پسند ہوا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ راحہ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے، اور وہاں ایک شخص سامری نامی تھا اس نے چاندی یا سونے کا ایک بچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مثل جو اس نے جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس بچھڑے میں جان چڑھ گئی، اور جب بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۵۲

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر | پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوتی

پچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ ۱۰۔ اس توبہ کا بیان کنگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نمونہ اللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ طلب ہو کہ یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گزاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۶﴾

اور جب وہی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناقص سے جدا کرنا دیا تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی اور فیصلہ کی چسیسز اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ ۱۱۔ فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شریعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں (کیونکہ) شرع سے تمام اعتقادی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے بچے، جھوٹے دعویٰ کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہہ دیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصلہ ہونے کی صفت بھی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بَاتِعَاذِكُمُ الْعَجَلُ فَتَوْبُوا إِلَىٰ بَارِعِكُمْ فَأَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ

بہمیشہ بنا کر سو اب توبہ کر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِعِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ

یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۷﴾

معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری

قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس کو سالہ پرستی کی جوڑے سے سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی (جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنہوں نے

گوسالہ پرستی کی) قتل کرو یہ (علمہ رآد) تمہارے لئے بہتر ہوگا، تمہارے خالق کے نزدیک، پھر اس علمہ رآد کرنے سے حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ ۱۲۔ یہ اس طریق کا بیان ہے جو ان کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا بادلہ توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا یا شہادۃ پر رجم کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں مورد رحمت و عنایت ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ بَهْرَةً فَأَخَذْنَاكُم

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین مذکر ہی تجھے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آیا

الصُّعْفَةَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۸﴾

تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر اور دو زمانہ یاد کرو جب تم لوگوں نے دیوں کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ

طور پر دیکھ لیں، سو (اس گستاخی پر) تم پر کوکب بجلی کی آپڑی، اور تم اس بجلی کا آنا، آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ ۱۳۔ اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لا کر

پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ

ہماری کتاب ہے، توبہ بے شک ہم کو یقین آ جائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذن الہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو

یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے مشر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے

ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچے پر اللہ تعالیٰ کا کلام ان لوگوں نے خود سنا، تو اس وقت اور رنگ

لانے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو

بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس

گستاخی پر ان پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہو گئے، ربلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے،

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُشْكِرُونَ ﴿۵۹﴾

پھر اٹھا کر آ کیا ہم نے تم کو مر گئے پچھے تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کراٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائل کا :- موت کے لفظ سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پہل سے مر گئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل میں ہی برگران رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لیا کر کس تدبیر کے ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، پھر اس جنت سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَلَقَدْ نَاغَلَيْكُمْ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور آٹما خم پر من اور سلوی

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی

يُظْلِمُونَ ﴿۵۰﴾

نقصان کرتے رہے

خلاصہ تفسیر

اور سایہ لگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان قیہ میں) اور (خزائے غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بلیریں اور تم کو اجازت دی کہ کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں، اور معروہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائل کا :- دونوں قصے دادی قیہ میں واقع ہوئے، دادی قیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اہل وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملک شام میں عاتق نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عاتق سے چا کر اور اپنی اہل جگہ کو اُن کے قبضہ سے چھڑا لو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مقرر ہوئے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عاتق کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو رحمت بار بیٹھے اور چار سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشان پھرتے رہے، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ میدان کچھ بہت بڑا قہر نہ تھا، بلکہ مقرر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل

کا قہر تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اترنے صحیح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشان اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو دادی قیہ کہا جاتا ہے، قیہ کے معنی میں سرگرداں اور پریشان کہتے ہیں، دادی قیہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور صبح کا تقاضا ہوا تو من و سلوی نازل فرما دیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز پر بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اس کو من کہا گیا ہے، اور بلیریں اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھائی نہ تھیں، یہ اُن کو کپڑے لیتے، اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو سلوی کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بلیریں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہو، لہذا اس خلیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب کے مترادف تھیں، اُن کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاشی مارنے کا حکم دیا گیا اس پتھر سے چٹے پھوٹ پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلہ کے درمیان قائم فرما دی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کر دی کہ اُن کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر مستطبی)

اور اُن لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں مگر ان لوگوں نے حرص کے ماسے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت مٹنا شروع ہو گیا، اسی کی فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَاكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاؤ پھر اس میں جہاں چاہو

رَغَدًا وَاَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ

راغمت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ بخدا توبہ کر دے تمہارے گناہوں

وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾

اور زیادہ بھی دیں گے نیک والوں کو

خلاصہ تفسیر | اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جس جگہ تم رغبت کر دے بھگنی سے، اور یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو دروازہ میں داخل ہونا رعا جزئی سے (جھکے جھکے اور زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے) توبہ ہے ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں تو سب کی، اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ | بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فقرہ بھی زمانہ وادی تیبہ کا ہے، کہ جب من و سلوی کھاتے کھاتے اُکٹا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی جیسا آگے کی چوتھی آیت میں آ رہا ہے، تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا، کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخير ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک فقرہ کے اجزاء میں ہر جزو کا نتیجہ جدا ہوا، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جزو مقدم کو مؤخر اور جزو مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے، اور نہ کوئی اشکال۔ دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر کے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیبہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یروشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔

قول ازل کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب جو من و سلوی چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہو گا کہ یہ درخواست تھی گوستاخی، لیکن خیر اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو محافط کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

قَبَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَىٰ

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلافت اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا، ہم نے

الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

خلاصہ تفسیر | سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور طرح خلافت تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سادی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ | یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلافت یہ تھا کہ جُطَّةً یعنی توبہ کی حسبِ گواراہ تمخرج جُطَّةً فی شَیْءٍ مِّنْ دِیْنِکُمْ یعنی غلہ درمیان جو کہ تمنا شروع کیا، وہ آفت سادی طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکمرانوں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے، بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے۔ (قرطبی)

معارف و مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل | اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں جُطَّةً کا حکم شریعی یعنی توبہ توبہ کہتے ہوئے داخل ہوں، انھوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدل کر جُطَّةً کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل الٹ گئے، جُطَّةً کے معنی توبہ یعنی من ہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور جُطَّةً کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمہ مامور بہا ہے کوئی تعلق نہیں الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ مسترآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امر الہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا ستمناز یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قسطلانی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی تصریح الفاظ بھی مقصود اور اداء عبارت کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سبحانک ایلہم، الفحات، دعائے قنوت، یا تسبیحات رکوع و سجود جن الفاظ سے منقول ہیں انہیں الفاظ میں اور اگرنا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگر جہ من وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز نہیں، اسی طرح تمام مسترآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوت قرآن سے جو احکام

متعلق ہیں وہ صرف اپنی الفاظ کے ساتھ ہیں، جو قرآن کریم کے نازل ہوتے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر کے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاح شریعت میں تلاوت قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں بھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعہ کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں تَبَدَّلَ الدِّينَ لَدُنَّكَ مَوَاقِفُ الْأَعْمَارِ الَّذِي قَبِلَ لَهُمْ مِنَ الْفَاظِ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو توبہ کے لئے جو الفاظ حقیقہ کے بتلائے گئے تھے یہ الفاظ بھی ماحول تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کر دی کہ معنی ہی اُلٹ گئے، اس لئے عذاب آسمانی کے مستحق ہو گئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصور نہیں ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جوہر محمدین اور نقباء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے، مستشرقین نے امام مالک، شافعی، امام اعظم ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر مشرطیہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سے ہیں اسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرین، قاسم بن محمد وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا قائل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اس غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کر دے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے، مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دعا پڑھے، اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لِّيْ اَمْرًا نَّبِيًّا اَنْزَلْتَ وَبَيِّنْ لِّيْ اَمْرًا نَّبِيًّا اَنْزَلْتَ، اس شخص نے تَبَيَّنْتَ کی جگہ وَتَبَيَّنْتَ پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ تَبَيَّنْتَ پڑھا کرے جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نَهَى اللّٰهُ اَمْرًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ | فَيَلْعَنُهَا كَمَا يَلْعَنُهَا
فَيَنْهَى اللّٰهُ عَنْهَا | فَيَلْعَنُهَا كَمَا يَلْعَنُهَا
فَيَنْهَى اللّٰهُ عَنْهَا | فَيَلْعَنُهَا كَمَا يَلْعَنُهَا

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سننا تھا اپنی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔

مگر جوہر محمدین اور نقباء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنئے ہیں، اپنے قصد سے ان میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں ہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث بلخبا کما سمعہما کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سننا ہو وہی بعینہ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی مسرت نہ آئے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبی نے اس کی تائید میں سرمایا کہ خود ہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ رسول اللہ کے بجائے نبیؐ ہی پڑھے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ نبیؐ میں صفت مدح بہ نسبت رسولؐ کے زیادہ ہے، کیونکہ رسولؐ کا لفظ توقیف کے معنی میں دوسروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ نبیؐ کے کہ وہ خاص اسی منصب کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ دعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبی، اسی کو حامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارجحہ ماثورہ بھی اسی قسم ازل میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَإِذْ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ

اور جب ہانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر

فَإِنْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَ نَاقَةً فَلَمَّا ظَنَّ أَنَا سِمْسَرَ بِهِمْ

سو پھر نکلتے اس سے بارہ چٹے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝۱

کھاؤ اور پو الله کی روزی اور نہ پھر د ملک میں فساد بچائے ۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارش پھوٹ نکلی، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہا خاندان تھے، چنانچہ ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو، کھاؤ اور (پینے کو) پو الله تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (دفعہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا :- یہ قصہ بھی وادی تہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہا چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوکی اور پینے سے مراد پانی تھا، اور انسرائی اور ترک احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصد بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہو، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعد از قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ گوبے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق چل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ بعض سلی نظر والوں کے لئے ہے، وہ نہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتھکڑی دعا انسرائی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لٹھی مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتھکڑی کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتفاء کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد یہ کہ ہتھکڑی کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا کبھی خاص نماز استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز استسقاء کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتفاء کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عیوبیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرائیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیوں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ بہار و اسطر

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَآئِهَا وَفُومِهَا

اچھے درجہ کے کھانے کے نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلڑی اور گیہوں

وَعَدَآئِهَا وَبَصِلَتِ لَنَا قَالَ أَسْتَبْدِلُ الْذِي هُوَ أَذْيَنُ بِالْذِي

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ أَمْ هَٰذَا مَضَىٰ قَانَ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمُوهُ وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اُترہ کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكِنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضَ مِنْ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

اور محتاجی اور پھر اللہ کا غضب لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط

ہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ

کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھر د ملک میں فساد مچانے۔

خلاصہ تفسیر اور وہ زمانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے

اس عصا کو فلان پتھر پر مارو اس سے پانی نکل آوے گا، پس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر نہیں) فوراً اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ ہر گھرانے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو، کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (دفعہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائل کا :- یہ قصہ بھی وادی تیبہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چٹے نکل پڑے، اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے انسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چٹے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلوکی اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور انسرائیلی اور ترکب احکام کو تنہا و فساد سے تعبیر فرمایا۔

قاصص بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہو، جب بعض پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بیداد قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ احسن اہل زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔

ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظریہ بعض سلفی فکر والوں کے لئے ہے، وہ نہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو ہمیں کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو اللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہتسقا کی دعا انسرائیلی،

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا، کہ پتھر پر لاشیں مارنے سے چٹے ابل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ ہتسقا کی اصل دعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد یہ کہ ہتسقا کی اصل پانی کے لئے دعا کرنا ہے، یہ دعا کبھی خاص نماز ہتسقا کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز ہتسقا کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا ہی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دعا پر انتقا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس کی روایت منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ ہتسقا خواہ بصورت نماز کیا جائے، یا صرف دعا کی صورت میں اس کے مؤثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی انسرائیلیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دعا کے انتظار کا کس کو حق نہیں اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول انسرائیلیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ بہار و اسطر

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا

اچھے درجہ کے کھانے کے نکال دے ہماری واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور گلڑی اور گیہوں

وَعَدَّيْنِهَا وَبَصِلَتٍ لَكُنَّ الَّذِي هُوَ آذِنِي بِالَّذِي

اور مسور اور پیاز، کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو

هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْهُمَا وَاصْرَافًا فَانْ كُمْ مَّا سَأَلْتُمْ وَصُرْبَتْ عَلَيْهِمُ

بہتر ہے، اترہ کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو اور ڈالی گئی اُن پر ذلت

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكِنَةُ وَبَاءَ وَبَغَضٍ مِنَ اللَّهِ لَوْلَا ذَلِكَ بَانَتْ لَهُمْ

اور محتاجی اور بھڑے اللہ کا غصہ لے کر یہ اس لئے ہوا کہ

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط

جہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق،

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿۱۱﴾

یہ اس لئے کہ انہیں مان تھے، اور حد پر نہ دہتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اسے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے، (یعنی من و سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسا چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگلا کرتی ہیں، ساگ (جوا) گلوئی (ہوئی) (گیہوں) (جوا) (مسور) (ہوئی) (پیاز) (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو، (دنی) درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے، (اچھا اگر نہیں مانتے تو کسی شہر میں (جا کر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی طرح) (جم غنی) ان پر ذلت رکھ دو دوسروں کی (جگہ) میں قدر نہ رہی، اور پستی رکھ خود ان کی طبائع میں اولوہی سبزی نہ رہی، اور سخت ہو گئے غضب (آہی کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ جو جاتے تھے احکامِ الہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) (ناحق) (ہوتا تھا) اور (زیر) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرۃ اطاعت سے بھل بھل جاتے تھے۔

فائدہ:۔ یہ قصہ بھی دادی تیرہ مکا ہے، من و سلویٰ سے انکار ان نیکاریوں اور غفلتوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخل حدود میں کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بڑا جوتو کھاؤ کھاؤ۔

اور منجملہ ذلت و مسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنت قرب قیامت تک کیلئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لیڈروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور و شور و جہال یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہو جائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلا دی گئی تھی، کہ اگر بے حکمی کر دے گے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے، جیسا کہ سورۃ اعراف کی آیت: **وَاِذْ كَاذَّبْنَا وَلِيَّائِنَا لِيَبْغُوْنَ عَلَيْنَا مِنْ دُونِ الْيَقِيْنَةِ مِمَّنْ قَبِضُوا عَلَيْهِمْ صُلُوًّا الْعَذَابِ** (۱۱۰) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیل حکومت کی حیثیت بھی امریکہ اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور یہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن غنا و اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر اہدی ذلت کا مطلب اور اسرائیل آیات مذکورہ میں یہود کی سزا و نیا میں دائمی ذلت و مسکنت کی موجودہ حکومت سے مشبہ اور اس کا جواب اور دنیا و آخرت میں غضب الہی کو بیان کیا گیا ہے۔

ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیر کے الفاظ میں یہ ہے کہ لَا يَزَالُ الْكَوْنُ مُسْتَدْلِينَ مِنْ وَجْهِ هَذَا مُسْتَدْلِينَ لَهُمْ وَضَرْبٌ عَلَيْهِ الصَّغَارُ، یعنی وہ کہتے ہی مالدار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی رہے جائیں گے، جن کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور ان کی غلامی کی علامتیں لگائے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم اهل القبالات یعنی الجزیہ، مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں، خود ان کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورۃ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:

حُيِّبَتْ عَلَيْهِمُ النَّارُ النَّارُ اَلَيْسَ
تُعَذِّبُوهُمُ اَلَا بِتَحْتِلٍ يَّتَنَزَّلُ
وَقَدْ نَسَّيْتُمْ - (۱۱۲، ۱۱۳)

تجاویز گئی ان پر بے قدری جہاں کہیں جائیگے
مگر ان ایک تو ایسے ذریعہ سے جو ان کی طرف
سے ہوا اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف

سے ہوا

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دیدیا ہو، جیسے نالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گذار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مامون رہیں گے، اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا حبزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں **وَقَدْ نَسَّيْتُمْ** فرمایا ہے، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کی پشت پناہی میں آجائیں تو مامون رہ سکتے ہیں، پھر یہ ہشتاد و چل من اللہ اور جبل من الناس کا اگر بقول کثافت ہستنا متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہودی ہمیشہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہیں گے، بجز ان دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے جو زمین وغیرہ اس ذلت و خواری سے بھل جائیں یا معاہدہ صلح کے ذریعہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے ان کے

ہمارے ذلت و خواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریریں استثنائے متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثنائے منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل و خواری رہیں، مگر قانونِ آبی کی دست میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت و خواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورہ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت سے پوری ہو گئی، اور اس سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آجکل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بناء پر بہت مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ تران کے قلعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت بھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی، جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں ہے بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھائی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یوروپین طاقتوں نے اسلامی ہلاک کر دیا کرتے تھے، لہٰذا ان کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی ان کی نظروں میں ہیں، ان کے شرماں بردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد بخوبی قی الثانی کے ہمارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود میں ان کی شریعت، ان کی تہذیب سب سے پہلی ہو، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر ان کا تسلط کیسے طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دور منزل کے بادجوان کی سلطنتیں بت پرستوں کی سلطنتیں، لاندہوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیل ہوئی ہیں ان کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکہ، برطانیہ کے زیر سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے!

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ

جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے جو ان کا ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ لَا يَخَوْفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خلاصہ تفسیر

اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر غدر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطہ لکھ کر دیا کہ یہ حقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابین ان سب میں جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانونِ شریعت) ایسوں کے لئے ان کا حقِ خدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

فائدہ: قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد و اعمال میں خستیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اگلاطاعت محمدی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہو، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا حقِ نجات اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلامِ پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اسکی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا امورِ رعایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے سنا، تو اصل میں مخالفت کو ہے، لیکن اس میں نہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر رعایت ہو سو اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہمداری رعایت کا، سو اگر مخالفت بھی خستیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالفت کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طُحُّدًا

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو کہ بکڑو جو

مَا أَتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ ۚ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۳﴾

کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

خلاصہ تفسیر اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول دستار لیا کہ قرآن پر عمل کریں گے اور اس قول دستار لینے کے لئے ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر

(عمازت میں) معلق کر دیا، اور اس وقت کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی قرآن) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ۔۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لا کر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو ازل تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہے تو میں مانیں گے، (جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے) غرض وہ شتر آری جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انہوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ شتر مادیات کا تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا ہونا ہوئے معاف ہے، تو کچھ توجہی شرارت کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ ازل اپنی خوشی سے ایمان داسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام محکومتوں میں بھی عساکر مخالفت اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، ان کے لئے ہر حکومت میں دوزی راستے ہوتے ہیں یا اٹھا قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْنَا مَن بَعْدَ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی ہرمانی

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۶۴﴾

تو ضرور تم تباہ ہو گے

خلاصہ تفسیر پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو اس جہد شکنی کا مقصد توبہ تھا کہ ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، مگر ہماری عنایت و رحمت عامہ ہو کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک ہمت

بے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ و بال اعمال میں مستحکم ہو گے) فائدہ: حق تعالیٰ کی رحمت عامہ دنیا میں مومن کا فرسب پر ہے، جس کا اثر عاقبت اور دوسری راحت ہے، رحمت خاصہ کا طور آخرت میں ہوگا جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی جہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی جہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔

اور چونکہ اب از روئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے۔ اس معنوں کی تائید کے لئے گزشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ

اور تم غیب جان چکے ہو جنہوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان

كُتُوبًا قِرْدَةً خَاسِرِينَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَآبِلِنَ يَدَيْهَا وَمَا

سے کہ ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کیلئے جو وہاں

خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۶۶﴾

تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت دین والوں کی واسطے

خلاصہ تفسیر اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (حدیث شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے متعلق تھا کہ اس روز

بھل کا شکار ہو کر پی اسوہم نے اُن کو دیکھ کر قریٰ نگاہی سے مسخ کرنے کے لئے ایک دھوکہ کرتا ہندو ذلیل بن جاؤ چنانچہ وہ ہندوؤں کے ظالم ہیں مسخ ہو گئے ہیں یہ سب نے اس کو ایک (روافد) تحریرت و انکیزہ بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو بعد کے زمانے میں آئے یہ سب اور دیندار اور رافد کو موجب محبت و ہتایا، خدا سے ان لوگوں کے لئے۔

فَالَّذِينَ - یہ واقعہ بھی اس سرسراہیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہندو کا دین علم اور عبادت کے لئے مقرر تھا اور بھل کا شکار بھی اس روز منع تھا یہ لوگ ہندو کے کسانے بنا کر تھے اور بھل کے شوقین تھے، اُس قسم کو زمانا اور شکار کیا، اس ہفتہ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا، جن دن کے بعد وہ سب مر گئے۔ اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے درجہ سب سے لوگ تھے، وہ مابین داؤد تا مسلمان، قرآن فرماؤں کے لئے نوید و انوار مسلمانوں کے قہر کرنے والا تھا، اس لئے اس کو نکال کر فرمایا، اور ہندو مابین داؤد کو یہ واقعہ فرماؤں اور یہی پرقائم رکھنے والا تھا اس کو توبہ بخلا فرمایا۔

معارف و مسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا جہل ہے اس ایت میں یہودیوں کے جس اعتقاد میں حدود سے تجاوز کا کر اصل عظیم شریعی جہل ہے چنانچہ حرام ہے کر کے اس کو سبب عذاب بتلایا گیا ہے، اور ایسے ثابت ہو کر وہ صاف طور پر عظیم شرعی کی غلط و ردی دھن، بلکہ ایسے جہلے تھے جسے عظیم شرعی کا ابطال ملکہ آتا تھا، مثلاً ہندو کے وہ بھل کی قوم میں ایک دور کا ہندو لاکھ روپیہ چھوڑ دیا، اور یہ دور زمین پر کسی چیز سے ہندو دی، پھر اقرار کرے روز اس کو پکڑ کر کھائے، تو یہ ایک ایسا جہل ہے جس میں عظیم شرعی کا ابطال بلکہ کچھ سم کا چھڑا، ہوا، اس نے ایسا سیکر کرے والوں کو بڑا سرکش یا مسلمان فراہم کر اُن پر عذاب کیا۔

لہذا اس سے اُن بغض جنوں کی حرمت ثابت نہیں ہوئی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے جلائے ہیں مثلاً ایک سیر عمرہ کی وجہ سے وہ سیر عذاب کی پور خردنا سورہ میں آئی ہو مگر اس سے بچنے کا ایک حیدر خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ میں کا تیار اور حاجت مذکور نیست کے ذریعہ خیر و فرحت کرو، مثلاً دو سیر عذاب کی وجہ سے وہ دو روز میں فرحت کرو، اس پر ان روزوں میں سے ایک سیر عمرہ کی پور خردنا، تو یہاں تک عظیم شرعی کی تعمیل مقصود ہوا ابطال لا مقصود ہو، واقع ہے اس طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کا ایسا

ایسی ہی تیسری بتلائی ہیں اُن کو یہودیوں کے جیلوں کی طرح گناہ اور جہنم کا خط ہے۔ واقعہ مسخ سویت یہودی تفسیر شریعی میں ہے کہ یہودی نے ازل ازل اس ملت کے چلنے کے چھاپا کچھیں، مگر یہودی نے ہرے سام طور پر شکار کھینچے تھے، قرآن میں دو ہاتھیں ہو گئیں، ایک ہاتھ عطا، وصلہا، کی کئی باتوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یا اذکار کے تو ان سے ہر روزانہ تعلقات قطع کر کے باطل نگاہ ہو گئے، اور بس کے دوسرے کرنے، ایک میں یہ ناشروای نوک دہ گئے، دوسرے میں عطا، وصلہا، ہے، ایک روز ان کو یہ محسوس ہوا کہ جس حسد میں یہ ناریاں لوگ تھے تھی سوہا کل سبباً، ہر روز ان کا گرد دیکھا تو سب کے سب ہندوؤں کی صورت میں مسخ ہو گئے تھے، اور آخر قمار کے لئے فرمایا کہ ان کے ہر ان ہندو بنا دیے گئے تھے اور پڑے خزانہ کی شکل میں منجیل کر دیے گئے تھے، اور مسخ ہندو ہندو اپنے مشیت اور اور قتل والے انسانوں کو پہچانتے تھے، ان کے فریب آ کر دیتے تھے۔

مَسْخُورٌ کی تفسیر اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پرست، جہنم میں عذاب ہندو میں مسخ مسخ مسخ مسخ مسخ ہے، مگر بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے ہندوؤں اور خسرینوں کے بارے میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب بھی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو ان کی نسل ختم ہوتی ہے، بلکہ چند روز میں جلا کر کر ختم ہو جاتے ہیں، اور پھر فرمایا کہ ہندو رخسار پر دنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے اور آج بھی ہیں، مگر مسخ شدہ ہندو دی اور خسرینوں سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔

اس موقع پر بعض مفسرین نے بھی بھکاری کے حوالہ سے ہندوؤں میں زمانہ کی مزا میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ بخاری کے صحیح نسخوں میں موجود ہے نہ دو دفعہ صحیح بڑا نسخہ نے اس جگہ اس کی تعمیل بیان فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَرُوا بَنِي إِسْرَءِيلَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرمانا کہ تم کو ترک کر دو ایک کاٹنے **قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مِنْ آلِ عِصْرٍ وَآلِ عِصْرٍ بِاللَّهِ أَنْ كُنَّا مِنَ الْجَاهِلِينَ** وہ بولے کیا قوم سے ہستی کرنا ہے کہا پتا خدا کی کہ ہوں ہیں جاہلوں میں۔

خلاصہ تفسیر اور روزانہ یاد کرو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کو ترک کر دو ایک کاٹنے کے کہ وہ اگر اس کے قائل کا پتہ لگا چاہتے ہو

فانما ایک بیل نوح کر رہا ہے کہ اس کو ایک ہم سفر ہونے میں کہاں کا قافل کی حقین کہاں جا کر اور کیا کرنا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ لو کہ تم ہر ایک میں اپنی حالت والوں کا ساتھ کرنا دیکھو کہ تم خود کسی میں سے کون سے گھولے

خالد، یہ ہے کہ اس طرح ہر ایک میں ایک نوح ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مرقاة شرع مشکوٰۃ میں یہ بھی ہے کہ کس شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی وہ خواست کی تھی، مگر اس نے اس کا راز اور اس شخص نے اس کو قتل کر دیا، قافل اپنے ساتھ اس کا ہتھ دنگا تھا اور وہ سارے قافل کا ہی قول تھا کہ یہ کس کی رقت تک تھوڑی تھی، اس کے متعلق کوئی شرع کا کوئی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقتول کی قومیت سے قبل کا ہو۔ غرض یہی کہ اس بیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قافل کا ہتھ چلے، آپ نے حکم فرمایا کہ ایک بیل نوح کرنے کا حکم فرمایا، انھوں نے حسب عادت اور اپنی جبلت کے مطابق اس میں رہیں گا ان شرع نہیں۔

آیات آئندہ میں اسی کی تفصیل ہے۔

قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَ يَسْتَنْ لَنَا مَا مَحْيَا قَالِ اِنَّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا

ہم نے کو دیا، کہ ہم نے واسطے اپنے رب سے کہ جو کہہ کر دیا ہے کہ یہی کہہ کر دیا ہے کہ وہ ایک بقرہ کا قاریض ولا یسئل عوان بین ذلک فاعلموا ما توأمرون

قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَ يَسْتَنْ لَنَا مَا لَوْ نُهَاد قَالِ اِنَّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا

ہم نے کو دیا کہ ہم نے واسطے اپنے رب سے کہ جو کہہ کر دیا ہے کہ یہی کہہ کر دیا ہے کہ وہ ایک بقرہ کا قاریض ولا یسئل عوان بین ذلک فاعلموا ما توأمرون

قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَ يَسْتَنْ لَنَا مَا لَوْ نُهَاد قَالِ اِنَّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا

قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَ يَسْتَنْ لَنَا مَا لَوْ نُهَاد قَالِ اِنَّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا

قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَ يَسْتَنْ لَنَا مَا لَوْ نُهَاد قَالِ اِنَّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا

قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا بَكَ يَسْتَنْ لَنَا مَا لَوْ نُهَاد قَالِ اِنَّكَ لَيَقُولُنَّ اِنَّمَا

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

اَلَا تَرَىٰ دَلًا تَتَّبِعِي الْحَزَنَةَ مَسَلَمَةً لَا فِئَةٍ فِيْهَا قَالُوا لَئِنْ

وَبَرِّكُمْ رَأَيْتُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٥٠﴾

اور دکھاتا ہے کہ جو اپنی قدرت کے غور سے تیار ہو کر

اور دودھ زائعا لہ کر دیا۔ اس پر کون دہی سے کسی ایک آدمی کا طریق کر دیا، پھر
وہ اپنی برصت کے لئے، ایک دوسرے سے پڑاتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کو مسخر فرما کر
میں سے کہہ کر مسخر ہو گیا، کئی کھانا پیتے تھے اس لئے زور دیا کہ ہوا، ہم نے
لی کہ کھانا کھانے اور لہو دھونے کوئی سے جھوڑا اور پانچ پانچ جھوڑے سے دہا
لی کہ کھانا کھانے کوئی سے کھانے سے استغناء اور اللہ تعالیٰ کے طریق فرما
تھیں رعایا میں ان کو دل کو زندہ کر دیا گئے، اور اللہ تعالیٰ اپنے اللہ تعالیٰ (دست)
کو تو دل پر کہ مخلص سے کام لیا کہ اور یاد دلیر سے دوسری دلیر کے انکار سے

۔ جب اس مرد کے ساتھ معاملہ کیا گیا تو، زندہ ہو گیا، اس نے خاں کا نام لیا!

وقت مقبول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پذیرائی دینے پر جوئے کا اور نہ صرف مقبول کے پیانی سے بغیر شرعی شہادت کے کہی پر نہیں ہوا۔

کہہ کر باہمی دوست نہیں کوئی انصاف کو فروغ دے گا کہ جس کی رسی میں قدرت ہے
 وہ میرے کام آئے گا۔ یہاں تک کہ میرا جسم اس کا کھانا بن جائے۔ میری رسی میں
 اصل ضرورت اور میری کمرے سے تو میرا نہیں، بلکہ صحت اور راحت کے لئے ہے۔
 قدرت انصاف کا عمل نہیں کرتی، نہ اس کا یہ منہ ہے کہ جس کو وہ
 کس کو دے دے ضروری ہے کہ وہ کس قدر کھتے جا رہی ہو۔ اس لئے اس کے
 فیضان کرنے کے بجائے ہر چیز پر تسلیم و سکوت کا ہے۔

لَوْ بَكُم مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَعَمَّ الْخَبَاءُ ۖ أَوْ أَشَدُّ

خفت ہو گئے اسی سب کے بعد سورہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی

١٠٠ من الجحاة لما تفتح منتهى الأسفلط واد.

۱. میں تو ایسے بھی ہیں جی سے چامی برقی ہیں چہرے اور ان میں

مِنَ الْمَآئِ يَشْفَوْنَ فَنَجِّ بِرُ مِثْلِهِ الْمَاءُ دَوَانِ مِنْهَا لِمَا هُطِّطُ مِنْ

یہ بھی میں جو میٹ جاتے ہیں اور انھیں کران سے پالنا اور ان میں ایسے بھی اس جو گر ٹرتے ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اللہ کے در سے اور اس کے لیے جبر نہیں نصاب کے کاموں سے ۔

مگر سترہ القلیات سے متاخر ہوئے تو حکامات کے طر پر شارب کو کھانے کے
 ایسے واقعات بعد چاہئے خاکہ میں دروں کے دل و اکل نرم اور جن قتالی کے
 ملک سے پھر جاتے ہیں، مختص سے دل پر بھی سخت سیبہ تو دل کو کٹا چاہئے کہ ان کی مثال پھر
 کسی سے ہے اور یوں کنگرہ (ہے) غنم میں آن سے (دھی، دیارہ، دھڑ) اور زیادہ سخت سے رخ سے کہا
 جاتا ہے کہ پچھتے پھر کر لے پھر میں سے در پڑی بڑی، تھریس پھرت کر مٹی ہی، اور ابی پھر میں، پھر
 میں ہے کہ جو شرب ہو جائے ہیں پھر میں سے اگر زیادہ نہیں تو سترہ اس کی بھی آگ ہے، اور ابی پھر
 میں لیئے ایسے ہی جو خور قتالی کے خوف سے ارم سے کیے (راکھ) آتے ہیں، اور مختص سے کلوب
 میں کوئی جسم کا نری نہیں ہوتا اور اس قتات سے در و حال پھر در جوتے ہیں (جن قس قتالی
 جماعہ دان) اور امل سے بے خبر نہیں ہیں (سب ملکر جوتے) راکھ کنگرہ میں گئے۔

خاتمہ۔ اس خبیث چکر کے مینا اڑت ہیوں کے لئے ہیں، ادرائے ان سے زیادہ باقی نکلا۔
 تو کون کون طعنا، ان دوسری تو کسی کو شہ نہیں پڑتا، جس کی صورت میں خدا کے خوف سے شکر کا
 نیچے آ کر تا، اس میں مکن ہے کسی کو شہ ہو کیونکہ چکر کو عقل اور حس نہیں، نہ سو یہاں یہ
 کو سہا پائے کہ خوف کے لئے عقل کی ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات اور عقل میں خوف کا
 شاہد ہو کہ ہوتا ہے، البتہ جس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن حیوانات میں اسی میں ہونے کے لئے
 ادرائے نہیں کیوں کہیں حیات پر موت ہے، اور بہت محسوس کر ان میں ایسی لطیف حیات چھو
 کار کو درک نہ ہوتا ہو، جیسا جوہر و خارج کے احساس کا بہت سے عقلا کو درک نہیں ہوتا،
 وہ عقل و ادراک سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو راولپنڈی میں یہ ظاہر تعجب فشرہ کن کی ولایت اور وقت
 میں طے نہ ہو کہیں نہیں۔

پھر بتا دیا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ خیر گئے کی طہتِ خوف ہیں ہر ایک کو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مسرہ پایا ہے کہ بعض خیر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے سہماب مختلف ہوں، ان میں سے بعض ملحق ہوں اور ایک سببِ خوفِ خدا بھی ہو۔

اس مقام پر بھی قیسم کے چٹروں کے ذکر میں ترتیب نہایت الحیف اور اخارہ مفصّل

تو میں ہیں، بھلا نفرت حضرت علی علیہ السلام و جناب حضور مقبول علیہ السلام و ان کے دھرم سے کیا فرمیں ہوئے، ابھی اگر کسی عیسائی کے سبب دوزخ میں پڑے کسی کے پھر نکالنے جائیں گے، اور جو کچھ وہ عربی تیار الفاظ میں الفاظ معصہ کیونکہ وہ عربیوں کی بدعت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہذا انکارِ نبوت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب وہ لوگ کافر ہیں گئے، اگر کفار کے لئے بدعت ہے دوزخ سے نجات پانا انہیں بھی آسان کتاب میں نہیں ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر بغیر کر دیا ہے ثابت ہوا کہ دعویٰ ملاوٹیں بلکہ غلو ثابت دلیں ہے۔

بَلْ مَنْ مِّنْكُمْ سَبَّ سَيِّئَةً ۖ وَأَحَاطَتْ بِهِ خَيْرَاتُكَ فَأُولَٰئِكَ تَحْتَفِظُ

جو کس جس میں نے کلمہ اچھا اور پھر کیا اس کو اس کے گناہ نے سو دیکھیں ہیں دوزخ

الْقَارَةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

کے رہنے والے، اسی میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو ایمان لائے اور عمل کئے

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۷۰

وہی ہیں جنت کے رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ اٰخِرُوْنَ اِنَّا كَمَا لَا

ہم دینا ضرور کر، کیونکہ ہمارا مطالبہ ہے کہ جو شخص قصداً برسی یا بری کرے وہ اس کو اس کی خطا

و قصداً اس طرح، اس طرح کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

کر گیا ہے، گناہ بھی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَاٰخِرُ ۖ خُطَابُكَ کے ساتھ جو معنی ہے کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

کر گیا ہے، گناہ بھی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَاٰخِرُ ۖ خُطَابُكَ کے ساتھ جو معنی ہے کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

کر گیا ہے، گناہ بھی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

خلاصہ یہ کہ جب اس ضابطہ کے ذریعہ کا اس کا ادبی نہیں ہوتا، ایت پر مبنی، جو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام قائم لایا، جس میں ایک کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو یہ دانا کا انکار کر کے کافر بن جائیں گے، اس لئے اس ضابطہ کے ذریعہ وہ کسی غلطی کی انتہا نہیں گئے، قوانین کا دعویٰ کر دیا کہ وہ اس کے لئے اس ضابطہ کے ذریعہ

وَلَا أَحَدٌ نَّامِيًا ۖ كَبُرَ اِسْرَآءُيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ

اور جب ہم نے کیا مشورہ بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِيْنَ وَ

اور ان باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور

فَرُوْا لِلنَّاسِ حَسَنًا وَّاَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَذُرُّوْا

جو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھو نماز اور دینے دہیو زکوٰۃ اور

كُوْنُوْا لِقَوْمٍ اَقْدِلًا ۖ اَلَمْ تَعْلَمُوْا ۚ اَنَّا نُمَتِّعُهُمْ حَسْرَتًا

خ، جو کچھ مگر غمخیز ہے سے تم میں اور تم ہی جو ہم نے دے

اور وہ زبانی ذکر ہے، اور یہ میں قول و قرآن میں اسرائیل سے

خلاصہ تفسیر اس عبارت میں کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

کر گیا ہے، گناہ بھی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَاٰخِرُ ۖ خُطَابُكَ کے ساتھ جو معنی ہے کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

کر گیا ہے، گناہ بھی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَاٰخِرُ ۖ خُطَابُكَ کے ساتھ جو معنی ہے کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

کر گیا ہے، گناہ بھی بہشت ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَاٰخِرُ ۖ خُطَابُكَ کے ساتھ جو معنی ہے کہ اگر کسی کی یا اگر کسی نے سوا ہے، گناہ ہے، دوزخ سے بھی

دور، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور جو لوگ اور رسول پر ایمان لائے اور ایک کلام

معارف ومسائل

[illegible]

آج سے ایک ہفتہ پہلے، ۱۹۷۱ء میں، جب کہ پاکستان نے بھارت کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا، ان دنوں پاکستانی فوجیں بھارت کے ساتھ ساتھ چین کے ساتھ بھی مل کر بھارت کے خلاف جنگ لڑ رہی تھیں۔

معاذوں میں ہیں کہ جو کہ احکام و قوریت احکام کے لئے اس کا حکام پر عمل کیا کرتے ہوئے ہیں
 احکام و قوریت احکام کے لئے اس کا حکام پر عمل کیا کرتے ہوئے ہیں
 احکام و قوریت احکام کے لئے اس کا حکام پر عمل کیا کرتے ہوئے ہیں

اور اللہ تعالیٰ رکھ، بے غیر نہیں ہیں اللہ تعالیٰ اعمال و زشت ہے۔

فان ائلا، ہر چند کہ یہودیوں کا قصہ میں ذکر ہے، میں اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کی بنا پر رکھا گیا ہے، لیکن یہاں ان کا ذکر نہیں، بلکہ بعض احکام میں ان کا ذکر ہے کہ حضرت امیر قریظ باجوہ، حالانکہ کج بگ جہلوم کو حرام سمجھے، مگر اس کی نفی میں ہوتا ہے اس میں شک کا جواب ہے۔ اور چونکہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر عمارت مشرور میں اس کی شدت کے پیش نظر کہ اسے اٹھائی کی گئی ہے اور یہاں ہر اسم پر عمارت علیہ میں اس کی مثالیں دل رات دیکھے ہیں، جیسے میں ذیل حرکت کر کے لے کر کہہ رہے ہیں کہ تو باطل ہے، حالانکہ مخالف ہوا اور قیضا نہیں ہے، اس سے قصد و مشیت، لغت و اس کام کی تباہی ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہی معنی ہیں اس حدیث میں: **لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُعَذِّبُكَ عَذَابَ اللَّهِ ظَنَاقًا**

اس مقام پر پہنچ کر دوسرا لڑکا دکھایا کہ وہ بھی مریضوں کی دوا میں وقت و سواقی تو اس کا فروع اس طرح پکارا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ جادو ہونے کی عطاوت و رومی کرنے کے سبب، بنی قریظہ قتل و قید کئے گئے اور بنی امیہ ملک شام کی طرف ہجرت و دولت و غوغا کی مثال بن گئے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ فَلَا

یہ دعا ہے جنھوں نے مولیٰ دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے سداً کہا
يُحَقِّقُ عَنْهُمْ الْعَذَابَ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٦٠﴾
جو کائنات پر عذاب اور نہ ان کو مدد دیجے گی۔

خلاصہ تفسیر

آخرت کے (دیں) رہا اطماع ہے، سورہ قود مزارینے والے کی طرف سے، ان کی سزا میں دیکھ، عقوبت دی مہلت کی اور نہ کوئی (دیکھ) غبار و دوست رفتہ دار، ان کی طرف قذری دہری رہی کہے لے اپنے گناہ۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ أَعْدَائِهِ بِالرِّسَالِ

اور بے شک وہی ہم نے موصیٰ کو کتاب اور پے درپے بھیجے اس کے پیچھے رسول

ہم نہیں بلکہ اسلام کے حدود و معارف پر کسی تمدن اور معاشرے کے مقابلے میں، معاصرین و مخالفین کی تعداد، جو بیشتر زیادہ رہی
الفاظی بازی ہوئی، تو وہ خود غرضاً کو خوب اچھا لگے، مگر وہ جو حق و صداقت پر غور
کے خاصا پرکھیں، ہم پروردہ اترے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا أَهْرَؤُوا ۖ وَمِنَ الَّذِينَ آمَنُوا كُوفًا

ادوار دینی کا ان کو سب لوگوں پر زیادہ حریفوں نے دیکھے اور زیادہ حریفوں سے بھی

یہودی احمد بن یوسف الفاسیؒ: وہاں ہوتا ہے کہ حجہ من

الْعَذَابُ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١١﴾

اس قدر جیسا ، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

اور وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے (آپ) تو ان کو حیل (دنیویہ کامیابیوں) سے

کو کہ بعض مشرکین سے بھی اڑھ کر آج ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت، ہر

گرتی عمر جو بھی گئی تو کیا ہے امر خدا ہے تو بچا نہیں سکتا، کہ دوسری کڑی، امر بھی جانتے اور حق تعالیٰ کے

سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (جو جس پر ان کو طاب ہونے والا ہے)

ہمارا دوشیز تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر بڑی عمر کی تھیں تو چندان عجیب نہیں، مگر بہت

ہے کی تمنا کریں۔ یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔

پس اوج و اعتقاد اثرات کے طول عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے

مگر چہرہ ہی ٹھکانا ہے۔ اس لئے جب تک بچے کو اس کی طبیعت ہو جائے اس کو بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں!

لَمْ يَكُنْ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

کے لیے جو کہ ان کے دشمنوں سے لڑیں گے۔ اور اسی نے قرآن مجید میں حکام کو یہ تلقین کیا ہے کہ

مُسْلِمًا قَالِ الْيَهُودُ يَدَّيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦﴾ مَنْ كَانَ

کہ جانتا ہوں اگر اس حکام کو اس کے پہلے ہر دور اور یاد رکھتا ہوں اور اس کی خبریں سناتا ہوں ایسا ہی اونی کو کہ جو

[illegible]

عَلَّوْا لِلْكَافِرِينَ ﴿١٥٩﴾

دشمن ایران کا گردن کاٹا۔

خلاصہ تفسیر

انہی کے زچے آتے ہے، یہی میکلائیل خوب ہیں کہ بائیں اور دست ان کے مشعل ہے، اگر وہی لڑائی

وہ جوان ہے، اس میں اتنی دلچسپی ہے کہ اس نے قرآن کے اس آیت کو یاد کیا ہے: "وہ جو اپنے والدین سے کہتا ہے: اے میرے والدین! میری طرف سے تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، یہ میری بات ہے، میں نے اپنے رب سے اس بات کو سنا ہے۔" (البقرہ: 132)

تو وہ سفرِ حق ہے، اسوہِ مطہرہ کے طور پر! انھوں نے پستِ قرآن پاک کے قلبِ ناکِ بیخیاوریا پر

اس دُورِ اِہ حالتِ بیکر تصدیق کر رہے اپنے سے قبل دانی و آسانی اکتانوں کا اور رہنمائی کر رہا ہے

و معالج ضروری کی اور دو تجربی سندھار ہے ایمان والوں کو اور کتب سادہ کی بھی مشق ہوتی ہے ،
 پس مترق ہر حال میں کتاب سازی اور قالی اتباع طعنا ، مہر علی علیہ السلام کو عطا ہوتے ہیں کہ

نہ ملتا نثری حالت ہے، ادب را خود مسئلہ عداوت جبرئیل کا، اس کا فیصلہ یہ ہو کہ حق تعالیٰ کے

خود دیکھا کہ ان سے جہن کی دینی کام بھرتے ہیں ان سب کے عداوت، کھانا اور چربیل سے عداوت رکھنا ہے۔

سب ہم چلتے ہوئے ہیں، اور ان سب مداروں کا قانون یہ ہے کہ جو کوئی شخص خدا تعالیٰ کا

ہے کہ اللہ تعالیٰ دُشمنِ ہر ایسے کافروں کا۔

وَأَمَّا الْفُلُفُلُ فَإِنَّهُ بِأَعْيُنِنَا وَسَوْفَ لِمَنْ أَهْلَتْ لَهُ ذَاتُ الْفُلُفُلِ أَجْرٌ كَثِيرٌ ۝

ادھم نے آٹا پیڑی طعنہ تھیں، دھنی لہو لٹکا دیکر کہے گئے ان کا گردن چھو انھیں کہیں

—

کے فرشتے ہوتے پر ملائق قائم کر دینے لگے، انکادان کے انکادان، وارشاوات کی تحصیل و اخلاعت نکھن پڑ۔

اور یہ کام انبیاء کو اچھے سے دس لئے نہیں لیا گیا کہ اقل تو انبیاء اور جاوہ گردوں میں ہوتا سنا د و فصل کرنا مقصود تھا ایک جنینیت سے گویا انبیاء کو ائمہ ایک فرقہ کا درجہ دیکھتے تھے، اس لئے حکم فرشتہ نقین کے علاوہ کوئی اور ثالث چھنا مناسب تھا۔

دوسرے کام اس کی تحصیل بغیر جاوہ کے الفاظ کی نقل و تحکیمات کے علاوہ ہر دستگی تھی، اگرچہ نقل کو کافر نبی شد کے عقل و فاعلی مسئلہ کا وہ کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا، مگر جو کھفایت انبیاء کو ائمہ مندرجہ جایت ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، بلکہ فرشتوں کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا، کیونکہ کارخانہ دیکھوں میں جو غیر کشر سب پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو عموماً مالک کے ہوتے ہوتے قریہ جو مصالح عامہ میں ہوتے ہیں لیکن لازم مقصد کے سبب ان کا چشمہ بول پیسے کسی ظاہر جاوہ یا موزی جاوہ و غیر کی مشورہ اور غور و رجوع و خلقت و تکریم جن جہت ہوتے ہوتے قور دست و دھور ہے، اور قشر بھی کا خلاصہ نا درست و عازوم، انبیاء کو ائمہ علیہم السلام کے کو اس سے خاص نشہ جہات کا کام ہی لیا ہوا ہے جو انصاف و دھرم و غیرہ کی ہوتا ہے، اور گو کہ یہ نقل و تحکیمات و ذکر و غرض کے خلاف ہے ایک شرفی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی پوجہ و احتفال قریب اس امر کے کو کہیں یہ نقل و تحکیمات میں جاوہ پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، اور حضرت انبیاء کو اس کا سبب بدست نقل ہونا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

ابست کتابت شریعہ سے انبیاء علیہم السلام کے وہ یہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی، ان کتابت کے جب نزائت کی تعظیم مت وجہ و مستل فست خنا سبب یا کرام کے اور یہ سبب ان سبب کی تکمیل میں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مسئلہ انبیاء کو ائمہ نے یہ بتایا ہے کہ شریعت لینا احترام ہے، اور اس کی حلیت بھی تہذیب و تمدن پر جزیات نہیں بناتے، کہ ایک طریقہ شریعت کا یہ کہ صاحب معامل سے غلی چلی کر کے نکالیں، اور غیر طریقہ کیونکہ اس طرح کی تعظیمات بیان کرنے سے تو لوگ اور دیکھیں سبکہ سمجھتے ہیں یا شاید اقامت کسر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواہیکہ سے یہ بتا دیا گیا ہے کہ دسب شیب کا عمل جس میں تکیہ کے پیچھے یا جب میں دیکھتے ہوئے وہ مل جائیں نا جائز ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ کمال مل چہنے سے اس طرح دوسرے ملنے ہیں۔

حاصل کام یہ کہ فرشتوں نے ان میں آکر ایک کام شروع کروا دیا کہ سکر اصول و فرائض ظاہر کر کے

وگوں کو اس کے عمل پر ہے بچہ کی اور سارے سے غرض و دوسری دیکھنے کی حسبہ اور تاجید کی پیچہ کوئی مانہ دیکھ کر جان و کثرت نارانے سے کفر یہ کلمات تک جاتے ہیں، اس لئے وہ قسراً یا خیراً ان کا کلام کو جس وقت شائع ہیں، جس کے کو عام کو مطلع کرنے کے دیکھو یہ کلمات بچے کے کان میں ان سے ہست یا مانہ۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقت فوقت تک ذیل کی امور دفات ان کے پاس شروع ہوئی اور وہ درخواست کرنے لگے کہ ہم کو کبھی ان اصول و فروع سے مطلع کریں گے تاکہ ان کو حق سے کئی بھادوں یا مل لیا میں مسئلہ نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور جواب دہانہ اور منجلیہ اور منظر اصلاح یا لفظیہ کی کہ اصول و فروع بتانے سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو اہل بیتانے کے ذریعے اشراف کی کراپے بندوں کی کراماتیں ہیں مقصود یہ کہ دیکھیں ان چہنوں پر مطلع ہو کر ان شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، وگرنہ اس کا کفر ہے، اور کوئی ایسا ہی خراب کرنا ہے کہ اس شریعہ مطلع ہو کر دین شریعہ راقتہ کر لے، جس کا انجام کفر ہے، بخلاف کفر علی ہوا و اعتقادوں دیکھو ہم کو کھلیت کے دینے ہیں کہ اچھی نیت سے اطلاع حاصل کرنا اور ہم اس نیت سے ثابت ہوا رہنا، ایمان نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر کہہ کر دیکھیں، بچے کے لئے پوجہ و دہانوں اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مسئلہ ہو جاوے، اور ایمان برادر کر لے۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ حیران ہو کر باک رہتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح حیدر بیان کر لیتا وہ اس کے وہ دہرہ جاوہ کے سبب اصول و فروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی کفر کفری کر کے اپنے ارادہ و نیت سے کافر و ناجیز بنے وہ جانے پانچہ پینے اس عہد پر قائم رہے، اور اس کا دوا کو مخلوق کی بددستالی کا زجر ہوا یا جو فسق و بقیانہ اور اور جیسے طریقے اس کے ہتھمال کے کفر ہو، میں، اس طرح سے کا بڑا کفر بن گئے۔

اس ارشاد اصلاحی اور پھر قاضی نے غلط کرنے کی مثال اس طرح ہو سکتی ہو کہ کوئی شخص کسی جانت مقول و منقول عالم اعلیٰ کے پاس جاتے کہ کوئی دوسرے یا چہ یہ فلسفہ چھارہ ہے، ناگوار ہو بھی اسی جہت سے مخدول ہو کر فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کرتے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی جواب دے سکیں، اور اس عالم کو یہ خیال ہو کر کہیں ایمان نہ ہو کہ جو دوسرے کو کفر سے لے، اور پھر وہ ہی خلاف شرع عقائد یا لظہر کفریت دینے میں اس کو ہتھمال کرنے لگے، اس امت کی وجہ سے اس کو نصیحت کرنے کو ایسا ہست کرتا اور وہ دھوکے لے، اور اس نے اس کو بڑھا دیا جاوے، لیکن انہیں غصہ کے خلاف اسلام لقا رات و دعا تو یہی کرم سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس علم کی ملامت ایرانی نہ نہیں ہو سکتی اس طرح اس الملاحہ سے کہ ان فرشتوں پر بھی دیکھیں سبہ کی

اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

مسئلہ اگر قرآن و حدیث کے کامائیں سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کرے تو وہ بھی ناجائز نہیں مگر اس کی ضرورت پڑنے کے لئے کوئی حق کہا جائے یا طلبہ پر واجب اسرار آجیہ و آجیہ قرآن کی کاہرہ بھی جرم پر و قہری عامان ثانی اور

بَايَٰهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعُوا دُورًا وَلَا تَقُولُوا لَا مَعْزِرَةَ

اے ایمان والو! تم جو کہو کہنا اور کہو کہنا اور کہو کہنا

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ كَفَرَ اِنْ اَبَى الْيُسْرَ

اور کہو کہنا کہ وہ ابی الیوم

خلاصہ تفسیر ایسی بیہودوں نے ایک شرارت ایجاد کر کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اگر لفظ واعنا سے آپ کو خطاب کرتے ہیں کہ میں ان کی

عزلی زبان میں ایک بد دعا ہے، اور وہ اسی نسبت سے کہتے تھے، عزلی زبان کے معنی یہاں مصلحت کی رعایت فرمائیے کہ میں اس نے عربی والی اس شرارت کو کہہ دیتے تھے، اور اس اچھے معنی کے قصد سے اپنے مسلمان بھی حضور کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو اور گناہ پیش ملی، آپ میں پتھر پھینکتے تھے، کہ اب تک قرآن کو خونی ہی بڑا کہتے تھے، اب ظاہر کیجئے کہ عربی ایسی بات کہ ان کو مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے، حق تعالیٰ نے اس میں گناہ پیش کرنے کے قلعے کھول دیے کہ وہ ان کے ایمان والوں کو لفظ واعنا سے خطاب کرتا کہ وہ

اس کی کلمہ سے لفظ کو کہہ کر اس لفظ کے معنی اور اعنا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، اعنا کہنے میں بیہودوں کی شرارت پائی ہے، اس لئے اس کو ترک کر کے دوسرے لفظ استعمال کرو، اور اس حکم کو بھی ملے، کتبہ اور یاد رکھو، اور دین کا قول کو توڑنا اس لئے بد دعا کہ وہ دینی کی وجہ سے اس لفظ سے کفر کی شان میں ایسی مستثنیٰ اور بھی جان لگائی کے ساتھ کرتے ہیں،

مسئلہ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر آپ کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملے معلوم ہو تو یہ ناجائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کوئی عام کے ناجائز فعل سے جائز کو مغلطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو وہ غلط ہے کہ لے لے جائز فعل میں منوع ہو جائے، جیسے لکھنے کا فعل شرعاً ناجائز اور مفاد شرعی میں سے نہ ہو، اس کی مثالیں مشرکانی و سنت میں بہت ہیں، اس کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تبت اللہ کی میری قریش نے تو ماننا نہایت میں کی کہ میں اس میں کوئی چیز نہ پاتا، اور یہی ہے غلط کر دی ہیں، میری دل چاہتا ہے کہ اس کو منہم کے لئے ہوتا، اور یہی ہے غلط کر دی ہیں، اور یہی اس سے ناواقف عوام کے فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہے، اس نے انہیں ایسا نہیں کرنا دیا، اس کا حکام کو اس میں لفظ صلاح میں سزا دینے سے نہیں کرنا دیا، جو میں فقہ کے نزدیک میرے، خصوصاً حضرات خاں جہاں کاہرہ اسلام کرتے ہیں قریشی،

مَا جُودَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُسْلِمِينَ

وہ نہیں چاہتا کہ وہ لوگ کہ جو قریشی ہیں کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو

يُؤْتُونَ عَدِيْبَكُمْ مِنْ خَلْقٍ مِنْ شَرِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ

کہ ان سے تم پر کوئی تک بات نہیں دے دیکھو، اور اللہ خاص کرنا ہے اپنی رحمت

مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَالْقَضَى الْعَظِيمُ

کے ساتھ جو کہنا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

خلاصہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیوہ کا پورا کھانا، اور اگر کچھ بات

میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں بیوہ کا پورا کھانا مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے کہ اپنے بیوہ میں بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بیوہ میں سے تم سے خیر خواہ ہیں، اور ہزار جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو دینی احکام دے دے، دینی احکام سے بہتر رعایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں، مگر کیا کیا جائے کہ کھانا دینے والے دینے سے اچھا ثابت نہیں ہوا، حق تعالیٰ اس کو خیر خواہی کی تکلیف فرمائے، بلکہ اگر وہ بھی پسند نہیں کرتے کہ اگر وہ خواہ ان

اہل کتاب میں سے وہیں اور خواہ مشرکین میں سے، اس امر کو کہ تم کو کھانا دے دو، اور اگر وہ طوت سے کسی طرح کی بیہوشی دیکھیں، کتبہ اور ان کے حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، مگر اللہ تم اپنی رحمت و رحمت کے ساتھ جس کو منکر ہوتا ہے، قصور فرمائیے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کرنے والے ہیں۔

خاتمہ ۱۱۔ بیہودوں کے دعوے تھے، ازل ہیودیت کا بہتر ہونا اسلام سے، و سکران کا خیر ہونا، قوفل دعوے کو تو یہ ثابت نہیں کر کے، فرمے دعوے سے کیا ہوتا ہے اور پھر بد عوی سے بھی فضول اس بات، کیونکہ جب ناح آتا ہے تو منوع ترک کر دیا جاتا ہے، انہیں طرہ فعل کے فرق پر موقوف نہیں، بلکہ اگر وہ ظاہر اور کھلی ہوتی ہوتے اس کے اسباب

نیزت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی منسوخ ایک ہی نبوت و شریعت میں ایسا ہونا باکچھ عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر یہاں سے نکلتے ہوئے خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: کہ تین گنا خطا الا سناخت۔ "تین گنا گنہ گار نہ ہوتے جس تکانی میں تھا" جس کا رد و بدل دیکھا ہو ورنہ!

چاہا کہ شہادت | انتہی پہ چاہی ہو دیوں نے اپنی حالت سے احکام پر آج کے نسخ کو مری احکام کے نسخ کی پہل دونوں صورتوں پر قیاس کر کے یہی کہ مری نسخہ و مسلم پر زبان طعن و داد کی اس کے جواب میں یہ آیات ازل جو میں (ایہ جسیرہ) ایہ کثیر و خیر) مسلمانوں میں سے مشرکہ، معتزلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان کا بغین کے طعن سے بچنے کی راہ نکال کر احکام پر آج کے نسخ ہونے کا امکان کو ہے، کوئی امر اس امکان کے لئے مانع نہیں لیکن یہی مشرکہ میں نسخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت مانع ہے، نہ منسوخ۔ یہ قول ابوسلمہ اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر ملتا ہوا آیت نے ہمیشہ زود بخیر فرمایا! تفسیر روح المعانی میں ہے:

تتم ازل شرائع کا نسخ کے جزاء اور وقت دونوں اتفاق ہے، صرف یہودیوں نے جزا جو ہے کہ ان کا نسخ کا حکم کیا ہوا اور ابوسلمہ اصفہانی نے وقوع کا حکم کیا ہے، وہ یہ کہ نسخ کا حکم ابوسلمہ میں نہیں تھا کہ نسخ کہیں واقع ہوا نہیں ہے

وانقضت اهل الشر اثم علی جواز الفتح و وقوعه و خالفتم اليهود فغير العبد سوتہ فی جوازہ و قالوا یمنع عقلا و لایو مسلمہ الا بعد فی وقوعه فقال انه و ان جاز عقلا کفہ لدر یقع

رد المحتار ص ۲۸۲

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا: معنی فقہاء الیاب آپس میں فائدہ تہ حلیہ لا تسفخ عن معنی فقہ العلماء ولا یسکون الا الجہلۃ الا فیما یر (رضی اللہ عنہ)

مشرقی نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد میں منشیوں نے اسے کوئی آدمی دخل کھڑا ہوا تھا، آپ نے فرمایا: یہ چاہا کہ کتا ہے، و گویا

نے کہا کہ دخل و نصیحت کر رہا ہے، کہپ نے فرمایا نہیں، یہ کوئی دخل و نصیحت نہیں کرتا، بلکہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں سو بیاناؤ، پھر اسی شخص کو بول کر یہ کہا کہ کیا تم قرآن و حدیث کے نسخ منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہماری صحبت پہل ہوا خدا ہمیں یہاں وسط خاک ہو۔

مشرکان و ملت میں نسخ کے رد و وقوع کے منطقی مساویہ کا بغین کے اتنے آثار و اقوال پہلے میں کوئی کچھ نہیں ہے، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر و دیگر روایات میں اسانید قویہ کے ساتھ بھی بہت روایات مذکور ہیں، اور روایات ضعیفہ کا ذکر نہیں۔

اس لئے امت میں پسند پیشہ اجالی رہا ہے، صرف ابوسلمہ اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوع نسخ کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازنی نے تفسیر کبیر میں شرح و ہدایت کے ساتھ رد کیا ہے، لیا کہ منہم میں متذہب و منافق ہیں، چہ کوئی نسخ کے عقلائی معنی نسخہ علی حکم کے ہیں، اور یہ نسخہ علی کی جہلہ میں منسوخ جس طرح ایک حکم کو باغیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لائے ہیں، یہ جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت المقدس کو قبل بنا دینا، ایسی طرح کسی مطلق نام حکم میں کسی قید و شرط کو عداوت یا کتب نسخہ کی قید ہے، اسلاف امت نے نسخ کو اس مقام میں بھی پسند فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی قید یا نسخہ کی قید ہے، اور جزوی نسخہ کی قید شرط ہوا، نسخہ کا بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متذہب میں حضرات کے نزدیک قرآنی میں آیات منسوخ یا نسخ کا شارحی نہیں ہیں۔

حضرات مناظر میں نے صرف اسی نسخہ کی قائم نسخہ رکھا ہے، جن کی پیروی کر کے ساتھ کسی طرح بغین نہ ہوئے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخ کا خدا بہت کثرت ہوا ہے، اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ حق میں نے تقریباً باسقاطات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، میں اس میں قید و شرط ہوا، و فرمایا کہیں ثانی کیا تھا اور حضرات مناظر میں یہ اسلام بیوقوفی ہے، صرف میں آج کل کو منسوخ معتزلہ روایات کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس میں بھی تطہیر کی صورت پیدا کر کے صرف باغ آج کل کو منسوخ فرمایا ہے، میں کوئی تطہیر نہیں تاویل جدید کے نہیں ہو سکتی، یا امر اس لحاظ سے نہیں ہو سکتا کہ احکام میں اصل بقا ہے، نسخ غلوں اصل اس لئے چاہا کہ امت کے معمول یہاں کے کوئی توجیہ ہو سکتے ہے، اس میں بلا ضرورت نسخ کا تاویل درست نہیں۔

لیکن اس تحلیل کی مدینا، ہرگز نہیں ہو سکتا کہ منسوخ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازاد کی کو بخشش جو دوسری ایک باقی رہی، آخری اکثارات حضرت شاہ ولی اللہ کا ہوا

جس میں گھنٹے گھنٹے پانچ روغن، اور اب اس کا استعمال ہے کہ کوئی ہدیہ مصلح ان پانچ کا کسی خاصہ کر کے اکل صبر تک پہنچا دے۔

[illegible][illegible][illegible]

نسخ کے متعلق اچھے احکام کی تفصیلات کی یہاں مختصر تشبیہ اس کا اصل محل اصول و فقہ میں ہے۔

اَمْ تَرْيَدُونَ اَنْ تَسْأَلُوْا سَوَآءَكُمْ كَمَا سَئِلَ مُوْسٰى مِنْ
 سَآئِمِ سُلٰكٍ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَوَآءٌ لَّكُمْ سَوَآءٌ لِّمَنْ
 سَئِلَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ
 فَاَتَّبِعُوْا مَا اَخْرَجَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝۳

پہلے اور جو کوئی کفر کرے جس نے ایمان کے قودہ پہنکا سہمیں ماہ سے ۔

ایہیں پہونے حضور اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا بیٹا
موسیٰ علیہ السلام پر ایک ہی دفعہ نور خدا نازل ہوئی اسی طرح کہ قرآن
میں جو طوطا پڑھانے سے اس پر اشراق ہوتا ہے وہاں کیا قسم ہے جو کہ اسے (سوئی در وقت) سے
دینا چاہا، وہ تو سنیے کہ جو کہ اس کے قبل درختاں پر دروں کی طرح سے حضرت، موسیٰ
علیہ السلام، سے بھی (ایسی ایسی) درختاں میں کجا پہنچیں، وہ شکار خدا کی علامت دیکھنے کی
دعوت کی جاتی تھی، اور ایسی درختیں ہیں جن سے صرف رسول پر اختر اسرار کا نور دریا جی (انور)
میں مزاحمت کا نامی مقصود اور ایمان لانے کا سبب بھی مراد ہے جو میری کنز کی (ایمیں میں) انور)
جو تھی ایمان لانے کی وجہ سے نور کی ایمان آکر ہے جو شک و رخصی کا دراست سے دور ہو چکا،
فان لا۔ اس کے کہ اسے ایمان لے کر فرمایا کہ میں نسل میں اللہ تعالیٰ کی نیکبختی میں اور علیین
میں، بنو اسرائیل کی طرح کیا عرصہ ہے کہ وہ کہہ کر بات اس طرح ہو یہ اس طرح
اس کا نام تو میں نے پڑھا ہے۔

کتابان تادہ کردن اسرار تو
 یتجلی غیبت اذکار تو
 ترجمہ: اہل حق میں یہ قطب مسلمانوں سے قرار دے کر اس کا مصلیٰ مسلمانوں کو اس پر شہید
 کرنا جو کجا کہ رسول سے ہے اس کی طرف سے ۔

وَذَكَّاءُ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ

الحَقُّ ۚ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهَ بِأَمْرٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ

نسلِ اعراب پر باہمی اور نعلانیٰ شہ کے بیان
دیکھ کر کوفہ کے قریب مل جل کر جان اور مال کے لیے

چڑھیں یہاں بنیادی اصولوں میں سے کسی بھی اصول کو
چھوڑ دے خواہ وہ یہودی ہو یا اعراب یا مسلمان
اور ہمیں کفر کی قیامت کے نہ زمین میں اپنے آپ کو جنت کا ٹھکانہ دار سمجھ لے تو یہ صورت اس کی نظر میں
ہے ہمیں کا حقیقت سے ڈر کا بھی واسطہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر کی کیا تائید ناموں کا سہارا
نے کر کر نہیں ہو سکتا، مذکوروں میں سکتا ہے، جب تک اس میں ایمان و عمل صالح کی روح موجود ہے
پھر اصول ایمان تو قبول کر رہے ہیں جنت کے لئے میں مشرک و کفر کا رعبہ ہے ہی البتہ
عمل صالح و مغفول کی شکل کی افادہ دہی ہیں، قرآن سے زمانے میں عمل صالح وہ سمجھا گیا جو
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قریب کے تعلیم کے مطابق تھا، انجیل کے دور میں عمل صالح عیسائی
وی عمل تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے تعلیم سے مطابقت رکھتا تھا، اور اب قرآن
کے زمانے میں وہی عمل صالح کہہ جانے کا مستحق ہو گا جو آخر قرآن میں صلی اللہ علیہ وسلم کے
قرآن اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ہو گا۔

خلاصہ یہ کہ یہود و اعراب کی اس اختلاف کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ
فرمایا کہ دونوں قومیں جنت کی جائیں گی مگر یہی ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی جنت کا ٹھکانہ نہیں
اور یہی دونوں کے مذہب کے بنیاد اور بے اصل ہیں، بلکہ دونوں مذہبوں کی صحیح بنیاد موجود نہ
تھا جن کا سبب اصل ہے، چنانچہ انھوں نے مذہب و ملت کی اصل روح یعنی عقائد و اعمال اور
نظریات کو چھوڑ کر نسل و وطن بنیاد پر کسی قوم کو یہود ٹھہرایا اور کسی کو اعرابی ٹھہرایا۔
اس کو یہود کی نسل سے جوڑا یہود کے شہری بستانوں یا روم و شام میں اپنے آپ کو یہودی بتاتا
اس کو یہودی ٹھہرا گیا، اسی طرح اعرابیوں کی شخصیت و زمین کی کمی، حالانکہ اصل ایمان کو تو فرار اور
اعمال صالح سے نہ مٹا کر کوئی یہودی یا یہودی بنا رہا ہے، اعرابی اعرابی۔

فہرست کہ یہی اس اختلاف اور اس فیصلہ کا ذکر مسلمانوں کو سنانا اور مستحکم کرنے کے
لئے ہے کہ ہمیں وہی ہے جس کی غلط فہمی میں مسئلہ بن جائیں، کو یہود پر توشتی مسلمان ہیں، ہر فرد و ہر
میں ہمارا نام مسلمان کے خانے میں دے دے، اور ہم بن جائیں، ہم اپنے مسلمان ہی کہنے ہیں، اس لئے
جنت کے لئے ہمارا تمام لغوی دعوں کے ہم کو مسلمان ہیں جو یہی عمل اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمان
ہے کہہ گئے۔

اس فیصلہ سے ان پر واضح ہوا چاہئے کہ کوئی شخص، جس سے جو مسلمان بتا رہا ہے
کہ یہی مسلمان نام دے کر اپنے مسلمان کی حالت ہے، ان کے شہری پر دہشت ہونے کی وجہ سے، بلکہ
مسلمان ہونے کے لئے قرآن اسلام ضروری ہے، اور اسلام کے معنی ہیں اپنے آپ کو سیر کر کے

اور سوچ لینے کے ہیں، دوسرے اسلامی عمل میں سنت کے مطابق عمل کو درست کرنا۔
لیکن فہرست کہ یہی اس تنبیہ کے باوجود بہت سے مسلمان، اسی یہودی اور اعرابی علی کا
ٹھکانہ بن گئے، کفر و شر اور آخرت و قیامت سے بالکل ناخالص رہ کر اپنا نسل مسلمان ہر مسلمان
ہونے کے لئے کالی بن گئے، اور قرآن و حدیث میں جو وعدے، قلاع و دنیا و آخرت کے مسلمانوں کے
کہے گئے ہیں اپنے آپ کو کالی بن گئے، کفر کران کے ہونے کے لئے انتظار کرنے لگے، اور جب وہ ہونے
ہوئے نظر نہیں آئے تو قرآن و حدیث کے وعدوں میں شک کرنے لگے، اس کو نہیں دیکھ کر
فہرست ان کے نفس نعلی مسلمانوں سے کوئی رعبہ نہیں کیا، جب تک وہ اپنے تمام اہل و عیال کو اللہ تعالیٰ
اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع و مددگار کے جگہ سے بہتے طریقوں پر عمل صالح
کے پابند ہوں، یہی خلاصہ ہے، ایت مذکورہ قرآن استقامت و حقیقت کا یہود و نصاریٰ کی آجندہ
جنت و دنیا، و لا تخرجنہ من دینہم و لا تخرجنہ من دینہم، ایت مذکورہ قرآن استقامت و حقیقت کا یہود و نصاریٰ کی آجندہ
آجکل یہودی دنیا کے مسلمان طرح طرح کے معاصات آفات کا شکار ہیں اس کو دیکھ کر یہ سب
نا واقعہ لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اس نام آفات و معاصات کا سبب ہمارا اسلام ہی ہے
لیکن مذکورہ تحریر سے واضح ہو گیا کہ اس کا اصل سبب ہمارا اسلام نہیں بلکہ رکب اسلام ہے، کہ
ہم نے اسلام کا صرف نام اپنی رکھا ہے، اس کے عقائد ہمارے اندر ہیں نہ اخلاق، نہ اعمال، نہ عبادت
و معنی میں ہم ہیں اصراری تو ہیں ہی، خود

پھر ہمیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلم کے لئے کہے ہونے و وعدوں اور اعمالوں کا سہم
انتظار کریں۔
البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم کو یہی ہے نام تو اسلام کا لینے ہیں، اللہ تعالیٰ اور
اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر تو ہیں، اور کفر کا ٹھکانہ پر اللہ رسول کی طاعت کرتے ہیں
اسلام کا نام لیتا ہیں پس نہ کہہ سکتے، وہ تو آقا و نبی ہیں پر طاعت کرتے ہیں، پس بڑی کفر و کفر
کے مانگ ہے ہونے ہیں، وہ کیا کی مسلمانوں اور تمام لوگوں کے ٹھکانہ ہونے کا ہے، اگر یہی بھلی کی
ہیں یہ سب سے اعلیٰ دہی ہے کہ ہم ہر جگہ پناہ و پناہ ہیں، کفر و کفر کا اس سے زیادہ سزا ملنا چاہئے
لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ شہر و کفر و کفر ہے جو ہے گا۔

اول قرآن سے کہ دوست اور دشمن کے ساتھ معاملہ کیسا نہیں ہو گا، کہ دوست کو
قدم قدم اور بات بات پر کفر کا جگہ ہے، اور اگر شاگرد کو ذرا داس بات پر سزا دی جاتی ہے لیکن
دشمن کے ساتھ یہ ملوک نہیں ہوتا اس کو قریب دی جاتی ہے، اور وقت کے پورے پورے پناہ لیا جاتا ہے
مسلمان جب تک ایمان و اسلام کا نام لیتا ہے، اور اللہ کی عظمت و جنت کا دم بھرتا ہے

دور و سوتوں کی قبرستیں بدو اٹھلے ہیں، اُس کے بُرے اعمال کی سزا اٹھو اور دنیا ہی میں ہی پڑی جاتی ہے۔
 ہم آخرت کا دار چٹا بھجوا رہے ہیں، مصلحت کا کافر کے کس پر ہادیوں اور مشنوں کا قانون جاری ہے۔ دنیا کی
 ہر جگہ سسٹمز ہیں۔ ان کا بدو اب چٹا نہیں کیا جاتا، ان کو ایک ٹینٹ ڈسپنسری پر چڑھا دیا جائے گا،
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رشتہ دار کو ایسی حاجی مطلب جو کہ کوڑا بٹوسا جس کے لئے دیغا دار کا کافر
 کے لئے جنت ہے۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے سنسز اور پریشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی ہے کہ اسلئے فتنہ
جڑا کا بعد اگانہ خاصہ رکھا ہے ، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے ، مثلاً
نجات کا خاصہ برمال میں زیادتی ، واد کا خاصہ ہے بدن کی صحت ، اب اگر کوئی شخص نجات میں
توقی و استلگ و بر بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو بعض تجارت کے سبب و
بہاری سے نجات نہیں پاسکتا ، اسی طرح واد اور کوا استعمال کر کے نجات کا خاصہ حاصل کی اور اپنی
عامل نہیں کر سکتا ، کھنکوی کی ترقی واد میں وادوں کی افرادی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں ، جیسے مسلمان
افلاس و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں ، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور دنیوی طرح دنیا کے
مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے ، تجارت ، صنعت ، اور راحت اور حکومت بہت
کے مفید و مستوی کو محنت یا کیا ، مضر طریقوں سے بچے ، تو دنیا میں ترقی حاصل کی ، اگر وہ بھی بہادری
طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر پیچھے ہٹے اور دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے
مطابق جہد و جدوجہد کرے تو ان کا کفر نہی و کمال و دولت یا حکومت کا مانگ نہ بنوایا ، ہم سب
کہتے ہیں کہ کفار اسلام اور وہ بھی صرف نام کا ، بہادری ساوی فتوحات کے دوران سے کھول دیا
اسلام و ایمان اگر اعلیٰ صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور نتیجہ نجات آخرت اور جنت
کی راحت و مسکن و دنیا میں مال و دولت کی فتنہ وادی و پیش و آرام کی دست ، اس کے نتیجہ میں حاصل ہونا
منجوری میں جنگ ، اس کے لئے اس کے مناسب جدوجہد کی جائے ۔

اور یہ بات خبر ہے ثابت ہو کر چہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت و سیاست کے اصول سمجھ کر بسے کیہ کران پر عمل پیرا ہو جائے تو وہ بھی ان دنوں کی ضرورت و نتائج کے عود میں نہیں رہتا، جو کہ کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہو کر رہا نہیں، ہمارا اغلاس و جہت باریق اور مصائب و آفات پہلے سے اسلام کو کم جبہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے مٹھوڑنے کا نتیجہ ہے۔ جس سے عمل میں لانے سے مالی و دولت میں لاپرواہی ہو کر آتی ہے۔

سرفرازان کا کھانا اور آخرت سے فطرت اور بے چارائی اور اخلاقی فساد کی سبب سے بیکار، لیکن ان کے وہ اعمال، مہینے بھر کے جوہر سے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں جس مقصد کے لئے کھڑے ہیں اس کے پیچھے انھیں کوشش، معاملہ کی چال، بات کی چال اور دنیا میں انہیں شروع سے حاصل کر کے لئے نئے نئے طریقے جو در حقیقت اسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نعمت ادا کرنے کی کوشش نہ کی جو حضور پاکؐ کے اسلام کا ہے۔ اسلام انا حضور ہے۔

الغرض مسندِ اہل حق کی ان آیات نے واضح کر دیا کہ حقیقی نسلِ ملود پر اسلام کا نام رکھ لینا کسی منہ پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عمل صالح کو حقیقی ملود پر ختم نہ کیا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذَكَّرَ فِيهِ اسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا قالم کوئی جس نے مٹا کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا چارے دہاں ہم اس کا اللہ

تسعى في خراجها، وأولئك ما كان لهم أن يدخلوها إلا لحاجة،

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خَيْرٌ وَأَكْبَرُ فِي الْآخِرَةِ إِنَّ اللَّهَ عَظِيمٌ ۝ وَاللَّهُ

اس کے لئے دنیا میں دولت کو اور اُن کے لئے آخرت میں بڑا عقاب ہے اور اللہ بھی کا کر

المشرق والمغرب ، فأيّهما تولّوا فثمّ وجه الله إنّ الله

مشرق اور مغرب میں ملنے والی متوجہ ہے اللہ بڑا اللہ
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ ۝

ۛے اہل سب بھکشوؤں کو فیروز الملک کے حکم پر جاندار لاکر

وہود و توفیق کا حکم ہونے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ ہم جو لوگوں کے دلوں میں شخصیات بردار کرتے تھے، اگر وہ مشہدات عام طور پر فلاح مہ ارا

کرتے تو میں کافر بنی شیعہ انکار و سالت اور ترک نماز، خطا، اور ترک نماز سے مسجد کی ذیلت لازم ہے۔ اور اگر آپ یہودی اس طرح سے ترک نماز اور ویرانی، مساجد و خصوصاً مسجد منورہ میں بھی کمرشال تھے اور

روم کے بعض مسلمان طبین جو نصاریٰ کے اسلام رفتہ تھے، اور نصاریٰ کے اذیت کے اظہار کا انکار بھی نہ کرتے تھے، گو وہ نصرانی مذہبوں، کسی زمانے میں یہود و مشام پر جرح و جرح کرتے تھے، فکل و قتال میں یہود و مشام

وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجد بیت القدس کی بے مروتی بھی ہوئی اور بلاصفتی کی وجہ سے اس میں

دور و مسکن کی فرست میں داخل ہے، اس کے برے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں دی جاتی ہے۔
 ایک آخرت کا وار لکھا ہوا ہے۔ جہنم کا کوسرے کوس پر بادلوں اور غشوں کا ٹھکانا جاسی ہے۔ وہاں ایک
 بلی کی سزاؤں سے ان کا بامذاب لکھا نہیں کیا جاتا، ان کو ایک گھنٹہ نہ سب میں پکڑا جائے گا،
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑا کر لایا گیا ہے، مطلب جو کہ دنیا میں اس کے لئے خیر فائدہ اور کافر
 کے لئے جہنم ہے۔

دوسری بات مسلمانوں کے فتنہ ساز اور پریشانی اور فساد کی ترغیب و آرام کی ہے کہ انہیں
 بڑی کامیابی کا خاصہ نہ لگے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً
 تجارت کا خاصہ بر مال میں زیادتی، اور ایک خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں
 توفیق دلا گیا اور بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو نقص تجارت کے سبب در
 بیماری سے غارت نہیں ہو سکتا، اس طرح دروازہ کمال کمال کے تجارت کا نقصت مال کی زیادتی
 حاصل نہیں کر سکتا، فساد کی دوسری طرف مال و دولت کی زیادتی ان کے کمال کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان
 انفس و مریضانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار کے جب آخرت کی فکر چھوڑی اور دنیوی طرح دنیا کے
 مال و دولت اور پیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت و ترافع اور حکومت پرست
 کے مفید دستوں کو مستی و مفرط فحش سے بچے، تو دنیا میں فتنی عمل کر لیں، اگر وہ بھی ہادری
 طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جائے تو دوسری طرف فتنی عمل کرے، اس کے اصول کے
 مطابق جہد و جدوجہد کرنے کو ان کا کمال کرنا مال و دولت کا حکومت کا مانگ نہ بنوایا، پھر ہم یہ
 کہیں سمجھ لیں کہ بناوا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہادری ساری فوجات کے دو دانے کو نہ کھایا
 اسلام و ایمان اگر اکل صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور ذخیرہ تجارت و حکومت اور جنت
 کی دائمی صحت ہی دنیا میں مال و دولت کی فتنہ زانی، باطن و آرام کی وسعت، اس کے نتیجہ میں حاصل ہوا
 فریبی نہیں جنگ اس کے لئے اس کے مناسب جہد و جدوجہد کی جاتے۔

اور یہ بات قرآن مجید سے ثابت، ہر کہ جہاں کہیں اور جہد کوئی مسلمان تجارت و صنعت و حکومت
 سیاست کے اصول پر سمجھ کر نہ کرے، تو وہ بھی مال و دوسری طرف فتنی عمل کرے، اس کے
 خود نہیں دیتا، جو اس کا فتنہ اور ہر ہے۔

اس سے واضح ہو کر دنیا میں ہمارا افلاس و محتاجت اور محتاجت و محتاجت و محتاجت و محتاجت
 جہد نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے
 شرمناکے کا نتیجہ ہے جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہو کر آتی ہے۔

افسوس ہے کہ میں جہد و جدوجہد والوں کے ساتھ اختلاف کا اتفاق نہیں کیا تو ہم نے اس سے

صرف ان کا کمال و آخرت سے غفلت اور بے حجابی و بلاغت کی فوسب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ
 اعمال نہ سمجھیں جن کی وجہ سے دنیا میں کامیاب لڑنے کے ہیں جس مقصد کے لئے کوشش ہیں اس کے
 پیچھے ان جہد کوشش، ممانعت، حجابی، بات کی چھانی اور دنیا میں ان شرو و سرخ حاصل کرنے کے
 لئے نئے طریقے جو دین و ممانعت اسلامی کی اصلی تعلیمات میں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نفی
 اندر کے کوشش نہ کی تو بغیر ہائے اسلام کا ہے، یا بنا لایا خصوص ہے۔

ان کو ستر گاہی ان بات نے واضح کر دیا کہ اصل سبب سبب اور سبب اسلام کا نام دیکھ لیا کسی نتیجہ
 نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور دینی صالح کو نقص ملے نہ ہو دنیا و دنیا جاتے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذِينَ كَرْفِيْنَا اسْمُهُ وَ

اور اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہے جسے اللہ کی مسجدوں میں کوئی نام دیا جائے وہاں اس کا اللہ

مَسْجِدِي خَرَابًا وَذَلِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الْعَاقِبِينَ

موسطی کہ ان کے احباب نے ہیں، ایسوں کو لاق نہیں کہ داخل ہوں گے ان میں مگر قدرے ہوئے

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خُرَابٌ وَكَانَ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰

ان کے لئے دنیا میں خرابی و زبوت اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے، اور اللہ کی

النَّاسِ وَالْمَعْرُوفَاتِ فَإِنَّمَا كَانُوا أَقْتَمَ وَجْهًا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ

مشرق اور مغرب میں جہتوں کو نہ کر دیا، ہی متوجہ ہے اللہ، بلکہ اللہ

وَأَمَّا عَنِ عَالَمِهِ ۝۱۱

یہ اللہ کا کمال و کمال ہے

دوسرے فوسب کا حکم دینے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کہ ہم کو تو

خلاصہ تفسیر کے دونوں میں مشابہت پیدا کرتے تھے، اگر وہ مشابہت عام طور پر فلوب میں لڑ
 کرتے تو ان کا لڑنا نہیں لکھا، ورسالت اور ترک نماز، ترک نماز سے مسجد کی دہرائی لازم ہے،
 اگر وہ یہودی اس طرح سے ترک نماز اور دینی اسباب خصوصاً مسجد نہیں لڑیں تو مسجد کی فوسب ہے، اور
 دوم کے بعض مسلمان جو خلاصہ کے اسلام تھے، اور انسانی ان کے افعال کا انکار بھی نہ کرتے
 تھے مگر وہ لعلانی دہوں کسی زمانے میں یہود مشابہ ہو جاتے تھے، مثلاً و قتال میں ہوا اور اس
 وقت بعض جہاد کے باعث سے مسجد بیت المقدس کی بے عزتی بھی ہوئی، اور باطنی کی وجہ سے اس میں

خازن و طبع کا ہنگامہ بھی نہ ہوا اس طرح ہر نصاریٰ کے اسلاف ترک خاذا اور دیرانی مسجد کے بانی ہوئے اور نصاریٰ پر ہر عہد کا ہنگامہ اس کا الزام دیا، اس بار شاہ کا نام مجلس تھا، اور نصاریٰ کو فتح ہوا ہی ناگوار نہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تبدیل ہوئی تھی اور یہ یہود سے عداوت رکھتے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ معظمہ میں داخل ہو کر مسجد انعام کا طواف اور خازن اور اسلاف کی جاہلی قریش کے یہودیوں کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپ اس سال وہاں تشریف لے آئے، تو اس طرح پیشتر کہیں بھی مسجد حرام کی دیرانی مسجد کو نشان دیتے، اس کو تو حق تعالیٰ نے صلیب عوم سے اس کی قیامت اور برائی ظاہر فرمائی، لیکن، اور اس شخص سے زیادہ اور بڑی کافلم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجد میں ایسی مسجد رکھ کر مسجد حرام، مدینہ کی مسجدیت المقدس کی مسجد اور مسجد سمیعیہ (عجمیہ) ان کا ذکر دار و عبادت، کئے جاتے سے بند کرے، اور ان (مسجد) کے دیران (اور داخل) ہوئے، دیکھ کر ہر مسیحی کو شش کرے، ان کو گول کر تو کہیں بے ہیبت (اور بیباک) ہو کر ان (مسجد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، البتہ جہاں سے قریات غلبت و حرمت اور بے جا تھے جب بیباک ہو کر امداد جاتے تھے کہ اس ہشتاں نہیں تو اس کی چنگ حرم کا حق سب حاصل ہوا، اسی کو ظلم فرمایا گیا، ان کو گول کو دنیا میں بھی دسوائی دنا سب اہل گاہ اور ان کو آخرت میں بھی سزا دینے تسلیم ہوگی۔

دوسرے تہذیب قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں گھبرائے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، لیکن، اور انشائی کی ملکوت ہی حسب پیشین مشرق بھی اور مغرب بھی دار وہ اس کا مکان نہیں)

پس جب وہ ہنگامہ ہی جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کریں، کیونکہ محکم تعجب میں مسلمان مابین کمال اتفاق ہیبت اور اجتماع غلط ہے، اور یہ محکم ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے، جن کا حکم وہیں دیکھیں وہاں ہٹے، ان البتہ اگر مسجد کی ذات نورانی جہت خاص کے ساتھ مقید ہوئی تو ضرورت کی وجہ سے اس جہت میں غلط عبادت بننے کا اصرار یا اختیار لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید نہ ہو رہیں جب یہ بات ہے، تو اگر لوگ اس طرح بھی شکر کو دیکھیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا شرف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود خواہ جہات اور اسباب کو ایجاد نہیں، جس طرح کا اساطیر گن کی شان کے لائق ہے، ایسی بار و برحق اور خود دیوئے کے لئے ہے، چہرے جہت عبادت کو مصلحتیں اس لئے فرمایا کہ وہ احوال میں ہیں، و کہ ہر شے کے مصالح کو خوب جانے نہیں، چہرے ان کے طریق پر تعین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دیا،

۱۔ اور انی مسجد میں کو نشان مقرر کی دنیا میں خوب رسوائی ہوئی کہ ہر مساری قریش اور انشائی اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گزار بن گئے، اور مطالب آخرت تو کافر ہوئے کہ وہ سے ظاہر ہے ہی، اور دیرانی مسجد میں کو شش کے سبب ہر عذاب اور بیک سخت و شدہ ہو جاتا تھا، اور ادھر کی آیت میں ہوا ہی تیرا سترقوں کے حق پر ہوئے کہ دلوں دلوں ہوا تھا اس قصہ سے اسل تردید کا ایک گود مفہوم بھی چل آیا، کالیہ ایسے افعال کر کے صاحب جن ہوئے ہوا غوی بڑے مشہوم کی بات ہے۔

۲۔ انیسویں آیت کی ایک محکم بطور مثال اور بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفین اسلام کا باطل بھی کہ مسلمان کعبہ ہست ہیں، باطل اٹھ گیا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے لیکن عبادت کے وقت کعبہ کی قلب کی ضرورت، اور نیز عبادت کی ہیبت و اجتناب کہ کسی ایک شئی میں داخل ہو جائے ہو دلوں میں جبر و مشاہدہ ثابت ہیں، اس لئے اس کی جھوٹی اور اجتناب ہیبت حاصل کرنے کے لئے تعینی جہت شروع ہوئی، لہذا اس اعتراض کو شش کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی برائت کے لئے یہ دعوئی کرے کہ یہی جہت کو سامنے اس قصد و فرض سے دیکھیں، تو اول قریب برائت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں کو شتا، وہ بدستور غلط رہا، اور اس مقام پر مصلحت و اصل ہے۔

۳۔ امام مسلمانوں اور امام کافروں کی حالت غلبہ کر کے سے حد پر پہنچنے کے دعوے میں مسلمانوں کا راستہ گمراہ اور دوسروں کا درست گمراہ، تاہر وقت پر شش کو معلوم ہو سکتا ہے۔

غیر سے، حق سبیل اللہ لڑائی کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان لی جاتی ہے کہ اس میں انیسویں آیت تعجب کے لئے کسی فرسوسہ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہل اسلام کے دوسروں کے نہیں ہو سکتا۔

اور ترجمہ تفسیر کے میں بھی یہی بات محکم کے لئے یہ لفظ لفظ اضافہ کیا گیا کہ ہر اس کی وجہ یہ ہو کہ احکام خداوندی کی حکمتیں اور مصلحتیں انصاف اور اسناد کے ساتھ کسی کے اور پاک میں نہیں آتیں، اس سبب سے کہیں بھی جزا و جزا و نکشیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جاتے، ان کے اور دوسروں کی حق نہیں ہو سکتی۔

۴۔ اور یہ چور فرمایا ہے کہ اگر اصراری اللہ کا ہے کہ ۱۴ اور اس طرح یہ چور فرمایا ہے کہ وہ بظاہر اور ایسے ہی جرم مضامین ہوں ان سب میں زیادہ و کم کو رد کر دینا چاہئے، کیونکہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پروردگار کسی بندہ سے کہیں نہیں اسی طرح اس کی ذات کی خفیہ مصلحت سے خارج ہے۔

کونیکو اور برسرے کی کثرت نسائی و عروج (یعنی) پیش آقاؤں اور درجے کے اور درجے سے کہ پہلوی
 میں خدمت میں عظیم عقید ہے کہ جب کسی کام کا درست پیدا کیا گیا ہے، یا پھر کیا چاہتے ہیں تو
 جس واقعی بات ہے کہ اس کو رشتہ اور زمانہ سے چھوڑ کر جو اس طرح وہ داس طرح، جو جاکے، اور ان
 آفت و اسباب اور مناظر اور امتیاز کی خدمت میں، ہیں پڑی، اور یہ چاروں اور ہر حق تعالیٰ کے
 کسی میں نہیں پائے جاتے، اور یہ مذہب عیالی اور ان کے کئی سلطنت سے مختلف ہیں، دلیل سے معذرت
 و اختصا میں بھی اہمیت ہو کہ کھن تمام ہو گئی،

فوائد | خاص خاص کاموں پر خاص خاص علاج کہد کہ معشر کرنا مشکل ایش اور ذی وقیرہ داور
اس طرح اسباب اور دوا اور اولوہ کئی سے کام لیا جائے سبب کی محکمت ضرورت ہی پر مبنی
ہوئے اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں اسباب و قوت کو جانستہ دوا والی کرنا سنا سناستہ دود دے کے
علاج کریں۔

۲۔ بیٹھاؤں کے کہلانے کو پہلے سسٹرائی میں انڈسٹری کو منسبہ قبول ہونے کی وجہ سے باپ
سما کر گئے تھے، جاہلوں نے وہ رستے سے سمجھ لئے، اس نے یہ عقیدہ رکھنا کہ ایسا کافر قرار دیا گیا
وہ نساؤ کی معلومت سے ایسا جو لفظ کے استعمال کی، فعل احادیث نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُجِئُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْنِيْنَا إِلَهُ؟

اور کہے ہیں وہ تو کچھ نہیں جانتے کیوں نہیں مانتے کرنا ہم سے انصاف نہیں ملتا تھا اس کو کیا تہا۔

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ

اسی طرح کہ بچہ میں وہ لوگ حوا کے پیچھے تھے انہی کی سی بات ایک سے پس دل

قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٠﴾

ان کے بپے ملک ہم کے جیسا کہ اردو زبان کی ان لوگوں کے واسطے جو جیسے کہ اسے ہیں

خلاصہ تفسیر مقابلہ میں اپنی کہنے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ

فرشتوں کے بغیر، جسے خود فرشتوں سے کلام فرمانے میں، بافرشتوں کے واسطے ہے، جیسے پیغمبروں سے

ہی، ذلیل و خجست و سادقت کی آجائے، دق تعالیٰ، ذلّاس بات کا باطلہ دزم ہوتا جگلے ہے کہ میں کہ
اس طرح وہ راہیں، کونج کچے چلے آئے ہیں، دوائی سے پہلے ہو مقلد ہیں، ان ہی کا سامرا باطلہ
قولی و رسم معلوم ہو کر کہی قولی با وقت اور با کچھ پیل ہی مقلد ہیں، قولی ہی انکب و دواج ہے، یہ
منااس قول کا مشام واد و سب بیان فرماتے ہیں کہ، ان سب دانک پچھلے راہوں، کے قادرب
دکی نہیں ہیں، با ہم ایک دوسرے کے مشاب ہیں، اس لئے منکے بات میں ایک ہی س پیدا ہوتی، پھر
ذلائق اس قول کا جواب دینے ہیں، اور کچھ اس قول کا مشیر و اقلی حاکم محض مشاء، کو اپنے کو اس
لیاق پر ہم ہی ملا کر اور انہا کا بنانا چاہتے ہے، جو اصل ہی مذہبی المطلق ہے، اس لئے اس
احقاد بات کو نظر انداز کر کے حروف و رسم پر کجا جواب اور شاد ہو نا ہے کہ تم کو ایک دلیل کہنے
پھرے ہو، ہم نے تو مقلد ہی دلیلیں (دسالت محمدیہ کے ثبوت میں) حاص صاف بیان کر دی ہیں
و محروہ ان حروف کے لئے واثق و کافی ہو چکی ہیں، جو لیان اور اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں، راز
چونکہ محضر میں کو محض عناد اور کدی مقصود ہے اس لئے حق طبی کی نظر سے ان کو خشن ہی منظور
نہیں، سوالوں کی سلف و قشور کا کوئی ذمہ دار نہ ہے۔

فائدہ: یہ دور تصادمی اور ترقی کی کتب ہے، اس میں ادبی علم سے، اس کے باوجود جو لوگوں کو
 اٹھاتالی نے جاہل ستم اور قوس لے کر باوجود کچھ فلس اور دلائل کی کمر بستہ سے قاسم کیے گئے تھے
 پر کسی چرخہ فکر کے بارے ہے تھے جو بات نہیں تو اوروں کا قصہ اور یہ جاہلوں ہی کی بات کہ بلا جملہ
 دلائل قنایا لے کر کسی کی حادفت ۱۱

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ

بہارک، ہم نے تجھ کو بھیجا جو سہارا دینے والا اور دانا ہوا اور تجھ سے بڑھ چھاپیں دوزخ

الجبيل	١١
--------	----

Find a function f such that $f'(x) = 2x + 3$

خلاصہ تفسیر

چونکہ رسولی الہم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و حرمت تعالیٰ کا اظہار ہے ہر مسلمان کا

آپ کو اس جہالت اور غدار کی بدولت جو دین محمدی میں آئے اور ان کے ایمان نہ گئے

کی کوئی ضرورت سمجھ میں نہ آنے کے سبب آپ ملول و آزرہ خاطر ہو جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ

ڈالنے دے تھے اور آپ سے روزِ شنبہ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی، رکوان لوگوں نے کیوں نہیں منجول کیا، اور کیوں دروازے میں گئے آپ! ہاں تاکہ کرتے ہیں، آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے،

وَكُنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَسْبَحَ بِمَلَكُوتِهِ

اور ہو کر ان سے ہمدردی نہ کرے، یہود اور نصاریٰ جب تک تو کو ملے ہو ان کے دین کا،

قُلْ لَّيْسَ هُدَىٰ اللَّهِ هُوَ الْفُلْهُدَىٰ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هَمَزُجْدٍ

تو کہہ دے کہ یہ ہدایت نہیں ہے اور اگر باطن میں تو کا ہمدردی کرے انھی احمقوں کی بد

الذی یحاکمُونَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ دَلِيلٍ وَلَا كَلِيمٍ ۝

اس لئے کہ جو حکم کر رہا ہے، تو برا کوئی نہیں اللہ کے سامنے سے حاکم کرنے والا اور کلام

خلاصہ تفسیر : اسی میں غور نہ کریں کہ آپ سے یہ سب اور مذہب نصاریٰ جب تک کہ آپ دین کا راستہ اختیار نہ کریں، آپ کے مذہب کے وکیل (پروٹیکٹر) ہو جائیں اور یہ محال ہو

ہیں ان کا راضی ہو نا محال ہے، اور اگر کسی اور قسم کی بات الہی کی زبان یا حال سے شروع ہو تو، آپ رسالت (پیغمبر) کو دیکھنا، حقیقت میں چاہت کا قریبی راستہ ہو جس کو خدا نے اپنا

کارہائے امتیاز ہے، اور دلائل سے ایسا راستہ صرف اسلام ہونا ثابت ہو چکا ہے، پس راہِ ہدایت دیکھو، اور دیکھو کہ آپ خود راہِ ہدایت کے مذہب کے پیرو ہو جائیں محال اس لئے ہے کہ اس سے

ایک حال لازم آئے، یہ کہ اگر آپ الہی کے غلام یا غلام کا اتباع کرتے ہیں، جس کو وہ اپنا مذہب سمجھتا ہے، اور جو کچھ فرماتا ہے، اور کچھ منسوخ ہو جانے سے اب وہ بعض چیزوں غلامت کا مجموعہ دیکھیں، اور پھر انہی میں سے کسی حالت میں کہ علم قرآن ثابت باقی رہے، آپ کے بعد تو

وہابی حالت میں تو آپ کا کوئی خدا سے چالے والا نہ رہے، مذہب دیکھو کہ وہ تو یہ چیزیں فرماتا رہا ہو جائے کہ اسے اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ وہ الہی نصیحت سے دوام دہانے میں ناکام آپ سے

غیبت ہے، پس غضب محال ہے، اور اتباع مذکورہ سے لازم آئے، اس لئے اتباع مذکور میں محال اور بدعت امتیاز کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن، تو اب یہ امر کہ امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے

اس سے دل کو خالی کر لینا چاہئے !

الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمُ الْكِتَابُ يَتْلُوهُ سُبْحًا وَدُونَهُ ۚ وَلَكِنَّ مَعَهُ

وہ جو ایمان لائے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں سب سے پہلے اور اس پر ایمان لائے ہیں

وَهُدًى وَمِنْهُ نُورٌ فَادْكِبْكَ هُمْ الْخَيْرُونَ ۝

اور جو کوئی منکر ہو گا اس سے تو وہی دین نقصان پائے والے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر : اس آیت سے پہلے کہ آیت میں سامانی اہل کتاب کا ذکر اور مخالفین کے انجان سے علی مایوسی کا بیان تھا، اس کے بعد حسب عادت فرقہ انصاف

اہل کتاب کا بیان ہے، جن کو حق واضح ہو جانے کے بعد حسب وسوسہ منہل علی مذہبہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ کا اتباع غلط کیا اور اپنا مذہب (پسند) کیا، جس کو تو کتاب و احکامات و

اہل دین کے لئے ہدایت و نور کا ذریعہ تھا، اس طرح اس طرح کے روئے جس طرح تلاوت کا حق ہے، اگر قوت مذہب کو غیر مضامین میں صرف کیا، اور قوت دلائل کو منہاجہ حق میں استعمال کیا، ایسے لوگ

اہل آپ کے اس دور میں ہیں اور علی دین، پر ایمان لائے آئے ہیں، اور جو شخص زمانے کے کارکنانِ انصاف و اخلاص ہیں ایسے لوگ خسار میں رہیں گے کہ ان کا ایمان پر جو عزائم عطا ہوئے ہیں ان سے محروم رہیں گے !

يَسْبِقُ إِسْرَآئِيلَ إِذْ كُذِّرَ الْغَيْبِ الْبَاقِي أَنْ تَعْمَلَ عَلَيْكُمْ وَ

اے بن اسرائیل! اگر وہ امتیاز دینے سے محروم نہ ہو، تو یہ سب اور اس کو کہہ دینے

اِنْ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْغَالِبِينَ ۚ وَالْفُتُورُ اِيَوْمًا لَا تَجْعَلُ فِئْتَنَ

خویشامدی اہل حق پر، اور خود اس سے کہ حکم آئے کوئی منہاجہ کسی

عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلَ مِنْهَا عَدْلًا وَلَا تَنْقُصُهَا سَفَاحَةً ۚ

کی طرف سے تو بھی اور نہ قبول کیا جائے گا اس کی طرف نہ اور نہ کا اور اس کو سفاقت اور

لَا هُمْ يُنْقِصُونَ ۝

انہی کو نہ کمائیں !

خلاصہ تفسیر : اگر آپ آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق ہیں خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا اور فراموش ہوئے، اب ان مضامین کی ابتدائی تفسیر کے اجمال کے سامنے

آزمائشوں کے درپے اپنے فیصلہ کی قربت کر کے ان کے درجہات و مقامات تک پہنچا دیتا ہے، پھر اس جہ میں مغلول کر معصوم اور غافل کو نوکر کے بن کر ارشاد ہوا کہ اے ابوبکر! یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جلالت شان کو اور طاہر شہرہ اگیا۔

دوسرا سوال کہ اس میں عذاب سے ڈھانچا؟ اس کے متعلق فقہان مشرعیین میں حروف تسلط کا لفظ آیا ہے، اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضرات صاف پڑنا بعینہ کے متعلق قرآن میں یہی لکھا ہے کہ عذاب سے وہ جہیز و شہرہ میں شاد رہیں، کہیں نے یہ تین بظاہر ہیں، اور کسی نے ہر کو کو کہیں دوسری چیز میں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، وہ جہیز میں سب کی سب کی حضرت علیہ السلام کے مضامین امتحان تھے، افسر تفسیر اہل جریرہ اور اہل شہرہ کی بھی دانے ہے۔

ارشاد تعالیٰ کے نزدیک علی موشگ فیہ سے زیادہ، اسے معنائیں امتحان ہیں کہ تفصیل آگے بیان ہوگی وہاں کے ان خدائے مطلقہ کی راز کی غنایت خدی ہے امتحانات کی طرح علی مسلمان اور مانی کی تعلیمات ہیں، بلکہ اخلاقی قدروں اور عملی نایب تدبیر کی جائز ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ مطلق و مطلق میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علی موشگ فیہ نہیں، بلکہ علی اور اس کا حق پر تری ہے۔

اب ان معنائیں امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے
حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی خلقت کا علم غناس علما شہرہ دیا جائے، اس لئے ان کو سخت امتحانات سے گزار دیا، پوری قوم کی قوم کو اپنا خاندان سب کے سب بہت پرستی میں مبتلا تھے سب کے عہد و دوسرے مختلف ایک دین حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بار ان پر ہوا اگرچہ آپ نے بغیر اہل جرأت و ہمت کے ساتھ ہی غوث و خطر قوم کو خدا سے وعدہ کا طریقہ لاکر طوفان ہا، بہت پرستی کی شرفا کہ کسی خدائے مختلف عزائمات سے بیان نہیں عملی طور پر ہرگز خلاف چاہا، پوری قوم کی قوم کا مادہ جنگ و جدال ہو گیا، بارشاد وقت ضرور دلواس کی قوم نے آپ کو اس میں ہر حال کر لاندہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا، اللہ کے فضل سے اپنے سوا کہ رضامندی کے لئے ان سب جلا دیاں پر اس پر کر لے آپ کو اس میں ڈال دینے کے لئے پہلی کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل کو امتحان میں کامیاب پا کر آپ کو رحم و ہمدردی:

لَقَدْ أَنذَرْنَاكَ لَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّكَ لَأَمَّا لَئِنْ لَمْ تَنصَحْ لَأَنْتَ مِنَ الْمُنْصَحِينَ
تعالى (البقرہ ۱۲۹-۱۳۰)
میرے بھروسہ پر ہے کہ اگر آپ نے نصیحت نہیں کی ہوتی تو میں نے آپ کو نصیحت کرنے والا بن دیتا۔
جو وقت جسکے خداوندی انہی ضرور کے متعلق ان کو فراموشی کے الفاظ عام تھے، کس خاص کی

کی نہیں کر کے کچھ نہیں دیا تھا، اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس پر خداوندی کے آگے ہی اپنی چمک چمک کر مٹا دی، برقی، اور بارشادوں میں اس مذکورہ کا فروغ کر شہرہ کی چمک چمک شہرہ میں لفظ ہنر کے ساتھ لکھا تھا اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی شہرہ کا خداوندی سے جڑے جاتے تو وہ بھی ہر وقت کی طرح شہرہ، بلکہ ہر ملک ہو جاتی ہے، اگر لفظ سلاطین ارشاد ہوگا تو ان میں خداوندی ہر وقت کی طرح ایسی شہرہ ہو جاتی ہو جائے خود ایک عذاب بظاہر ہے چہ میں ایک عذاب دوسرے کا بھی ہے۔

اس امتحان سے خلاص ہو کر دوسرے مقام پر لایا گیا کہ اپنے اصل وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کرنا میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رعنا سے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی ٹیرا دیکھ دیا، اور دین الہی و عیالی ہجرت کر کے شام میں چلے آئے!

آپس کو کڑا سناخت جاں راج کند
شہرہ زور و مال و خاندان راج کند

اب قوم وطن کو چھوڑ کر ملک شام میں قیام کر لیا یہ خداوندی کے حکم ملا کہ لی لی ہجرت ہونا شہرہ اروا کی شہرہ راج ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کر لیا اور کثیرا کثیرا ہجرتیں امنیں آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر پہلے راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آئی تو حضرت خلیل فرماتے کہ یہاں ٹھہرا جا جا، جہیز خیر فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے ہو جب وہ خشک جہاں اور گرم و گھسان آ گیا ہے جہاں آگے کسی وقت بہت امتد کی تعمیر و تہیہ تک کی جی بٹا مقرر تھا، اس جہستان میں آپ کو اور دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اپنے پروردگار کی محبت میں سرور دین میں شہرہ بیان اور آپ کو دیکھا، اگلے میں لی لی کے لئے حکم ملتا ہے جسے یہ امتحان پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ لی لی اور یہاں کو سبھی چھوڑ دیں اور خود ملک شام کو واپس ہو جائیں، اللہ کا حکم حکم آئے جسے اس کی تعمیل میں آگے نہ بڑھنا ہے، اور شام کی طرف روانہ ہو جائے، تعمیل حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ پوری کو یہ افلاک ہی دے کر بھیجے جو کہ خدا کا یہ حکم ملتا ہے اس لئے میں بار بار، حضرت ہاجرہ علیہ السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو بچاؤتی ہیں، مگر آپ جواب نہیں دیتے، پھر بچاؤتی ہیں اور کہیں ہیں کہ اس دن روئے میدانی میں آئیں چھوڑ کر یہاں جا کر ہوں اس کا بھی جواب نہیں دیتے، شکر و باری کی بھی تعلیم اللہ کی لی لی میں بھیجے کہ مگر آئیے، اور دیکھیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ملتا ہے، آپ نے فرما دیا کہ ہاں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی جب کہ خداوندی کا حکم ہو گیا، تو نہایت لطیفان کے ساتھ فرمایا کہ جاتے ہیں

ناک نے آپ کو چلے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہمیں جس ضابطہ نہیں کرے گا۔

اب حضرت باذہانتہ شیرخوار ہیں کہ ساتھ اس حق ووقی منجمل میں وقت گزرتے گئے ہیں۔
 سیاسی کی شدت بالی کی تلاش پر مجبور کرتی ہے، بچے کو کھیلے میں لاتی ہیں جو کہ ہمدردی کی پہاڑی ہے
 پر بار بار دہانتہ اتنی ازلی کہ کہیں بالی کے آثار نظر آتی ہو، بالی کو انسانی نظر آجائے، جس سے کہ ہمدردی
 حاصل کرے، اسلٹ ٹرن کی دھڑ دھوپ کے بعد ماہر ہو کر بچے کے پاس ٹوٹ آتی ہیں، ہمدردی
 کے دو مہمان سات مرتبہ دوڑنا ساسی کی یاد گاہ کے طور پر فیما بین آئے والی اسلٹوں کے لئے احکام
 جی ج میں ضروری شہداد دیا گیا ہے، حضرت باجزاء علیہ السلام اپنی دھڑ دھوپ ختم کرنے اور بچہ
 ہونے کے بعد جب بچے کے پاس آتی ہیں تو بہت حوازدی ملاتی ہیں، جرنیل امین آتے ہیں، اور
 اس خشک، دلچسپان کی زمین سے بالی کا ایک تہہ حال بیٹے ہیں، جس کا نام آج نوزم ہے، بالی کو کچھ
 اذلی جانور آجاتے ہیں، ہیر جانور کو کچھ کہہ کر انسانی پہنچے ہیں، اور مکے کی آبادی کا سامنا ہو جاتا ہے
 ضرورت زندگی کی کہ آسانیاں ہوتا ہو جاتی ہیں۔

[illegible]

وَلَمَّا جَاءَهُمْ مُعْتَدِلُ الثَّلَاثِ وَمِنْ أَمَامِهِمْ كَذَبُوا
 بَيْنَهُمْ ذِي أَرْبَعٍ مِنَ الْمَتَابِعِ فَأُبِيحَ لَهُمْ
 أَنْ يَضِلُّوا فِي أَرْضِهَا سَآءَ الضُّلُّوا
 فَلَمَّا تَابَا مِنَ الْبُغْيَانِ وَالْكُفْرِ وَتَوَّضَعَا
 لِقَاءَ رَبِّكَ فِي الْمَقَابِلِ
 وَتَوَلَّى عَنْ وَرْدِكُمْ عَنْكَ إِفْرَاغٌ
 لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 فَتُحْبَضُوا مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ
 فَتَقُولُوا مَا خَالِفٌ
 فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُعْتَدِلُ الثَّلَاثِ وَمِنْ أَمَامِهِمْ كَذَبُوا

[illegible][illegible]

یہ کمرے اور سخت مقامات تھے جہاں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو گذرنا گیا۔ ان کے ساتھ خود دوسرے بہت سے اہل و احکام کی باندہاں آپ پر قائم رکھیں، ان میں سے دس صحابی فطرت کے نام سے موسوم ہیں جن کا تعلق بدین کی مقامی و مشرانہ اہل دین سے ہے اور یہ خاصاً ہی فطرت کے نام والی تمام انہوں کے لئے یہی مشعل احکام بن گئے، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان تمام امور کے لئے یہی تاکیدیں احکام دیئے۔ اور پھر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں یہی لفظ لکھ لکھ کر دیا اسلام فتح حصول میں دھڑلے سے جس میں سے دلی سوز و برکت میں غرق ہوئی اور دوش سوز و احزاب میں اور دوش سوز و محزون میں، حضرت امیرا علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کا پورا پورا ادراک کیا، اور ان سب مقامات میں پورے ان کے اندر کا مایاب رہے۔ سورہ برات میں موشن کی صفات بیان کرتے ہوئے صلوات کی دلی خصوصیات و صفات کا اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

[illegible]

اور سورۃ مؤمنوں کی دس صفات یہ ہیں

تو اچھے ہیں جو توہم کر کے لوگوں کو گمراہ کر دے
مگر جو لوگ اسے دور نہ رکھیں وہ لوگ بھی گمراہ
کر دیں گے، جبکہ باقوں کی تعلیم کر کے لوگوں کو
اور بری باتوں سے روکنے والے اور اللہ
کی حمد و کائنات کی تحسین کرنے والے اور اچھے
مؤمنین کو آپ خوش نصیبی
سننا دیجئے :

مہینہ ان مسلمانوں نے علاج پانی جراہی نہ
میں شروع و ختم کرنے والے ہیں اور جو

ان کے دل میں استغیث اور دعا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں بھیڑ کر رکھا ہے جانے کا حکم دیا ہے
تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ہے۔
اس کو سب سے بڑا اجر ہے فرمایا کہ تم پر شرف سے چاہیے، میں نے آپ کو یہ حکم دیا کہ
وہ میں بھی ضائع نہ کرے گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کر گئے ہرگز
مگر شیروان بھارہ اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستہ کے ٹوڑے پہنچے جہاں سے حضرت
ابراہیم علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی جو سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵
میں اس طرح مذکور ہے

وَرَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا
طَيِّبَةً رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا
طَيِّبَةً رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا
طَيِّبَةً رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا

پھر دعا میں عرض کیا
وَرَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا
طَيِّبَةً رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا
طَيِّبَةً رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا
طَيِّبَةً رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَّتًا

سارے حکم میں کہ ہمارے پر شام سے ہجرت کر کر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ
یہاں لایا گیا تھا اس میں یہاں والدہ اور اس کے ہمراہ تھے کہ آپ کو دعا، حضرت اسماعیل علیہ السلام
والدہ کو دعا دے کر کہیں سے ملاوے ہو کہ اس کو لایا ہی کی خواہش اور رنگ لے کر بھی پاک
دعا مانے اور اسی خواہش کو ترک نہ کرے کہ میں فرمایا کہ میں مقصود ہے اس لئے یہاں شہر کو
دور مابین مسند مابین میں آؤں تو اس کی طرف سے ہرگز نہ رہے اور جاتے اس ہونے کی دعا
فرمائی پھر دعا کی کہ سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۲۵ سے چاہیے کہ سورہ حضرت اسماعیل علیہ السلام
علیہ السلام کو معرفت حق تعالیٰ کا اور مقام حاصل تھا میں ان شان کو پہنچا دینا اور ان کے لئے
اپنے تمام افعال و اعمال اور اوروں کو یہ سکون کرنا کہ سب پر حق تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں
اس کی شہادت و اقرار سے سب کا ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ ترک شریعت سے بیت اللہ کو پاک رکھنے

جو حکم ملا تھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے امداد و طلب کی اس دعا کے اندر کہ وہ ترک شریعت سے محفوظ رہے
کی تھا، میں ایک خاص ملازم میں ہو سکتا ہو کہ جب بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا تو یہ اہل
میں تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ میں نہ ہو کہ وہ بتائے، اور اس طرح شریعت میں
مستحکم رہا، اس لئے یہ دعا فرمائی کہ کہہ کر اور میری اولاد کو ترک شریعت سے محفوظ رکھا جائے،
اس کے بعد شیروان بھارہ اور اس کی والدہ پر شرفقت کے چلنے نکلنے سے دعا فرمائی کہ میں نے
ان کو آپ کے حکم کے مطابق اس آپ کے حکم میں رہنے کے پاس مضبوطی ہے کہ میں نے جگہ زراعت کے
قابل بھی نہیں جہاں کوئی اپنی قسمت سے ضرورت یافتہ زندگی حاصل کرے، اس لئے آپ ہی اپنے
فضل سے ان کو یہاں کاروبار میں ملانے دیں،

ہر دعا کے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام فرماتے، وہی تمام کی طرف رواں ہو گئے، اور
حضرت ابراہیم کا کہ وقت قرآن پڑھا اور پانی کے ساتھ کٹ گیا، جو حضرت اسماعیل علیہ السلام
تھے، اپنی خیم ہونے کے بعد وہاں کہ پاس سے یہاں اور شہر ابراہیم کی اس وقت پانی کی خوش
میں ان کا نکلتا اور کہیں کو ہمارے گھر میں کوہر پر چڑھنا اور ان دونوں کے درمیان دوڑوڑ کر
راستہ طے کرنا، اگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سامنے آجائیں، مام مسلمانوں میں معروف ہے اور ان
میں مقارنہ کے درمیان میں کرنا آجنگ اس کی یادگار ہو۔

اس قسم کے آخر میں حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ دعا ان کی والدہ اور شہر میں پہنچا دی
کرنا اور یہاں تیسرے جہیز کے چکر لگوانا کہ یہاں ان کے مرنے پر نا ابراہیم حضرت اسماعیل علیہ السلام کے
ہوئے ہونے کے بعد قبیلہ جہیز کی ایک بی بی سے شادی ہو جائے، یہ سب سچ بھاری کی روایت
میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، روایت حدیث کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سے
حق کی گیت میں جو بیت اللہ کو رکھ کر اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام
اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ
آپ کو رکھا جائے، اس کے مقابلہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، یہی کہ انھیں
علیہ السلام اسی شہر خوراسی کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیر ہر ایک کو مدعا
سورہ بتو کہ آیت جو اس وقت ذرا نظر سے دور تھی، گاؤں گاؤں ایسا جہیز و خاندانوں کی طرف
نہایت ہی میں حضرت ابراہیم کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی نہ کہ کر لایا گیا ہے،
یہ کہ اس وقت کا ہے جب کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جان اور تائی ہو چکے تھے، اس وقت
دونوں کو بیت اللہ کا حکم دیا گیا۔

صحیح بھاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیات حضرت ابراہیم

مرد و دو قصاص جاری کر جائیں گے (۱) حکام اہل حق و عدل سے کہیں کہیں جو کسی کو بھوکے
فرمان کریم کا ارشاد ہے:

فِي الْبَيْتِ شَيْءٌ لِّكَوْنِهِ شَيْءٌ لِّعَلَّكُمْ

۱۵۱ (۲) شے جو گھر میں ہے تاکہ تم کو معلوم ہو

اہل بیت میں ایک منزلہ امتزاجی ہے جس میں خلعت فیہ بکرم وہ ہے کہ کوئی شخص یا ہرے جرم کر کے
حرم میں نہاں نیلے قراس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اس میں بعض امراض پر حرم میں
حدود و قصاص کی سزاؤں جاری کرنے کا حکم دینے میں اور امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس کو
سزا سے چھوڑنا تو نہیں، کیونکہ اگر یہ کیا تو حرم کے سزا سے بچے کو راستہ کھل جائے گا، اور امام
ہیں فساد پر باوجود جائے گا، اور حرم پر جرموں کا شکا نامیں جانے گا، لیکن احترام حرم کے سبب حرم کے
اندرون زادی جائے گی کہ اس کو رکھ کر یا بھگتا کر حرم سے باہر لے جائے گا، وہاں سے نکلے گا، اور اگر چاہے کہ

۳۔ ذَا لِحَدِّكَ وَابْنِ شَقِيمٍ ذِیْ جَرَسٍ شَقِیْقٍ اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ ہے
جو جس پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کا بطور تجرہ نشان چڑھا
تھا، اور میں کو تعمیر بیت اللہ کے وقت اپنے بہنوئی کیا تھا شیخ بخاری

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
قدم مبارک کا نقش دیکھا ہے، مگر لوگوں کے کثرت بھرنے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان
بچا ہر جگہ ہے (قرطبی)۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی
منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، لیکن پھر کہ اس سے مراد یہ جو کھلوٹات کے بعد کی دُور
رکعتیں ہیں کہ مقام ابراہیم پر چڑھنے کا حکم آیا ہے، اس کی جگہ کی تعمیل ہونے پر حرم میں کسی
جگہ جس پر رکعتیں پڑھنے سے ہونا نہ لگے، اس پر رکشہ نجاست متعلق ہیں۔

۴۔ آیت مذکورہ میں مقام ابراہیم کو معصی بنانے کا حکم ہے اس کی وضاحت خود رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح اوراق میں اپنے قول و فعل سے اس طرح فرمادی کہ آپ طواف کے بعد
مقام ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے ٹھوڑے فاصلے سے دکھائی دے، وہاں پہنچ کر
یہ آیت تلاوت فرمائی، ذَا لِحَدِّكَ وَابْنِ شَقِیْمٍ مقام ابراہیم پر پہنچنے پر یہ آیت ابراہیم کے چپے
اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ مقام ابراہیم کو دیکھا میں رکھے ہوئے بیت اللہ کا استقبال ہو جائے
رجوع میں اس لئے فقہاء بیت اللہ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقام ابراہیم کے چپے متصل جگہ نہ ملے وہ
کتنے ہی فاصلے پر بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقام ابراہیم کو اس کے سامنے دے دے اور بیت اللہ کی
قراس منہ کر کے رکھی جائے گی۔

۵۔ اس آیت سے ثابت ہو کہ کھلوٹات کے بعد کی دُور رکعتیں واجب ہیں اور قصاص ونا سک
ملاحظہ فرمائی

ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مقام ابراہیم کے چپے اور اگر اس وقت پورا حرم میں کسی دوسری جگہ
بھی اور اگر سے کوئی ایسا ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے
سے متصل پڑنا سنا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی روایت ہے، پھر ہنا منقول ہے (ابو حنیفہ)
اور معنی کاغذی سے کتاب مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں، اور سنت ہے
یہ کہ مقام ابراہیم کے چپے اور اسی جگہ میں رکھی جائے، وہاں ادا کر کے پھر حرم میں داخل ہو کر
پھر چاہاں کہ جس میں پورا رکعتوں سے واجب ادا ہوتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
چلا اور اربعین حضرت ام سلمہؓ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا
تو مسجد حرام منگھڑکے مکہ سے نکلے گئے، بعد ازاں وہاں دو رکعت خرم سے اہل و عیال کے ساتھ
نزدیک کوئی مقام بھی واجب نہیں ہوتا، صرف اہم اہم رکعتوں کے قائل ہیں، ونا سک ملاحظہ فرمائی

۱۔ تَلِیْقُ رَجُلٍ رَاجِعٍ اس میں بیت اللہ کو چمک کرنے کا حکم ہے جس میں ظاہری نجاست
اور منگھڑکی سے طہارت بھی داخل ہے اور باطنی نجاست کفو شرک اور اظہار ذلہ و نقص و حسد
خمس و ہجو و کبر و غرور و دیا و نام و نحو سے پاک بھی شامل ہو اور اس میں کمال طہارت کیلئے لفظ تلیق
میں اس طواف بھی اضافہ ہے کہ یہ پھر تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیت اللہ پر
ہیں کہ اور شاد ہے، (ابن ابی شیبہ) ذَا لِحَدِّكَ وَابْنِ شَقِیْمٍ (۱۵۱، ۱۵۲)

حضرت فاروقی علیہ السلام نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا: جو میں نے نہیں کر سکا
کھڑے ہو (قرطبی) لیکن چونکہ ارب و احرام چاہئے، اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنا چاہئے،
ملاحظہ ہو کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی نجاست سے پاک کرنا
منزور ہے، اس طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے
والوں پر قسم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی تمام نجاست اور دیگر نجاستوں سے پاک کرنا
بیکس اور اپنے دونوں کمر و شرک و فحشاء اور تمام اسلاف و ذلیل و بکرم، بغض و حسد و دیر و طیور
کی نجاست سے پاک کر کے داخل ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی
شخص نہیں پسند فرمے گا کہ وہ مسجد میں نہ جائے، اور مسجد سے کچھ دور والوں کو مسجدوں میں
داخل کرنے سے منع فرمایا ہے کہ ان کی نجاست کا کھلوٹا نہ جائے۔

۷۔ بَشَّارًا لِّلْمُنَافِقِیْنَ ذَا لِحَدِّكَ وَابْنِ شَقِیْمٍ اس میں کھلوٹات سے چند احکام و فرائض
ملاحظہ ہوئے، ازاں یہ کہ بیت اللہ کا قصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، اور دوسرے یہ کھلوٹات

تاؤ سے منہم ہے رکاردی ان میں عباس آئیں یہ کہ مطروب عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طہا
بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے منہم میں ہو
بالکل رجساس

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَارِنُزْ مِنْهُ
اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب یہاں کو خیر امن کا اور روزی دے اس کے لئے
مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ
اور ان کو جو سے جو کرے ان میں سے اہل حق اللہ اور قیامت کے دن فرمایا اور
كَفَرَ فَأَتَيْنَاهُ فَلْيَلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ
کفر یہ اس کو بھی پہنچا دینا کہ اس کو نہ دے وہ توں پھر اس کو جہنم میں ڈال دے عذاب میں اور وہ
التَّعْصِيۡۃُ ۚ وَلَئِنَّ يَرۡءَۤیۡہُمْ اِلَّا رِجۡۢا اِطَاعَہٗ ثُمَّ اَبۡرَہِیۡمَ خَآذِلَہٗ اِلٰی
بڑی طرح سے دیکھ کر اور یاد کر جب اٹھائے تھے ابراہیم بنادیں خاذلہ کی اور
اِسۡعٰیۡلَ کَاۡرِبًا تَقَبَّلَ مِنۡہَا اِنَّکَ اَنْتَ الۡیَمِیۡۃُ الْعَلِیۡمُ ۝ رَبَّنَا
وہمیں، عاقل تھے اور یاد رکھنا توں کہ جس سے جگہ نہیں رہتے والو عاقلے واہ اور یاد رکھنا
وَاجْعَلْنَا مِیۡمٰتِیۡنَ لَکَ وَمِنْ دُرِّیۡنَا اُمَّةً مُّسٰلِمَہٗ لَکَ ۝
ہمارے اور تم کو حکم ہو اور اپنا اور ہماری اولاد میں جس کو ایک جماعت فرما خود اپنی
وَاَرۡاٰنَا یَسۡکِنَا وَتُبَّ عَلَیۡہَا اِنَّکَ اَنْتَ الْوَّابِ الۡرَّحِیۡمُ ۝
اور دیکھ کر کہ تم نے اس کو سکھانے کی اور ہم کو سکھانے کی جگہ فری ہو تو یہ قبول کر ہمارے ہمارے

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے
روما میں اعرین کہا کہ اسے میرے پروردگار اس موقع کو ایک دعا اور
شہر بنا دیجئے اور شہر بھی کیسا امن والا اور اس کے لئے دعاؤں کو پہلوں کی قسم ہے جس
عاقبت پیچہ راور میں سب لئے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص ان کو کہتا ہوں، جو ان میں امن و امان

خلاصہ تفسیر
روما میں اعرین کہا کہ اسے میرے پروردگار اس موقع کو ایک دعا اور
شہر بنا دیجئے اور شہر بھی کیسا امن والا اور اس کے لئے دعاؤں کو پہلوں کی قسم ہے جس
عاقبت پیچہ راور میں سب لئے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص ان کو کہتا ہوں، جو ان میں امن و امان

چلاور روز قیامت یہاں، کچھ بول رہے ہیں کو ایک، جانیں اسی تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو کچھ
روزی تھا اس میں نہیں ہے اس لئے عزت مسکو، دن کا موسم کو جس باور اس شخص کو کہی جو
کا کر رہے والے نہ خلت آخرت کہ کہی ایمان کے ساتھ خاص ہی اور اس واسطے لئے شخص
وچہ کر کا فر، یہ انھوں نے روز زمین و آسمان، تو خوب آرام برتاؤں گا وہیں پھر ابراہیم و اسکا
کشتان کشاں عذاب و روز میں بہتادوں گا اور اسی کی جگہ تو بہت بڑی ہے اللہ چاہے اور
وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے رب خدا کی اور ان کے
ساتھ اسٹیل علیہ السلام بھی اور میں کہتے جاتے تھے کہ اے میرے رب یہ روز رکھو اور نہایت اہم سے
بول فرما دیجئے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جانتے ہیں جسے ہماری دعا کو سنتے ہیں ہمارے بچوں
کو کہتے ہیں، اے میرے رب یہ روز رکھو اور ہم روزی میں دے کر گئے ہیں کہ ہم کو اپنا اور یاد
میں باپ کے اور ماں کی اور اللہ سے ہے ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی طبع پر اور دروس
ہم کو کہتا ہے (درجہ) کے احکام میں بند کیجئے اور اسے حال پر ہماری کے ساتھ توجہ رکھئے اور
لی تعقیب کہہ رہے ہیں توجہ فسرانے والے، ہر حال کرتے والے۔

معارف مسائل

حضرت غلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشکِ راہ میں فسرانیاں دیں، حال و حال
اہل رحیمال در خواہنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعویذ احکام و دہائی میں مساحت
کے چکرانے چلے گئے وہ عجائب و دگر میں سے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی رحیمال پر شہادت و محبت ایک طبع اور فطری امر ہونے کے ساتھ
عقل دانی میں ہے، مذکورہ بعد آیات میں کامل ہیں، تاہم اس لئے اہل دہائی کیلئے دین دنیا
کی کائنات روحت کے لئے دماغیں ملتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دہائی و دعا کو شروع لفظ سب سے کہا ہے، جس کے معنی ہیں اے میرے
پائے والے اے ان الفاظ میں دعا مانگنے کا سلسلہ صحابہ ہے، کہ خود ان الفاظ تعالیٰ کی رحمت اور
لطف و کرم کو مستحق کرنے پر مؤثر و دہائی میں، پھر سب سے پہلی دعا یہ فسرانیاں کہ اس میں شہل میدان
کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لایا ہے آپ ایک شہر بنا دیں
تاکہ میں ان کی سکونت میں آؤں کہ وحشت و ہوا در ضرر و بابت زندگی کا ساقی میرے آجائیں، یہی دعا
سورۃ فرقان میں خلت الایمان آیت کے الفاظ سے آتی ہے، جس میں اللہ کی تعریف نام کے ساتھ ذکر
کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں مقرر کیا گیا ہے، فرق کی وجہ غالباً ہے کہ پہلی دعا جو آیت

تاوے منہ سے رکاوڑی ان میں عباس آئیں یہ کہ مطروب عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طہا
بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے منہ سے ہو
بالکل رجساس

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ
اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب یہاں کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے لئے
مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْكُمْ وَاللَّهُ يَسْمَعُ الْخُسُوفَ قَالَ وَمَنْ
والوں کو جو سے جو کرے ان میں سے اپنا حصہ اللہ پر اور قیامت کے دن یہ فرمایا اور
سَمِعَ قَائِمَتُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ
کرنے اس کو بھی طبع بچا دینا کہ تھوڑے دنوں میں اس کو جہنم میں ڈال دے عذاب میں اور وہ
التَّعْصِيَةِ ۖ وَلَئِنَّ يَوْمَهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ الْفَوَاعِیْدُ مِنَ الْبَيْتِ وَ

بڑی طرح سے پہنچے اور یاد رکھنا کہ اچھے سے ابراہیم بنادیں خادکس کی اور
اسْتَعِیْلَ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِیعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا
وہمیں، عاقلانہ تھے اور یاد رکھنا کہ یہ جگہ نہیں رہنے والا جائے واہ اور یاد رکھنا
وَاجْعَلْنَا مِمَّنْ يَنْتَصِرُونَ ۖ لَكَ وَمِنْ دُونِنَا مِثْلُ مَثَلِهِ ۖ لَكَ
بنا اور کہہ کر جو حکم ہو وہاں اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرما خود ارادگی
وَأَرْأَمْنَا لِنَكُنَّ مِنَ الْعٰبِدِیْنَ ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّوَابُ الرَّحِیْمُ ۝
اور یاد رکھنا کہ تھوڑے دنوں میں اس کو جہنم میں ڈال دے عذاب میں اور وہ

خلاصہ تفسیر
اور ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب یہاں کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے لئے طہا
اور ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب یہاں کو شہر امن کا اور روزی دے اس کے لئے طہا
شہر بنا دیجئے وارہر بھی کیسا امن والا اور اس کے لئے دعاؤں کو قبول کرے کہ میں بھی
عاقبت بچے اور میں سب اپنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص ان کو کہتا ہوں جو ان میں امن و امان

چلا اور روز قیامت یہاں کھینچے ہوں زانیوں کو ایک جائیں امن و امان کے اور ابراہیم فرمایا کہ جو کچھ
روزی تھا اس میں نہیں ہے اس لئے عزت مسکو، دن کا موسم کو بھی یاد اس شخص کو بھی جو
کا کر رہے والے نہایت آخرت کے چکر لہاں کے ساتھ خاص ہی اور اس واسطے اپنے نفس کو
بیچ کر کافر ہو، انھوں نے روز زمین و آسمان، تو خوب آرام برتاؤں گا وہیں پھر ابراہیم مرگ ہوا
کشتاں کشاں عذاب و روز میں پہنچاؤں گا اور اس کے لئے کی جگہ تو بہت بڑی ہے اللہ بچا دے اور
دو وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہوا ایک اٹھارہ گھنٹے اور دوسرا عید السلام و ہمارے خادکس کی اور ان کے
ساتھ اسٹیشن علیہ السلام بھی اور میں کہتے جاتے تھے کہ اے میرے رب یہ روزی دے اور وہ نعمت ابراہیم سے
بہرہ فرما دے، بلاشبہ آپ خوب سمجھنے والے، جانتے دہیں اور ہمارے عاقلانہ تھے ہیں ہمارے
کو بچانے ہیں، اے میرے رب یہ روزی دے اور وہ روزی دے میں دے کر کہ ہم کو اپنا اور یاد
میں بنا دیجئے اور یاد رکھنا کہ اس میں ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی طبع پر اور دوسروں
ہم کو بچانے کے (درجہ کے احکام) میں سزا دے اور اسے حال پر رہاں کے ساتھ توجہ رکھئے اور
لی تعقیب کہہ رہے ہیں توجہ فسرانے والے، ہر حال کرتے والے۔

معارف مسائل

حضرت غلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشکِ راہ میں فسرانیاں دیں، حال و حال
اہل رحیمال در خواہنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعویذ احکام و دہائی میں مساحت
کے چکرانے چلے گئے وہ عجب و دگر میں سے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی رحیمال پر شفقت و رحمت ایک طبع اور فطری امر ہونے کے ساتھ
عقل دہائی میں ہے، مذکورہ بعد آیات میں کامل ہیں، انھوں نے اپنے اہل و عیال کیلئے دین دنیا
کی کائناتِ راحت کے لئے دعا میں لگی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا
اور وہ شروع لفظ سب سے کہا ہے، جس کے معنی ہیں اے میرے
پائے والے اے ان الفاظ میں دعا مانگنے کا سلیقہ صحیح ہے، کہ خود ان الفاظ تعالیٰ کی رحمت اور
لطف و کرم کو مستحق کرنے پر مؤثر و دہائی میں، پھر یہ کہ پہلی دعا یہ فسرانیاں کہ اس میں پہل میدان
کو میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لایا ہے آپ ایک شہر بنا دیں
تاکہ میں ان کی سکونت میں آؤں کہ وحشت و ہوا در ضرر و بابت زندگی کا ساقی میرے آجائیں، یہی دعا
سزا دہائی میں خذلان لایا آیت کے الفاظ سے آتی ہے، جس میں اللہ کی تعریف نام کے ساتھ
کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں عزت کہتا ہے، فرق کی وجہ غالب ہے کہ پہلی دعا جو آیت

نرات ہیں اس طرح شہادت تک میں تمام ضروریات زندگی داخل ہو جاتی ہیں اور حالات و
 واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ اپنی حرم کو رکاوٹ کی زمین بنا جا کر
 منعکس کر دی، لیکن دنیا نصیب میں سبب سونے والی اور پٹنے والی چیزیں ہیں عام طور پر غلطی
 ہیں اور یہ بات شاید کچھ بھی کسی بڑے سے بڑے جبار کی یا صفی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دنیا میں
 معنوعات کثرت و کمال و دامن مل جاتی ہیں۔

سید علی شہید کہتے ہیں اس آیت میں جبکہ اہل مکہ کے لئے اس اور فریضہ کی دعا کی ممتن، تو
 ان میں مومن کا فرض داخل ہے اور اس سے پہلے حضرت غنبل اللہ نے جب ایک دعا میں
 اپنی ہر ذریعہ کو بجز ہمت سے بجز مومن کا فرض کیا تھا تو حق تعالیٰ کی طرف سے بے لوث شادیاں تھیں
 بدعا مومنوں کے حق میں قبول ہے۔ حالانکہ مشرکوں کے حق میں قابل قبول نہیں، وہ دعا بھی آواز
 افتخار کی، حضرت غنبل اللہ علیہ السلام کو جو مقام غلت پر نازل اور خضبتہ اللہ سے لبریز تھے اس
 بیکرہ است آرائی فرمائی دعا میں یہ قید لادی کہ یہ دعا خوش حالی اور اس دامن کی دعا معروف
 نورانیوں کے لئے کرتا ہوں حق تعالیٰ کی طرف سے اس شہادت و حجت لایا کہ حق تعالیٰ اور فرمایا
 تو منقشہ نہیں ہوا، البتہ مومنوں کو یہ خوش حالی اور ادا فضلی فرمائی ہم بھی اہل مکہ کو خطا کریں گے اگرچہ وہ
 ظالم مشرک کے کا فر ہیں ہوں، البتہ مومنوں کو یہ خوش حالی میں طرح و دنیا میں دی جائے گی اس طرح
 آخرت میں بھی عطا ہوگی اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

ابن جبہ جل جلالہ اور ابی نعیم نے کہا، حضرت غنبل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم ربانی کی
 نعت دیکھ کر اپنے کی تعمیل میں ملک خاتم کے ہرے ہرے عیش منظر خط کو چھوڑ کر کھڑکھڑ
 کے خشک پہاڑوں کے دریاں اپنے اہل دیال کو لڑا، اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری امانت
 خرچ کی، یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہد کے دل میں غلب پیدا ہوتا تو وہ اپنے دل کو
 بہت کمال میں فخر سمجھتا، لیکن یہاں حضرت غنبل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، وہ عورت کی
 باگ و عورت و جمال کو پہچاننے والے ہیں کہیں انسان سے اللہ تعالیٰ کے شاہان شانِ مہابت و عظمت
 کا نہیں ہر شخص اپنی قوت و دست کے مقصد سے کام کر لے، ہاں نے ضرورت ہے کہ کوئی بھی
 بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر ناز نہ کرے، بلکہ احوال مذاوی کے ساتھ دعا کرے کہ میرا یہ عمل
 قبول ہو جائے، جبکہ حضرت امام علیہ السلام نے بنا بہریت اللہ کے عمل کے متعلق یہ مافوقی
 کہ اسے ہائے پروردگار آپ جانے اس عمل کو قبول فرمائیں، کیونکہ آپ کو سننے والے اور دیکھنے
 والے ہیں ہماری دعا کو سننے میں اور ہماری جنوں کو دیکھتے ہیں، یہ دعا بھی اسی معرفت و شہادت کا نتیجہ ہے جو حضرت غنبل

ذکر اللہ تعالیٰ کا شہادت ہے، یہ دعا بھی اسی معرفت و شہادت کا نتیجہ ہے جو حضرت غنبل

کو حاصل تھی کہ خاص و فرما نہر وادی کے بے مثال کارنامے سے ہولانے کے بعد بھی یہ دعا کر کے نہیں
 لاکھ دوڑوں کو اپنا فرمانبردار بنا لیجئے، وجہ یہ کہ کہیں کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہو
 انسان اس کا یہ احساس بڑھتا جاوے، کہ یہ حق و داد وادی اور حق فرمانبردار ہی ہوا اور انہیں کر رہے
 ہیں، نہ کہ یہ حق تعالیٰ کا ہے، وہاں بھی اپنی اولاد کو شریک نہ لے لیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
 اللہ والے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور دار و لاکھ و ستر ہائی پیش کرنے سے بھی روچہ نہیں لگاتے کہ
 اپنی اولاد کے حق میں قربت ہو جائے، مگر اس بہت کے کچھ فضول کو یہ یاد کرتے ہیں چنانچہ
 عوام کی دماغی نہیں علم کو اولاد کی صرف قربانی محبت و راحت کو جانتے ہیں، ان کی ساری خوش
 راحت کسی کے گروگوشتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جانتے ہیں کہ زیادہ روحانی اور دنیوی
 سے زیادہ آخری راحت کی فکر کرتے ہیں، اس لئے دعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک بھائی
 کو میرا فرمانبردار بنا دیے، اپنی لذت کے لئے دعا میں ایک محبت اور بھی ہے کہ میرے شاہد کو
 کہ لوگ قوم میں بڑے مانے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے راستہ پر قائم رہو تو عوام میں ان کی
 مقبولیت فخری ہوگی یہاں کی صلاحیت صلاح عوام کا دوزیہ بنتی ہے (بہر صوبہ)

حضرت غنبل اللہ کی دعا میں قبول ہوئی کہ آپ کی لذت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہیں
 جو بچپن ہی سے قائم رہا اللہ کے سسرال پروردگار سے تھے، جاہلیتِ عرب میں حکم ربی دیکھ کر ہر
 صوبہ کو شریک دین پرستی سے گھبراہٹ تھا اس وقت اولاد ہر آدم میں ہیشہ کر لوگ عقیدہ و توحید کو
 سچے معتقد اور طاعت شعار ہو گئے، چاہے اپنی جاہلیت میں نہ دیکھ کر جو کچھ لکھل اور کس میں ماضی تھے
 دھوکا کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے عبد العظیم بن کاشم کے متعلق بھی ہیں روایت ہے کہ مکران
 بہت پرستی سے بڑا ہے (دیکھو ص ۱۶)

اور کائنات بیکار، مناسک ملک کی ممتن ہے، اعمال کا کس میں مناسک کہا جاوے، بار و مائت
 جہ و وقت میں، مرد و عورت کی، میان و دوزن مرد و عورت ہیں اور دعا کا حاصل یہ کہ کہیں اعمال کا اور
 مقامات کا ہر طرح بھلائی ہے، اس لئے غلط اور ناپائیدار انساناں جس کے من میں ہیں ملک و ملک
 وہ دیکھا انھوں سے ہیں ہو سکتا ہے اور تعلق بھی، چنانچہ مقامات کا کوئی بڑا چیز ہے ایسے دیکھ کر
 حسین کو یاد آ رہا کہ ہم کچھ کی داغ بیل و تعلیم فرمادی گئی

وَبَاوَأَعْتَفُ بِهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
 الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۶﴾
 (۱۶) اور ہم نے ان کے رسول سے ان کی تعلیم فرمادی کہ ان کے لئے آیتیں اور حکمتیں لکھیں
 کتاب اور شریک، چنانچہ ان کے لئے آیتیں اور حکمتیں لکھیں کتاب اور شریک، چنانچہ ان کے لئے آیتیں اور حکمتیں لکھیں

۱۵
۱۶
۱۷

صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی معنوں ایک ہی طرح کے الفاظ ہیں آج سے جن میں ان حضرات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں مقرریت لانے کے مقاصد آپ کے بعد نبوت و رسالت کے فرائض منصبی میں بیان کیے گئے ہیں آپ ایک مخلوق تھے، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت و نبوت و رسول کا تزکیہ انسان و غیرہ۔

یہاں پہلی بات قابل غور کرنا کہ کاشقہ الفاظ سے جو فعلیہ کا معانی ہے، یہاں مخلوق و تعلیم کو ایک ایک بیان کرنے سے یہ عمل ہو کر مشرک ان کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں اس کے الفاظ بھی متشکل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت قرآن اور اہم عبادت پر، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے ذریعہ جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاہی تھے ان کے سامنے قرآن ولی کا ہوتا جاسی تھا براہ کرم یہ نہیں سمجھنا کہ اس کا لفظ ہے مقرر و مقررین کے لئے بلکہ مقررین کے لئے مقرر ہے اور دوسرا مقصد رسالت قرلو دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ محل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں خود یہاں جانے خود راہم تھے آپ کے سامنے آئیں گے، اولیٰ یہ کہ مشرک ان کریم و دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہیں، الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر مولیٰ تکرار و تکرار بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنی کیجے جو پڑھتے رہنا باطل لغو و فضول ہے بلکہ مشرک ان کریم جس طرح معانی مقصود ہیں، اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام مشرک جس میں متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصولی لغز میں مشرک ان کریم کی یہ تفریق کی گئی ہے کہ کواظم و لاطفی جیسا کہ بین مشرک ان نام ہے الفاظ اور ذمین و دونوں کا یہی سے سلوک ہو گا اگر معانی مشرک ان کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ اور دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ معانی باطل بھی درست ہی ہوں، ان معانی پر فائز کو ہرے ہونے الفاظ میں کوئی شخص غامض نہیں پڑھے، تو تازا وارد ہوئی، اسی طرح وہ تمام احکام کو مشرک ان سے متعلق ہیں اس پر غامض نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے وہ چلی ہوئی زبان یا ہلے ہوئے الفاظ پر رقب نہیں ہوگا، اور اس لئے فقہائے اہل سنت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا معنی مشرک ان کے لئے اچھا و بدیہ کے ممنوع فرما دیا ہے، جس کو عرب میں اور دو کا مشرک ان یا اگر عربی کا قرآن کہلا جائے، یہ کوہ و حقیقت چر مشرک ان اور وہاں اگر عربی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ کہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب

سے مقررہ تلاوت آیات کو ہر ایک کو فرض مشرک ان کے اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مشرک ان کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، مگر ہر تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اس لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم اور اعلیٰ ہے، اہل طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مشرک ان کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظام مذہبی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو پھیلانا اور پھیلانے، بعض اس کے الفاظ تلاوت لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ اگر کچھ کیڑے جاہل ہیں، انہی اس کے ساتھ یہ بتا سکی ہیں صحیح نہیں کہ جب بتا سکیں، مگر جو بے وقاص غلط ہیں، ایک مشرک ان کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھنے کی وجہ سے اس طرح اس کے الفاظ کا بیڑا فضول ہے، یہ میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آجکل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر فہاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ایک کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھنا نا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآنی الفاظ اور ذمین و دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دینے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثواب غلط ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب جس دور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور معانی مشرک ان کو مستحب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے، انہوں نے محض معنی سمجھنے اور مستقل کرنے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور ادراک کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی تھا، انہوں نے ساری عرصہ اپنی آن کو نہ جاننا نہ دیکھا، جسے معاذ اللہ وہاں تک قرآن مجید ختم کرنے تھے، لیکن دونوں میں اور کچھ احادیث میں، ان میں مجید مشرک ان کے مادی تھے، اور ہر ہفتہ میں مشرک ان ختم کرنے کا تو پوری اہمیت کا حامل ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری حملوں کی علامت ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ عمل منظر ہر ایک کو جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اعلیٰ عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی عبادت و عبادت اور موجب ثواب و برکات اور صراطِ سعادت ہے، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تلاوت آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ کہ جو مسلمان فی الحال معانی مشرک ان کو نہیں سمجھتے وہ اس بد قسمتی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کو شش کرنے دہنا ضروری ہے کہ وہ

اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں پھیل گئی، فصل اُترے طبعیہ و علی آکر واسطیہ اربعین کو طم قلیا
 سیکر اُترے درمن صلی و صام و قعدہ و قام۔

وَمَنْ يُرَغِّبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ مِنَ سَفِيهِ الْقِسْمِ ۖ وَوَقَعَ
اور کو یہ جو پروردگار کے پیغمبر سے محروم کیا ہے اے نبی! ان لوگوں کو اور یہ کہ
اصططافہ فی الدنیا ورائہ فی الآخرة لیکن الصالحین ﴿۱۶﴾

مے ان کو متفق کیا، اسی بنا پر وہ اس آیت میں شریکوں میں سے ہیں۔
 اِذْ قَالَ لَهُ رَبِّيْٓ اَسْلِمْ ؕ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ وَاَوْفَىٰ
 ذٰلِكَ جِبْ اِسْمُكَ عَلٰى كَتِفَيْكَ كَرُوْا كُفْرًا كَمَا جِئْتُمْ اِيَّاهُ فَاَنْتُمْ كَاٰفِرُوْنَ ۝
 بِهَا لَا بُدَّ لَهُمْ مِنْهُ وَاعْلَمُوْا بَلٰٓئِيْٓ اِنْ اِلٰهَ اٰخَرُ لَكُمْ
 كَمَا اِيَّاهُ يَدْعُوْنَ ۝ اور یہی کہ جو ایک اور شریک تم کو روپے تم کو
 الَّذِيْنَ فَلَا كُمْ شُرَكَا ۝ اِذْ اَوْفَىٰ اَسْلَمْتُمْ ۝

[illegible][illegible]

اُطاعتِ اقتدار کی وجہ انصافین کی وہیں اسی اطاعت کی جستجو نہ کرنے پر ہم نے ہی کو شرفِ بخت سے یہ یاد بخیر اور اس وقت بھی اب بوجھ نہ دے، اور اس وقت موصوفیہ پر قائم رہنے کا حکم بھی اس ابراہیم علیہ السلام سے اپنے بیٹوں کو اور اسی طرح، محبوبِ مخلص سے بھی پانچ بیٹوں کو یہی کائناتوں کا حکم، میرے بیٹوں، اللہ تعالیٰ نے اس میں دینِ اسلام و اطاعتِ حق کو کوئی حصہ نہ دیا۔

معارف و مسائل

ماجدرات امت میں حجب ابراہیمی کے بنیادی اصول و اصولوں کے التزام کے ساتھ اس کا تائید اور اس کے اخراجات کو خزانہ کی بجائیے جس میں محدود و محدود کے اخراجات حجب ابراہیمی کے شعلوں و حوروں کی مروریہ اور صرف انچاس لاکھ کا حجب ابراہیمی کے مطابق بنانا اور وہ اس کام کی حقیقت اور یہ کہ وہ حجب ابراہیمی کا شکر دین ہے، اور ذکر کیا گیا ہے۔

مذکور آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام کندہ کر دیا ہے، پہلی آیت میں مطلب ابراہیم کی فضیلت اور اس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی عطا کران کی نعمت سے عطا کر کے اس کا مقام بتوڑ دیا ہے، اودشا ہے، **وَمِنْ ذُرِّيَّتِكَ خَضَعَ لِكَ الْبَنُوتُ وَارْتَضَىٰ لَكَ الْبَنَاتُ** یعنی نعمت ابراہیم سے گود گرائی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل و بزرگوں پر گہر ہے نعمت میں دینِ عظمت ہے، کوئی تسلیم الغلوۃ انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا، آگے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ اس نعمت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اوٹھ کر شامل شانہ اسے نعمت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی اور آخرت میں بھی، دنیا کی عزت و بزرگی کا مشاہدہ تو ساری دنیا نے کر لیا کہ غرور و بیباک صاحب اقتدار و بادشاہ اور اس کی قوم اس کیلئے بزرگ کے خلاف کڑی ہوئی اور اسے اقتدار کے سامنے عوامل امن کے خلاف ہتھیار کھینچنے، آخر میں آگ کے ایک بیڑے سے انہار میں آئی، گڑباز و گمراہی، غرور و دنیا کے سامنے علم و ہدایت کا مقصد جو قدرت والے کے تابع فرمان میں ہیں اس نے سامنے غرور و منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، آگ ہی کو اپنے غلغلے کے لئے ٹھکڑا دیا، اور دنیا کی مادی قوتیں ان کا کارنامہ بنے، پھر میں دنیا کے سامنے مومن اور کارفرما ہی تک کہ بہت پرست ہیں اسے جنت میں کی عزت کرتے ملے آگ سے دھرم کی عیب برہال اور ابراہیم رحمہ، جنت پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم

خطہ اسلام کی عزت و عظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی مقت کے اتباع کا رمزی کرتے تھے اور ملت ایمانی کی سٹے سٹے آثار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج و عمرہ و قرآنی بہان غزائی انہی کے انبیاء صالحات تھے، اگرچہ حیات نے ان کو بھی سچ کر دیا تھا، اور ہم انہیں سچوں غزائی انعام کا ہے جس کی روشنی غلیظ انہی کو امام الناس کا خطاب دیا گیا تھا، (فیما جاتلک و یثاقین

ابراہیم اور مسلمین پر ایم علیہ السلام کے اس قہر کی نگاہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور عظمت انسانی کے عین مطابق ہوتی ہے دنیا کے سامنے اچکا تھا، اور جس میں کبھی بھی عقل و فہم سے وہ اس ملت کے سامنے ٹھک گیا تھا۔

یہ تو براہِ اہم علیہ السلام کے دنیاوی شرف و بزرگی کا ذکر خطِ آخرت کا معاملہ جو اسے
 ملانے نہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ
 جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عزت و تفضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان
 کے درجات عالیہ معتبر رہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت جس میں ابراہیمی کے بنیادی اصول بیان کیے گئے، ارشاد ہوا۔

وَقَالَ لَمَنْ رَدَّ عَنْهُ اسْتَرْسِبْ الْغُلَامَيْنِ يَوْمَ تَتَمَشَّطُ لِمَا كُنْتَ تَتَكَبَّرُ فِيهِ فَيَنْبَغِي عَلَيْكَ حَقِيقَةُ انْتِزَابِهِ
 سے بھی کہے کہ اطاعت اختیار کرنا انھوں نے عرض کیا کہ میں نے الامعت اختیار کیا کہ
 رب العالمین کی اس طرف بیان میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ائمہ کی شان کے خطاب آتشیں
 کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہئے کہ اسْتَشْفَقْتُ لَقَدْ، میں نے آپ کی اطاعت
 اختیار کر لی، مگر حضرت غیب علیہ السلام نے اس طرف خطاب کو محدود کر کے عرض کیا کہ
 اسْتَشْفَقْتُ يَوْمَ تَتَمَشَّطُ الْغُلَامَيْنِ، میں نے یہ رد و جواب عالم کی اطاعت اختیار کر لی، ایک نواس
 میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور حق میں رد و شائد کے بعد و زمانہ مناسبت میں جو بھی حق کا مقام تھا، دوسرو
 اس کا اظہار ہو گا کہ میرے جو اخاعت اختیار کی وہ کسی پر احسان نہیں کیا، بلکہ میرے لیے اس کا نکران
 کا نذر تھا، چونکہ وہ رب العالمین یعنی ماسے جہاں کا پروردگار ہے، ماسے جہاں اور باقی اول
 نواس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا، اس نے اطاعت اختیار کیا اس نے اپنا فرض
 ادا کر کے کیا پانچ حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہو گا کہ منصبِ ابراہیمی کا بیاری اصول اور پوری
 حقیقت ایک لفظ اسلام میں مغرب ہے جس کے معنی میں اطاعت حق اور میں غلامِ ابراہیمی
 طبع اسلام کے مذہبِ مسلک کا اور یہی حاصل ہے ہی اخافات کا جس کے معنی کر ائمہ اعلیٰ کا یہ

خلیل اپنے مقام عالی تک پہنچا ہے، اور اس کے سر پرینا طاعت حق ہی وہ چیز جس کے لئے یہ سارا جہان بنا دیا گیا، اور جس کے لئے دنیاویار علیہ السلام بھیجے گئے۔ آسمانی میں نازل کی گئی ہیں۔

اس سے پہلے معلوم ہو چکا کہ اسلام کی تمام بنیادیں علیہ السلام کو مشترک دینی اور عقائد وحدت ہے، حضرت آدم سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہرگز نہ دے دے رسول اور نبی نے اس کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی اہل سنت کو چلا یا، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فہرست کیا۔

۱۔ اِنَّ الْمَیْمَنَیْنَ عَلٰی اللّٰهِ الْوَاقِعَاتُ ۝۱۱
۲۔ وَتَنْقُضُ عَهْدَ الْاَشْقَامِ وَتُجَا
فَتَنْقُضُ عَهْدَ ۝۱۲

اور ان کے لیے کہہ دینے والی ویرسب مختلف انیمیا، طبیعہ اسلام لائے ہیں وہ سب ابتر ہے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین میں اسلام ہی ہیں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دین میں کسی طبیعہ اسلام کا جیسے یا یہودیت و نصرانیت وغیرہ اور حقیقت سب کی اسلام ہے، جس کا حاصل اخلاقی حق ہے، البتہ ان میں ایک خصوصیت علت ابتر کی حاصل ہے، اگر حضرت ابتر میں طبیعہ اسلام نے اپنی علت کا نام بھی اسلام قرار کیا اور اپنی اہمت کو بھی اہمت مسلمہ کا نام دیا، رعاد میں حضرت کیا،

وَمَا كُنَّا بِمُعْجِزِينَ لَكَ مِنْ شَيْءٍ
وَمَا كُنَّا بِمُعْجِزِينَ لَكَ مِنْ شَيْءٍ

تجلی ہے ہر دھار پر بارگاہ مجاہدوں اور
دائیں اور کولم دیکھنا پائے انوار اور دھار

اور دین میں بھی ایک جامعیت کا پائے منبر و مہر و درجہ

اور اگر کوہیت کرتے ہوئے فرمایا: **وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَوَّلَ وَالْاٰخِرَ مِنْهُمْ** | تم جو پہلے کے کسی اور سب سے پہلے دینا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصیت اہستہ است حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بجائے حضرت
امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا کہ اس کا نام قبل مسیح رکھا گیا اور اس کو
ملت بھی ملت اسلام کے نام سے معروف ہوئی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَا أُبَيِّنُهُ إِلَّا لِمَنْ يَشَاءُ
أَكْبَرُكُمْ دِينًا وَبَلَدًا وَفِي هَذِهِ (137)

متمم فرمایند: چنانچه چاہم کسی کو کسی پر عالم گرد
اس کے لئے اعلیٰ القاب و سلطات نہ دے گا کہ اس پر کسی
اور اس پر کسی کو اعلیٰ القاب دے (میں)

کچھ کر قریب ہو دگی یہی کہتے ہیں کہ ہم سب اہل ایمان ہیں، انعامی بھی اور مشرکین عرب بھی

نیکو سے سب غلطی باجھو گئے ہوئے تھے، حقیقت میں سب ہمہ پہلی کافر ہی تھیں مصلحت
اور ان کی اور وہی فطرت کے مطابق تھی۔
خلاصہ کلام یہ ہو کر اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے
اور جن کا جس اور کس طرح نازل ہوا ہے ان سب کی دوح اسلام میں اطاعت تھی ہے جس کا
مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابل میں فرائض کی اطاعت اور اصلاح ہونی کو جو ہرگز
اتباع پر ہی کیا بندھی۔

افسوس ہے کہ کج اسلام کا نام لینے والے لکھنؤ مسلمان ہیں اس حقیقت سے بیگانہ ہو کر
اور وہی مذہب کے نام پر ہی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انھیں قرآن و حدیث
کی صرف وہ تفسیر و تفسیر بھی معلوم ہوتی ہے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے
کہ جائز و حرام کو کھینچ کر لکھ کر اپنے اور اپنا دھابا و منافق کے بتوں کا لباس بنا کر
لو بیچنے میں دین مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں ناقص اتباع ہوئی اور خواہشات
کی پیروی ہی ہے۔

سورہ شرا و سجدہ و آلہ پشیمان ہوا

چند پروردگار سب وہی مسلمان ہیں

نافل انسان یہ نہیں جانتا کہ جو چیلے اور نا چیلے مخلوق کے سامنے تو چل سکتی ہیں، اگرچہ
کے سامنے ہیں کا طرہ و ذوق کو ملحوظ رکھ کر ان کے چھپے ہوئے ارادوں و جھوٹے دھابا
ہے اس کے آگے بجز خاص اطاعت کے کوئی چکر نہ گھومیں

کا دوا بھٹلانی آدمی جملہ راست

باعتدال و ترویر و حیدر کے دوست

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی خواہشات اور خواہشات سے باطل غالی اللہ بن ہو کر انسان
کواس کی تلاش ہو کہ حضرت جلیل سنانہ کی رضا کی کام میں ہے، اور اس کا فرائض میرے لئے کیا ہو
وہ ایک فرائض و نظام کی طرح گوشہ زار کا ہے، اگر کسی طرف جھلنے کا اور کسی کام کا حکم ہوتا ہے
اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، اس سے وہ منہ پر ہوا اور ایک خاص ہوا، اسی کا نام اصلاح
ہندگی ہے۔

دودا و حق و دوسرا عسر میں بیست

ہستہ دار و گوشہ زار یہ پیام سرور داد

اس جذبہ اطاعت و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا اتنی مقام ہے جس کو مقام عریش

کیا جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر حضرت امیر المومنین علیہ السلام علیہ السلام کا خطاب پاتے
ہیں اور سب اس طرح خاص کر انہی علیہ السلام کو تشریف لائے، اس حدیث کو
اطاعت کے ذریعہ راجح ہے اس کے اولیاء و اقطاب و ابدال کے و رحمت و انوار کے ہیں، اور کسی
اصغیٰ توحید ہے جس کے عمل ہونے پر انسان کی خوف و امید صرف ایک اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ
دوست ہو جاتے ہیں۔

امید و ہراسش ہمارے دوسرے

ہیں ست بناو قوسید و بس

غرض اسلام کے معنی اور حقیقت اطاعت تھی ہے، اور اس کا واسطہ صرف اتباع
و اولیٰ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَؤُلَاءِ فَمَا يَفْعَلُ الْغَائِبِينَ

تجزیہ سب کی قسم وہی ہوں نہیں گئے
جگہ و آج کا ہے تمام انھوں نے معاملات
میں جو کہ تمہارے ہیں اور میرے ہیں گئے
دل علی ہوں نہ کر رہی اور ذلیل و ملوث ہے

دل سے تسلیم نہ کریں

مسئلہ آیت مذکورہ میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی اور کو دست فرمائی،
اور ان سے جدا کیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی طاقت اور کسی ملت پر دھارے، مراد اس کی یہ
ہو کہ اپنی زندگی پر اسلام اور اسلامی تعلیمات پر چلنے سے مل کر رہے ہو، اگر اللہ تعالیٰ تعالیٰ
بھی اسلام ہی پر فرمائے، جیسا کہ ہمیں روایت میں ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جس حالت کے پائے
دو رہے، اسی حالت پر رضائی موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں عشر میں قائم ہو گئے، انھیں
کی عادت تھی ہے کہ ہر بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے مفاد کے مطابق کوشش
کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں،
اس معاملہ میں اس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے، جس میں ہمارا اشارہ ہے کہ بعض آدمی جنت کے
کام اور اہل جنت کے عمل پر پیش کرنا چاہتے ہیں، جہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے دیکھان صرف ایک
اتحاد کا مسئلہ رہ جاتا ہے، مگر جس کی تقدیر غالب آجاتی ہے، اللہ اپنی دوزخ کے سے کام کرنے لگتا
ہے اور انھیں کار دوزخ میں جا کر، اسی طرح بعض آدمی دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے،
یہاں تک کہ اس کے لئے دوزخ کے دواہان صرف ایک اتحاد کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر تقدیر غالب آتی
ہے اور انھیں جنت کے کام کرنے لگتا ہے، اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

آپ ان پروردگاری سے فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے بہت کئے جا رہے ہو جن تعالیٰ کے معاملہ میں تم کو ہر کو قیامت میں مدد نہیں ہے۔

حالا اگر وہ ہمارا درخشاں و سب کا رب اور عالمی اور سر پرست میں تو حق تعالیٰ سے اس کا کوئی خصوصیت نہیں ایسا محتاجی یعنی وجود سے انحصار نہیں ہوتا ہے، مثل ماہد اللہ اور ہم کو ہمارا کیا ہوائے ہمارا کہ حق تعالیٰ ہوائے ہمارا کیلئے تو ایک ہی سطر ہے، اور اللہ تعالیٰ شکر ہے کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنے دین کو دھڑک دیا اور کسی خاص کر رکھا ہے بلکہ حق تعالیٰ نے ہر چیز کے علاوہ ہر چیز کو بے خود کر دیا ہے۔

میں ملاؤں ہے جیسا ان کے اڑان عزیزان اس لئے درج ابی اللہ سے ظاہر ہے اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے ہرگز کو کھلتا نہ ہوئے کے کما میں) آیا وہ اب بھی اپنے ہی پر ہونے کے ثابت کرنے کو کہیں، جاتے ہو کہ ہر اس میں اور اہل اور دکان اور یعقوب اور اور یعقوب (میں جو اسباب مگر ہے ہیں یہ سب حضرات) یہ وہ اللہ تعالیٰ تھے اور اس سے ہر اس مسئلہ موافقت (میں) پاکستان پر غرض ثابت کرتے ہیں اس میں کے جناب میں، اس کے عملی اللہ ہی کے ایک اہل

عقربس بات اس سے کہہ چکے کہ اچھا بھلا ذکر، مژدہ دار، واقف اور اہل تعالیٰ اور قادر ہے کو خواہی
ہی زیادہ واقف ہے اور وہ ان انبیاء کا حسب اسلام پر ہونا ثابت کرے ہیں، جیسا کہ اہل اہل مذکر کا
اور وجہ ہے کہ ان کا یہی مگر چھپانے ہیں سو اپنے انھیں سے مذکر کا نام ہی ہوگا جو اہل شہادت کا
کہے ہیں اس کے پاس خلاف اللہ تعالیٰ جو بارہ (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تم سے کہے ہوئے ہے عجز
نہیں ہیں انہی سب یہ عزت و برور و نصاریٰ دے، سو نہ طریق و دین میں ان کے موافق کہ ہو
پھر خدا را حق پر ہونا ثابت نہ ہوا، اور ہر مذکر کی، ایک حاجت تھی جو دینے نہ تھے،
مذکر تھی ان کے کام کی کیا جو اور اسے کا اور خدا سے کام تھا لکھا ہوا ہے، اور مرنے سے اس کے
کہے ہوئے کی بجائے جو نہ ہوئی اور دو جہاں خالی مذکر بھی نہ ہوگا فراموش کر کے قطع بنانا اور

معارف و مسائل

اسلام کی حیثیت | ﴿وَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ میں اس میں اس کے لیے ایک خصوصیت ہے جو انسانی ہونا کہہ کر کافی ہے۔ انسان کے معنی حضرت امیر مومنینؓ بننے سے بہت پہلے ہیں کہ انسان اپنے رب میں خاص ہو کر اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ مانے اور اپنے عمل کو خداوند اللہ کے لئے کرے، دوسرے کے رکھنا یا ان کی مدح و شکر کی طرف توجہ نہ ہو۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اخص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو قرآن نے سہجایا ہے نہ احادیث اور نہ شیطان اور نہ صرف ہندوے اور ان کے افعال کے درمیان ایک درجہ ہے ۴

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ

اب کہیں گے ہر خوف رک کر کس چیسرے پھیر دیا مسلمانوں کو

عَنْ قَلْبِنَاهُ الْيَوْمَ كَانَ عَلِيًّا قَالَ اللَّهُ الْفَتْحُ وَالْمَغْصَبُ

ان کے قبیلے جسے ن تھے ان کے اثری ساہ مشرق اور مغرب

پہلے جس کو چاہے میری راہ -

۱۰۰۰ : اور جب کہ قبیلہ غلام مقرب ہو کر بیوہ کا خلیفہ مترک ہو گیا تو بیوہ باگوازی کے اہل ہو

خلاصہ تفسیر: وہ بہر قوت لوگ عزادری کہیں تھے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے وہ سابقہ گناہوں سے پاک کر دیا۔

طرف، چلی رہا آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (مستیں خواہ) مشرق، دہرا اور خواہ مغرب (دہرا) اللہ ہی کے حکم میں ہیں۔ خدا تعالیٰ کو ان کا انداختہ بار ہے جس سمت کو چاہے مگر اسرارِ ادیب!

کسی کو منصب ملت دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سید صاحب اربع احکام شرعہ کے باب میں بھی اقتصاد ہے، لیکن بعضوں کو اس واسطے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، خواہ خواہ غلیظ طعنوں سے پہلا

کرتے ہیں البتہ! جس کو خدا ہی راہ اپنے فضل سے چاہا ہیں وہ اسیدِ عطرین بن کر دیئے ہیں۔

معارف مسائل

اعراض اور جواب سے پہلے قبل کی حقیقت اور اس کی مختصر تاریخ سن لیجئے جس سے سوال و جواب کا

[illegible]

خلاصہ تفسیر

اے ان کی پروردگار! (ہم سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو؟ (ہم کو فلاح و نجات دے)۔
 ہاں اگر وہ ہمارے خدا کا رب ہے، تو وہ ہمارے رب اور ہمارے رب کے واسطے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 نہیں ایسا محتاجی و بے مروتی سے انحصار نہیں ہوتا ہے، مثل علیہ السلام اور ہم کو چاہا گیا
 ہر اسے اللہ اور ہم کو خدا کا ہر اسے اللہ اور ہمارے رب کے واسطے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 شکر ہے کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اپنے دین کو ترک نہ کیا، اور نہ ہی ہم نے
 خاص کر گناہوں کے واسطے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 میں بخدا ہے میں ان کے اقوال و افعال میں ایمان لے کر آیا ہوں، اور میں ان کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 اور اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے ہم کو غفلت نہ ہونے کے واسطے، اے اللہ! ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 کے ثابت کرنے کو، میں نے اپنے رب سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 دین و ایمان کے لئے میں نے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ملاحق ایمان پر ہونا ثابت کرنے پر ہمارے رب کے جواب میں، اے اللہ! ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 غرض اس بات سے کہ ہم نے اپنے رب سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ہی زیادہ واقف ہے، اور وہ ان انبیاء کا حق اسلام پر ثابت کر چکے ہیں، ایسا ہی ہمارے رب کا حق ہے۔
 اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی شے کو چاہئے ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا جائے گا، اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی شے کو چاہئے ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا جائے گا۔
 کہے ہیں اس کے پاس تمام شے ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی شے کو چاہئے ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا جائے گا۔
 نہیں ہیں، اے اللہ! ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ہر خدا کا حق ہے، اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی شے کو چاہئے ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا جائے گا۔
 اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی شے کو چاہئے ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا جائے گا۔
 کہے ہوئے ہیں، اے اللہ! ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔

معارف و مسائل

۱۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۲۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۳۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۴۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۵۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۶۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۷۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۸۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۹۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۱۰۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 عَنْ قِبَلِهِمُ الْحَقُّ كَانُوا يَعْلَمُونَ
 ان کے قبیلے میں یہ رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ہے مشرق اور مغرب
 بَحْرَيْنِ مِّنْ يَّنَاءُ إِلَىٰ عِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ
 جگہ جس کو چاہے میری راہ -

خلاصہ تفسیر

اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟
 اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے ہم کو ایمان دیا؟

معارف و مسائل

۱۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۲۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۳۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۴۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۵۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۶۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۷۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۸۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۹۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔
 ۱۰۔ حق تعالیٰ نے ہم سے بہت کچھ جاننے پر حق تعالیٰ کے معاملہ میں مددگار ہو سکتے ہو۔

طرت نچ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری محنت اہلہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں جن کو خلوت میں اور انفرادی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصولی افراد کثرت کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت عینی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سبب قائل ہے، پھر نقطہ وحدت متعین کرنے میں ہر مکتب ہر زمانہ کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کبھی قوم نے نسل اور نسب کو نقطہ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جغرافیائی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دین الہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اختیاری چیزوں کو نقطہ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افراد انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افراد انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکرات اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دین اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصل نقطہ فکر و خیال اور عقیدہ کی وحدت کو متعارف دیا، اور کرداروں خداؤں کی پرستش میں بیٹی ہوئی دنیا کو ایک ذات حق وحدۃ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افراد انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور فطری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افراد انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیاری چیزیں نہیں ہیں جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہو وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکز وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دین اسلام نے ان چیزوں سے تمدنی

معاہدہ ابستہ ہیں ان کا برابر احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدت انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کبر و حدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ہاں خست یاری امور میں اس کی پوری رعایت کی کہ فکری وحدت کے ساتھ عملی اور صورتی وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکز وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت کے لئے آسان اور ہر شہری اور دیہاتی امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، وہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقہ کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور لمبائے مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعاہ یونیفارم کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے، تو یہ اعتدال انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دینے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعت اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعاہ یونیفارم مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقے اور ادوار لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسرار بجا یا نفع وغیرہ یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکز وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری نہیں ہوں اور آسان اور مستحکم بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعت نماز کی صف بندی، ایک امام کی فعل و حرکت کی عمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ الشعل شائد کی ذات پاک ہر سمت وجہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے مشن جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی سمت وجہت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت وجہت کو کسی وجہ کی طرف ساری دنیا کا رخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑا اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شائد کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں کے ذریعہ بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولاد آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ گھر جو کہ میں ہر برکت والا، ہدایت والا چاند اور سورج

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ ہی بیت اللہ تھا، طوفان نوح علیہ السلام کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہو گئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہو گئی اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور مصلی علیہ السلام نے دوبارہ بحکم خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور وہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیاء بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابو العالیہ انبیاء سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صفحہ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القریلی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرض کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداء آپ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خاد کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائیے، صبح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی مسجد نبویؐ میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرطبی)

حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے قرسیۃ الرسلؐ سرتاپا اطاعت تھے، اور حکم خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دیا جائے، اور چونکہ عارۃ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش اور رغبت کو پورا فرماتے ہیں۔

تو چنان خواہی حسدا خواہد چینیں

می دہد یزدان مراد مستفتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ امید تھی کہ آپ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظار دہی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے:

مَنْ مَّنَّيْ تَلَّابٌ وَجْهَهُ فِي
الشَّمَاةِ فَلْيَلْزِمْنَا قَبْلَةَ تَرْكُنَا
كَوْلٍ وَجْهَهُ شَطْرَ الْمُتَجِدِّ
الْأَحْرَامِ (۱۴۴)

ہم دیکھ رہے ہیں آپ کا بار بار آسمان کی طرف
نظر اٹھانا، سو ہم آپ کا قبلہ وہی بنا دیں گے
جو آپ کو پسند ہو اس لئے آئندہ آپ نمازیں
اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کریں۔

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار منسربا کر اس کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں | یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں اس کی سمت کا استقبال ہی پروردگار نے دنیا کیلئے کافی ہو | کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجد حرام کا استقبال فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلا وجہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمت بیت اللہ کی طرف رخ کر لینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجد حرام میں موجود ہے یا کسی شہر ہی پہاڑ پر بیت اللہ کو دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمت بیت اللہ یا سمت مسجد حرام کی طرف رخ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال ہجرت مدینہ سے سولہ سترہ مہینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا گیا اس پر جو اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ ہی روز و زبد بنا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ دیا کہ یہ تو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہو گئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے، قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي قَدْ خَلَقْتُكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ لِّتَعْرِفُوهُنَّ فَإِنَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ عُودُكُمْ فَلْيُحْكِمُوا لِمَا بَيْنَهُمْ مِنْ شَرَائِئِ الْأَحْكَامِ (۱۴۴)

یعنی آپ فرمادیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔ اس میں استقبال قبلہ کی حقیقت کو واضح منسربا دیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جس کو قبلہ بنا دیا گیا اس کی طرف رخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہو اس کی روح حکم جل شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو ابانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
(بقرہ: ۱۷۷)

اُس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم
مشرق کی طرف رخ کرو یا مغرب کی طرف لیکن
نیکی اللہ پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت
کرنے میں ہے۔

ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی متعدد و بھرپور سی کوشش کی، مدد علی علیہم امتیں امت محمدیہ کی گواہی پر جرح کریں گی کہ اس امت محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملہ کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلہ میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

امت محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر میں ایک صادق مصدق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنہ سے زیادہ وقیح اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں، اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا ترکیہ و توثیق کریں گے کہ بیشک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعہ ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی، اور مشاء احمد کی متعدد احادیث میں بخلاف اور مفصلاً مذکور ہے۔

الغرض آیت مذکورہ میں امت محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بکلیا گیا ہے کہ یہ امت معتدل امت بنائی گئی ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابل غور ہیں۔

اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت (۱) اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں، (۲) وصف اعتدال کی نہایت اور اس کی کچھ تفصیل

الصلوۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رو سے کیا ثبوت ہے، ترتیب لہران میں سوالوں کا جواب یہ ہے۔
۱۔ اعتدال کے لفظ معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر کرنے کے ہیں۔

۲۔ وصف اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دنیا کے جتنے تے اور پڑاے طریقے جہانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبی یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدن انسانی کی صحت اعتدالی مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو رہی بدن انسانی کا مرض ہے، خصوصاً طلب یونانی کا تو بنیادی اصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط خون، بلغم، سودا، صفراء سے مرکب اور انہی چاروں حسیلات سے پیدا شدہ چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں، گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور ترری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاج انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں وہ بدن انسانی کی صحت تندرستی

کہلاتی ہے، اور جہاں ان میں سے کوئی کیفیت مزاج انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے اس محسوس مثال کے بداب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف کیسے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحب بصیرت انسان پر محقق نہیں کہ جو ہر انسانی صحت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دنیا کے سارے جانور بھی انسانی صحت کے ساتھ شریک بلکہ انسانی صحت سے زیادہ صحت رکھتے والے ہیں۔

جو ہر انسانی صحت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آفت کے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معنی کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو صحت و بدن کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

آدمیت لحم وشم و پوست نیست

آدمیت جسز رضاءے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہر شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے لئے میں فرمایا ہے

ایستکم می بینی حنلاب آدم اند

نیستند آدم حنلاب آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہر شرافت اور مدار فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدن انسانی کی طرح روح انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدن انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور احتیاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت بھی اور اس کے حسیلات کا اعتدال ہے، اس لئے انسان کا مل کہلائیگا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسانی کامل کے اولین مصداق

آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ ہر پستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک حکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں جنسالاتی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجیں اور بہت ضرورت لازمی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانون اعتدال دنیا میں نافذ کر سکیں، اسی مضمون کو مسترآن کریم نے سورۃ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

فَعَلَّمَ آدَمَ اسْمَ كُلِّ شَيْءٍ بِالنُّفُوسِ وَأَنْزَلْنَا مِنْهُم مِّنْ ذُرِّيَّتِهِمْ لِبَيْتٍ أَكْبَرٍ أَلَيْسَ لِكُلِّ شَيْءٍ قَانُونٌ
 لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْنَا الْكِتَابَ بِالتَّوْحِيدِ وَإِنَّا لَنَافِخُ فِي النَّفْثَاتِ (۲۵: ۵۴)

”میں نے ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں
 دے کر اور انہیں ان کے ساتھ کتاب اور
 ترانہ تاکہ لوگ مدد و انصاف پر قائم ہو جائیں
 اور ہم نے انکو اس میں سخت لڑائی ہواؤ
 لوگوں کے کام چلتے ہیں۔“

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں جنسالاتی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق، اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترانہ و معاملات لین دین میں علی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترانہ سے مراد ہر شیخیر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور مدد انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی اصل غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

اب ہم یہ مضمون کہ اعتدال اس بیان کے اپنے یہ بھی معلوم کریں کہ امت محمدیہ علی ما جہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی، وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا یعنی ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے، یہ ہونے اور رکھنے میں تو ایک لفظ ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حادی اور جامع ہے۔

اس میں امت محمدیہ کو امت وسط یعنی معتدل امت قرار دیا کہ انسان کا جو صبر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کیلئے یہ آسمان و زمین کا سارا نظام ہوا اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ امت اس میں ساری امتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس امت کے متعلق اس خاص وصف فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورۃ اعراف کے آخر میں امت محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِمَّنْ جَعَلْنَا آئَةً يَّتَذَكَّرُ
 وَالْحَقُّ قَرِيبٌ يَّتَذَكَّرُ (۱۸۱: ۴)

یعنی ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہوا
 ایک ہی امت ہے جو بھی راہ ہتلائے ہیں اور
 اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔

اس میں امت محمدیہ کے اعتدال روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دوسروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں، جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورۃ آل عمران میں امت محمدیہ کے اسی اعتدالی مزاج اور اعتدالی روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:

مُتَّعَمِدِينَ عَلَى اللَّهِ كَمَا كَانُوا عَلَى الْبَنَاتِ
 يَتَذَكَّرُونَ (۱۱۰: ۳)

”میں سب امتوں میں بہتر ہو جو عالم میں
 بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اپنے کاموں کا اور
 منع کرتے ہو برے کاموں سے اور اللہ پر تکیہ
 لاتے ہو۔“

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہونے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا ہمیشہ مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب امتوں میں بہتر امت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی فستریا ہوں سے سرسبز شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوں گی، بلکہ اس کا دائرہ عمل ساری عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہو گا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہو گا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لاکھڑا کر دے، اُخْرَحْتُمْ إِلَيْنَا میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ امت دوسروں کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، برے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْكَفَى مِنْ النَّبِيِّتِہِ کا یہی مطلب ہو کہ دین اس کا نام ہے، کہ سب ملانوں کی خیر خواہی کرے، پھر برے کاموں میں کفر و شرک

بدعات، رسوم قبیحہ، فتن و فجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کسی طرح ہوگا، کہیں زبان سے کہیں ہاتھ سے، کہیں قلم سے، کہیں تلوار سے، غرض ہر قسم کا چارہ اس میں داخل ہوگا۔ یہ صفت جس قدر محسوس و اہتمام سے امت محمدیہ میں پائی گئی پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳۔ اب دوسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس امت کے توسط و اعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام امتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال: سب سے پہلے اعتقادی اور فطری اعتدال کو لے لیجئے، تو پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنا لیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے، وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (۳۰، ۴۹)، اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کو یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برکتوں کے باوجود جب ان کا رسول ان کو کسی جنگ و جدوجہت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں قَدْ هَبَبْتُ أَنْتَ وَرَبِّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ (۵۴، ۵۵) یعنی جیسے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذا میں پہنچاتے ہیں۔

اخلاقی امت محمدیہ کے وہ ہر ستر ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو و سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اُس پر کہ جس کے نام پر ہر زبان میں

بڑھا دیتے ہیں پھر اس پر فرشتے کے قتل میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با ایں ہمہ کمالات و فضائل عظیم الشان و رسولانہ ماننے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ بیان رکھتے ہیں، جو قصیدہ برترہ میں فرمایا ہے

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

یعنی اس کلمہ کو جو جو درجہ نفاذی لے اپنے نبی کے ماننے میں کہہ دیا، کہ وہ معاذ اللہ خود

خدا یا خدا کے بیٹے ہیں، اس کے سوا آپ کی مدح و ثناء میں جو کچھ کہو وہ سب جی رنج ہے

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عمل اور عبادت میں اعتدال: اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمائیے پہلی امتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند حکموں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، ارشتریں لیکر آسانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں اور طرح طرح کے جیلے پہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

امت محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکام خدا و رسول پر مرثیے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسری کے تخت و تاج کے مالک بن کر دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دنیا میں برتری نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی پھرائی بازاروں اور دفتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور اداروں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فیکری اور فیکری میں بادشاہی سکھائی ہے

چو فقر اندر لباس شاہی آمد

ز تدبیر عیب اللہ آمد

معاشرتی اور تمدنی اعتدال: اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پہلی امتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی حقوق کی کوئی پرواہ نہیں، حق ناخن کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کھل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب بڑا کمال ہے، ایک زمین کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بنو سہل سے جاری ہوئی ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ شعی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے مقابل دوسری طرف یہ سفیہ زہرا کی کیرے بکھڑوں کی ہتھیار کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کھلائے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدان جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے

معاشرہ میں درگزر اور عضو چشم پوشی کا سبق سکھلایا، اور دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال: اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور امتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالی نظر آئیں گی، ایک طرف نظام سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی غرض حالی یا بد حالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصد زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

امت محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصد زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب جہد کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیم دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد سادہ دولت کو نہ سمیٹ لے، قابل اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقبل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرتے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیت مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا، کہ امت محمدیہ ایک معتدل اور بہترین امت بنایا گیا ہے۔

اجماع کا حجت ہونا: قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے، کیونکہ جب اس امت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء مقرر کر دیے تو ان کے بالمقابل انکی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہی اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کا اجماع تابعین پر اور تابعین کا اجماع تبع تابعین پر حجت ہے۔

اور تفسیر منطوری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاص نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے، اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلط پرستی نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعِ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے قبلہ کو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع

الرَّسُولِ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى

رسول کا اور کون پھر جلتے گا آئے پاؤں اور بے شک یہ بات بھاری ہوتی مگر ان پر

الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ أَيْمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ

جن کو راہ دکھائی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بیشک اللہ

بِالنَّاسِ لَرَوُوفٌ شَرِّحِيمٌ ﴿۱۳۴﴾

لوگوں پر بہت شفیق نہایت ہریان ہے

خلاصہ تفسیر: اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ بنو کر رکھا تھا (اور جب سمت قبلہ پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض

اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جاوے کہ اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے اس امتحان کے لئے اس عاجزی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا، اور یہ قبلہ کا بدلنا (مخوف لوگوں پر)

ہوا بڑا ثقیل رہا، مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے وسیعہ طریق کی ہدایت فرمائی ہے، جس کا بیان اوپر آچکا ہے کہ احکام ایسے کو بے چون و چرا قبول کر لینا ان کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اس کو سمجھنے لگے، اور وہ ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ دوسرے دلائل سے توجہ نہ دے گا، جس توجہی نمازیں ادا کر رہے ہیں ان میں ثواب بھی کم لا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس دوسرے کو دل میں نہ لانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب کو منہ سے راد و ناقص (کروں راد و) واقعی اللہ تعالیٰ تو دلیجہ (لوگوں پر بہت ہی شفیق اور) مہربان ہیں تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا۔

معارف و مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہو، کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ابتدا رکب ہوئی جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا، یا بیت المقدس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اول ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جن ہجرت کے بعد ہی سورہ ستروہ میں مکہ ابی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا، کہ آپؐ حجرا سو را در رکن بنائی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ و اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سورہ ستروہ میں اپنے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپؐ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اس کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آگیا، تفسیر شریطی میں بحوالہ ابو عمر اس کو اصح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذن حق اونڈی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہیست دیکھ

سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپؐ کو اپنے اصل قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپؐ کو اپنے آپا، ابراہیمؑ و اسمعیلؑ کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبی نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہو گیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صحفہ بیت المقدس تھا، ابو العالیہؒ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صحفہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپؐ کا رخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوتا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہؒ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کر دے گی، جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک بحکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے ہستیا ز اور ان سے مخالفت کا اہتمام کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے ہستیا ز اور ان کی مخالفت کا اہتمام ضرور ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلاف اقوال کی بناء پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہو گیا، کہ الْقِبْلَةُ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَيْهِ تَحْتَ مَا مَرَدُہ، قول اذل کی بناء پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپؐ کا قبلہ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بناء پر اس سے مراد کعبہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہی آپؐ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا درنوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویل قبلہ کو آپؐ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر یہی معلوم ہو جائے کہ کون آپؐ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان یا وہ جن کے دلوں میں کجھ نفاق تھا اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلقہ

بہن سنت کو قرآن کے ذریعہ | جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح بھی مشورہ کیا جاتا ہے | نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنن نبویہ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآن نے اس کو مشورہ کر کے

آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو شترآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں باہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

خبر واحد جبکہ شترآن تو یہ اس کے ثبوت پر موجود، بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحاح کرامؓ ہوں اس سے شترآنی حکم منسوخ سمجھا چکا ہے، کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تخیل قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی، اور بعض روایات میں اس جنگ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سہیلہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انھوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیان نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا، تو یہ سنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عمرؓ میں جو پھل صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مرد کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں (ابن کثیر)

بنو سہیلہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تخیل قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا، مگر قبائے میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بڑا ہی اہم عمر مذکور ہے، اہل قبائے نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و جصاص)

امام جصاصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:

هذه اخبار صحيحة مستفيض في يدي	یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبر واحد ہے
اهل العلم قد تلقوا بالقبول فصلا	مگر قرآن تو یہی کی وجہ سے اس نے درجہ نماز کا
في حيزا التواتر الموجب للعلم	حال کر لیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبر واحد سے کوئی قطع حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، ان پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سہیلہ اور اہل قبائے کو تو ابانک ایک ہی آدمی نے خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرت تو انرا حاصل نہیں تھا، انھوں نے اس پر کچھ عمل کر لیا، جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبست یہ ہے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا

اور آپؐ اس کے لئے دعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقا قبلہ بیت المقدس غلط ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے پیغمبر و احکام کی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی شترآنی قطع فیصلہ منسوخ ہو جانا مستعمل نہیں۔

آلہ مجر الصوت کی آواز پر نمازیں | جمع بخاری باب ما جاء في القبلة میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں نقل و حرکت مفسد نماز نہ ہو بلکہ لال | جو قبائے میں تخیل قبلہ کا حکم پہنچے اور ان لوگوں کے بحالت نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:-

فيه جواز تعليم من ليس في	یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص
الصلوة من هو فيها	نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے
(عدة القاری، ص ۱۴۸ ج ۳)	کو تعلیم و یقین کر سکتا ہے

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفيه استماع المتعلمي للعلم من ليس في الصلوة فلا يضر صلواته (الی) ممکن الاستنباط الطحاوی (عدة القاری، ص ۲۲۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو حاج صلوٰۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہے، اب پھل صف میں ہنارہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے، اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درختار باب الامامة میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا قسم نقل تصحیح عدم الفساد فی مثلہ من جذا من الصف فتأخر فہل شتم فخر فلیحذر، اس پر علامہ طحاویؒ نے تحریر فرمایا: لا تغفلوا عن مثل من تأخر الله، یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنیوالے کے حکم کا اتباع نہیں کیا، بلکہ امر الہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شربلانیؒ نے شرح و ہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فساد نماز کا قول نقل کیا

معارف مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہشتیان کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی اور عطاء نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتے ابراہیمی کے تالیاں کام کرتے تھے، اور نزول وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتے ابراہیم کے مطابق مسترار دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دیا جائے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملتے ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانستے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلہ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو منافقت اہل کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے عمل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہود و عیسائیوں کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دیا جائے، اور چونکہ معتبران بارگاہ الہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے امیدوار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے، کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیت مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان مشرکوں کے پہلے تو قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا، فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ يَهْتَدُونَ اس کی طرف پھر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہو، اس کے فوراً بعد ہی یہ فرم فرمایا کہ پھر اُن کی خوشی حاصل ہو، پھر ایسا سے وعدہ کی خوشی تندرست ہو جائے (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، منہجی سے لیا گیا ہے)

مسئلہ ہتقبالی قبلہ | یہ تحقیق پہلے آپکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ يَتَّبِعُوا اللَّهَ يَتَّبِعُوا رَسُولِي، لیکن مصالح امت کے لئے بقائنا و تحکمت کسی ایک جہت کو تمام دنیا میں پہلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت

کا عمل مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ قَوْلِي وَجَعَلْتُكَ اِلٰى الْكَعْبَةِ اَذِلَّةً لِّىْ نَبِيْتُ اللّٰهِ فرمایا جاتا، مگر قرآن حکیم نے یہ عزت بدل کر شَطْرَ التَّحْجِجِ الْكِرَامِ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل ہتقبالی قبلہ کے بارہ میں واضح ہو گئے۔

اول یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو کعبہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اس جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں، اور بیت اللہ ان کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رخ کر دو تو اس کی تعمیل بہت دشوار ہو جائے، خاص آلات و رحاات کے ذریعہ بھی صبح سمت کا صحیح دور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقین ہو جائے، اور شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجد حرام کا لفظ رکھا گیا جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اس کی طرف رخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ شَطْر اختیار کر کے دیدی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ اِلٰى التَّحْجِجِ الْكِرَامِ تھا، اس کو چھوڑ کر شَطْرَ التَّحْجِجِ الْكِرَامِ فرمایا گیا، شَطْر دُعا کے لئے ہتعمال ہوتا ہے، ایک نصف ہے، دوسرے سمت ہے، باتفاق مفسرین اس جگہ شَطْر سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلادیا کہ بلاد بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نماز درست ہو بلکہ سمت مسجد حرام کافی ہے (بحر محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانب مغرب مسجد حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے ہتقبالی قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمت مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمت مغرب و قبلہ مسترار دیا ہے، جو موسم گرمی و سرما کی دونوں خبروں کے درمیان ہے، اور قواعد ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغرب ضعیف اور مغرب ہشتا کے درمیان ۳۸ ڈگری تک سمت قبلہ مسترار دی جائے گی، یعنی ۲۳ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی، نماز درست ہو جائے گی، ریاضی کی تدبیر اور مشہور کتاب شرح چغتائی باب رابع صفحہ ۶۱ میں دونوں معشرین کا فاصلہ بھی ۳۸ ڈگری قرار دیا ہے۔

۱۰ حضرت والد صاحب نے جو اہل فقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمت قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محمد تقی

سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے اس سے ان لوگوں کی چہالت بھی واضح ہو گئی جنہوں نے ہندوستان د
شرقا آلات رمدیر اور چلایا پاکستان کی بہت سی مسجدوں کی سمت قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار
ریاضیہ پر مدار نہیں ہے، اور بلاوجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شرعیہ اسلام یہ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پوری دنیا کے مالک
کے لئے ہے، اس لئے احکام شرعیہ کو ہر شعبہ میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ،
جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا مہلک
وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے ۳۸۱ ڈگری تک کی وسیع سمت مغرب اہل مشرق کا قبلہ ہے، اس
میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ما بین المشرق و
المغرب قبلۃ رسدوا للفریضی عن ابی ہریرۃؓ، یعنی مشرق و مغرب کے درمیان جانب جنوب
واقع تھا، اس حدیث نے گویا خطۃ التوحید کے لفظ کی تشریح کر دی کہ مسجد حرام کی سمت کافی
البتہ بناؤ مسجد کے وقت اس کی کو شش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رخ سے جتنا قریب ہو سکے
وہ کر لیا جائے، صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا سادہ یہ تھا
کہ جس جگہ صحابہ کرام کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوئی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رخ سیدھا
کر لیا، پھر ان کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رخ تجویز کیا گیا ہے،
اس لئے بلاد بعیدہ میں سمت قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جہت سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں
مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں فوج حضرات صحابہ و تابعین نے مساجد
کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمت قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انھیں دیکھ کر دوسری بیٹیوں میں سطحن
نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجد مسلمین سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی و کافی ہیں، ان میں بلاوجہ
شبہات فلسفہ کا لاشرعا محذور نہیں، بلکہ مذموم اور موجب تشویش ہے، بلکہ بسا اوقات ان تشویشات
میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین اور عاتہ المسلمین پر ہر گمانی ہو جاتی ہے، کہ
ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ
وہ وسلم کے مشہور و معروف عالم ابن رجب خلیلؒ اسی بناء پر سمت قبلہ میں آلات رمدیر اور دقیقہ
ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، و لفظ

واما علمہ التیسیر فاذا تعلم منہ ما
بحتاج الیہ للاستہلال و معرفۃ
القبلۃ والطریق کان جائزا عند
الجمہور و ما نراہ علیہ فلا حرج
الیہ و ہر یغل عما ہر اہم منہ
وربما اذی التذقیق فیہ الی اساقۃ
الفلن بمتعاسیب المسلمین امصالحہم
کما وقع فی ذلک اکثر من اہل ہذا
العلم قد یما وحد یثا و ذلک بغضی
الاعتقاد غلط الصغایہ والذالین
فی صلوۃ اتسم فی کثیر من الامصال
وہو الحل وقد انکر الامام احمد
الاستدلال بالعین و قال اتسا
وردمابین المشرق والمغرب قبلۃ
فرما یا کہ حدیث شریف میں صریحاً ما بین المشرق والمغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے
کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔

لیکن علم تیسیر اس کو اس قدر محال کرنا چاہیو
کے نزدیک جائز ہے جس سے راہ یابی اور قبلہ
اور رستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے
زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ زمین زیادہ کھینچا
امور ضروریہ کا غافل نہ ہو، اور بعض مرتبہ
تحقیقات فلکیہ میں پڑنا عادت بلادر اسلام
میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق گمانی
پیدا کر دینا بڑا اس فتن میں مشغول ہونے والوں کو
ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں اس پر
یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت شہروں میں صحابہ
تابعین کی نمازیں غلط طریقہ پر تھیں اور یہ بالکل
فہم و باطل ہے، امام احمدؒ نے (سنن) میں صریحاً
فرمایا کہ جس کو ہمارے بلاد میں قطب کہتے ہیں سمت
قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور
کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔

اور جن جگہات یا نوآبادیات وغیرہ میں صاحب قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جہت
صحابہ و تابعین سے ثابت ہے یہ ہو کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم
کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جائے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی ہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے
کیونکہ حسب تعریج صاحب بدائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام
کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے یثد کو قائم مقام خروج بیچ کا قرار دے کر اسی پر
نقص وضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا استدار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں
حقیقت مشقت ہر یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعہ جو
سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ محمد اعظمی
رسائل الارکان میں اس مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:

والشہد وقع المسامۃ علی حسب | اور استقبال قبلہ میں شرط ضروری صریح ہے

ما یبری المصلیٰ و یجی غیر مأمورین
بالمسامتۃ علی ما یکلم بہ الا
المرصدیۃ و لہذا افتوان الاخر
المفسد ان یتجاوز المشرق و
المغرب (وسائل الارکان ص ۵۳)

ہرگز نمازی کی رستہ اور اندازہ کے موافق کہہ
کے ساتھ مسامتہ (محاذاات) واقع ہو جائے
اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ
و محاذات کا پیدا کریں جو کالات و مسد یہ
کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ
ملاکات موسمی بہرہ کر انحراف مفسد و مصلوق وہ ہر جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جائے

اس مسئلہ کی عملی تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراج قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی
حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے "سمت قبلہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَلِیِّنْ اَتِیْتَ الذِّیْنَ اَوْثَوْا الْكِتَابَ بِكُلِّ آیَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ

اور اگر تولاے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِ بَعْضٌ وَلِیِّنْ

اور نہ تیرے ان کا قبلہ اور نہ ان میں ایک اساتذہ دوسرے کا قبلہ اور اگر تو چلا

اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لَئِنْ اِذَا لَیِّنْ

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہر ان

الظالمین ﴿۱۰﴾

بے انصافوں میں۔

خلاصہ تفسیر اور راجد ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ

جب بھی آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور ان کی موافقت کی امید اس لئے نہ رکھیں چاہے کہ
آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں اس لئے آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے، پس
کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی اور جیسا ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے ان میں باہم
بھی موافقت نہیں کیونکہ ان کا کوئی (فرق) بھی دوسرے (فرق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا،
مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا اور

خدا خواستہ آپ تو کسی طرح ان کے قبلہ منسوخ غیر مشروع کر لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ اگر آپ
ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (مگر وہ اصل میں حکم آسمانی رہے ہوں) لیکن اب جو منسوخ ہونے
کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہو، سو اگر آپ ایسے خیالات کو اختیار کر لیں (اور وہ بھی)
آپ کے پاس علم قطعی یعنی وحی (آپ سے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعمذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں
رجو کرنا کہیں حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا جو بد معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے
کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کر لیں۔

معارف مسائل

وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ
بیت اللہ ہی رہے گا، اس سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے
قبلہ کو تو کوئی تشرع نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب
بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنالیں۔ (بحسب محیط)

وَلِیِّنْ اَتِیْتَ الذِّیْنَ اَوْثَوْا الْكِتَابَ میں یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہ فرض محال کے ہے
جن کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں، اور دراصل سننا نامت محمدیہ کو ہے، کہ اس کی خلافت و زری
ایسی چسپور کہ خود رسول بھی بغرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوا الْكِتَابَ یَعْرِفُوْنَهُ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو

ذَٰلَکَ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَّکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰﴾ الْحَقُّ

اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر، حق وہی ہے

مِنْ سَرِّکَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُنْکَرِیْنَ ﴿۱۱﴾

جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو مشک لانے والا۔

خلاصہ تفسیر اس سے پہلے آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبانی
سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں اپنی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراة و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو (تورات و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا رہے شک و شبہ پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں، رکہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کسی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایسا ہی لے آتے اور بعض ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اختفاء کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں بھی شبہ و شبہا نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات و نشانات کا ذکر آیا ہے اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہو کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہو یا باپ کی مثال نہیں دی حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادتاً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداً پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوچھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کہیں نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو مثلاً ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ اس نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہو کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل و صورت وغیرہ کا پہچانا ہو کہ بیشائی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل و صورت کے پہچاننے میں کسی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وَجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَذِقُوا الْخَيْرَاتِ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہو یعنی قبلہ کر، مگر نہ اس طرف سو مت ہفت کرو دیکھو میں جہاں کہیں تم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۵۰﴾ وَمِنْ

ہم کہہ کرانے کا تم کو اکٹھا، بیشک اللہ ہر چیز کو مسکتا ہے، اور جس جگہ سے

حَيْثُ خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافَةٌ

لانگے سر نہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

لَلْحَقِّ مِنْ رَبِّكَ طَوَّافٌ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۱﴾ وَمِنْ حَيْثُ

جبرے رب کی طرف سے اور اللہ ہے خبر نہیں تمہارے کاموں سے، اور جہاں سے تو

خَرَجْتَ قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ طَوَّافٌ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ

لانگے نہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہو اگر نہ مٹہ کر

قُولُوا رُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھڑنے کا موقع مگر جو

الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ذَلِكُمْ لَعْنَتِي

ان میں سے افسانے ہیں اسراں سے لینی انکے اعتراضوں سے، نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کمال

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۲﴾

کروں تم پر نفع اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

اور (دوسری حکمت تو یہ قبلہ میں یہ ہر کہ مادۃ اللہ جاری ہو کہ) ہر مذہب نے

راہ ہے چونکہ شریعت محمدیہ میں ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت

سب پر ظاہر ہو چکی، سو (مسلمانوں) تم راہ اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے، نیک کاموں میں آگے

بڑھنے کی کوشش کرو، کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ تم خواہ کہیں ہو گے

(لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو اپنے اجلاس میں حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکوں پر جزا اور اعمال

بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور اس حکمت کا مقتضار بھی

یہی ہے کہ جس طرح حضرت کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ

سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (سناڑ میں) مسجد حرام کی طرف رکھ لیجئے، (غرض حضور و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور)

من جانب اللہ ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بخیر نہیں۔

تو یہ قبلہ کی تیسری حکمت اور (مکرر مکرر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور

حضرت بدر جہاؤنی، اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھتے، اور اسی طرح سب مسلمان بھی
 کرتے ہیں کہ تم لوگ چنان کہیں (موجود) ہوا پنا چہرہ (نماز میں) اسی (مسجد حرام) کی طرف دکھا کر واد
 یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ ان مخالفت (لوگوں کو تمنائے مقابلہ میں (اس) گفتگو کی مجال
 نہ ہو، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موجود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں قریہ
 بھی ہے کہ ان کا اصل قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ قریبت القدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت
 ہے توہل قبلہ کی، ان (مکرمین میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں وہ اب بھی کٹھ جھتی بھالیں گے،
 کہ یہ کیسے نہیں ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہل اعتراضوں
 سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا، تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو اور ان کے
 اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو اور کچھ سے ڈرتے رہو کہ میرے احکام کی مخالفت
 نہ ہونے پائے کہ یہی مخالفت البتہ ہم کو مضرب (اور ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے
 کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو کچھ (میرا انعام) (اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخل بہشت
 کر کے، اس کی تکمیل کر دو اور تاکہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر یعنی اسلام پر قائم رہنے والو
 میں (رہو جس پر وہ تکمیل نعمت مرثب ہوتی ہے)

معارف مسائل

تحويل قبلہ کی حکمتیں [مذکورہ آیات میں تحويل قبلہ کیلئے الفاظ قرآن و جہلک شطۃ المسجد الحرام میں
 مرتبہ آئے ہیں اور حینما کنتم کوکوا و کونہکم شطۃ و در مرتبہ اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ
 ہے کہ تحويل قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و شب کا ذریعہ تھا اسی اخذ مسلمانوں کے لئے بھی
 عبادت کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ جکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان
 و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا
 کہ یہ تحويل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

بیان قرآنی کے علامہ تفسیر میں جو تعلیق کی مشورہ کی ہے تو قرطبی بھی اسکی ایک ایسی تفسیر نقل کی ہیں جس میں یہ مشورہ
 فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا قرآن و جہلک شطۃ المسجد الحرام و حینما کنتم کوکوا و کونہکم شطۃ
 شطۃ یہ حکم حالت حضر کا ہے، کہ جب آپ اپنی جگہ مغیر میں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں
 اور پھر فری امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور حینما کنتم کوکوا کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور
 شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ ہوا اپنی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے میں حینما کنتم کوکوا کے الفاظ
 نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات
 بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کر لے گا سلسلہ
 ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کر کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ و حینما کنتم کوکوا
 کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے اس
 تیسری مرتبہ کے اضافہ کے ساتھ تحويل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہے کہ کافق
 نہ ملے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ تو قرأت و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول
 کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

و لکن و جہلک شطۃ المسجد الحرام و حینما کنتم کوکوا کے معنی لغوی، جس چیز کی طرف رخ کیا جا
 حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ اور حضرت ابن بن کعبؓ کی قدرت میں اس جگہ
 (جہلک) کی بجائے قبلہ بھی منقول ہے، مراد آیت کی چھوڑ مغیرہ کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی
 طرف وہ عبادت میں رخ کرتے ہیں مختلف ہو، خواہ منجانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انھوں نے
 خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، ہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے
 آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ معسر کر دیا گیا تو
 انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں [فاسْتَبْشِرُوا الْخَيْرَاتِ۔ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں
 سے اجتناب کی مسابقت کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس کو
 اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو
 کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے
 اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش
 اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں شمشتی کرنا عموماً آخرت سے
 غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر و توجہیں ہو رہے کبھی فضول بحثوں میں
 نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے
 لئے ارشاد فرمایا، آئِدَمَا تَكُونُوا آيَاتٍ يَكُونُ اللَّهُ جَوِيضًا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں
 ارجحیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہو اور عنقریب وہ
 دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقلمند
 کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی سبذول فرمائی ہو
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں
قرآن نے فرمایا کہ تم آگے بڑھنا کہات یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ انفال میں تمنا آخرت کے
اور سورۃ حجر کے آخر میں تمنا آخرت کے آگے اٹھنا ہے۔

قَدْ كُنْتُمْ فِي آذُنْكُمْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان
سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان فرجبان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا رحمہ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گھاؤ منسر
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان
کو تو اپنی طاعت میں لگایا (شرطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہو کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منسرایا
اس لئے کہ قرآن کریم کے مدد سے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی
کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں
اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو

فمن لم یطیعہ لم یمن کونہ وان
کثر صلواتہ وتسبیحہ

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خوزیمہؒ کا ایک حدیث بھی اس معنوں کی نقل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزیں
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی روایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش
ہوتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا یا کرتا ہے، اور ہر کی آیتوں میں اس اعتراض
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طابع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بچ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اسے ایمان والوں، طبیعتوں میں عمیق ہکا کرنے کے واسطے میں، صبر اور نماز سے سہارا
اور مدد حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے

ساتھ رہتے ہیں، زار نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی سبذول فرمائی ہو
ایں ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں
قرآن نے فرمایا کہ تم آگے بڑھنا کہات یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورۃ انفال میں تمنا آخرت کے
اور سورۃ حجر کے آخر میں تمنا آخرت کے آگے بالمشیقین آیا ہے۔

قَدْ كُنْتُمْ فِي آذُنْكُمْ، ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں جن کا تعلق قلب سے ہے، زبان
سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان فرجبان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی
وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو مولانا دہلوی نے اس کے متعلق فرمایا ہے
بر زبان تسبیح در دل گھاؤ منسر
ایں چنین تسبیح کے دارد اثر

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول
ہو مگر اس کا دل حاضر نہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؓ سے کسی
ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس
نہیں کرتے، آپ نے فرمایا اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان
کو تو اپنی طاعت میں لگایا (شرطی)

ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہو کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا
ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمانؓ ہندیؓ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس
وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے، منسرایا
اس لئے کہ قرآن کریم کے مدد سے کے مطابق جب کوئی بندہ مومن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ
تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں
مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب
اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا، حضرت سعید بن جبیرؓ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری
سے کی ہے وہ فرماتے ہیں:

فمن لم يطيع الله لم يسمع كلامه
كثير صلواته وتسبيحه
یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی
نہ کی اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں
اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو

ذکر اللہ کی اصل حقیقت قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خوزیمہؒ ذرا ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے

جس کا ترجمہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی
اس کے احکام مطاع و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی رنفل، نماز روزہ وغیرہ
کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر)
اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے
میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزیں
کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے مذاہب نجات دلانے
میں ذکر اللہ کے برابر نہیں، اور ایک حدیث مذہبی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہوش
ہوتے رہیں، ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالہ ذکر اللہ میں جمع کر دیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر

الصَّبْرِ ۝۵۳

کرنے والوں کے ساتھ ہو

رابطہ، تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام
پر جو اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جا یا کرتا ہے، اور دوسری آیتوں میں اس اعتراض
کا جواب دے کر اس اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طابع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص
جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں بچ اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت
آئندہ میں تخفیف حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر اسے ایمان والو! طبیعتوں میں غم ہٹا کرنے کے واسطے میں صبر اور نماز سے سہارا
راہ و مدد حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے
ساتھ رہتے ہیں، راہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت
ہو، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی۔

معارف مسائل

مبراہ نماز ہر شکل کامل | اِشْتَعَيْنَا بِالصَّلٰوةِ الصَّلٰوةَ، اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی اور ہر تکلیف کا علاج میں تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب کا علاج کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر و دوا ہے۔ مرکب ہے ایک مبراہ دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح سے اشارہ کر دیا ہے کہ اِشْتَعَيْنَا کو عام سمجھو اس لیے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی، کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہو، تفسیر منظر ہی میں اس عموم کو واضح کر دیا ہے، اب اس درجہ کی نفع کے دونوں اجزاء کو سمجھ لیجئے۔

مبرک اصل حقیقت | مبرک اصل معنی اپنی نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں مبرک کے تین شعبے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادت کی پابندی پر مجبور کرنا، تیسرے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا امیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی کے اظہار کا کوئی حکم بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن سعید بن جبیر)

یہ تینوں صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دوسرے جو صبر کی اصل اور بنیاد میں عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں، بعض روایات میں ہے کہ عشر میں نماز کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا حتما جنت میں داخلہ کی اجازت دی جاتی جائے گی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ الْمُتَذَكِّرُونَ اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۱۰۴) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جز اس نسخہ کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکسیر ہے نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جدا گانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادات میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر مجبور بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے

بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالت نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں و مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درد گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو یا تھ یا تھ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا، مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں اس طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے، بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے، ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی ہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت اللہ تعالیٰ اس ہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہے:

اِذَا حُزِبَ مِنْ رُفْعِ اِلَى الصَّلٰوةِ | یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی منور

پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرما کرتے تھے،

مبراہ نماز تمام مشکلات و مصائب | اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ، اس کلمہ میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر نجات کا سبب اس لئے ہے کہ مبراہ حل مشکلات اور دفع مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حامل اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، یہ ہے کہ صبر کے نتیجہ میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کوئی کام رک سکتا ہے اور کوئی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مرے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن

لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَكَتَبَلُوْا نَفْسَكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ

تم کو خبر نہیں، اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو کھڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّمْرِ تِ وَبَنِي الشَّهِيدِينَ ۝۱۵۷

ان کے اور جانوں کے اور میروں کے اور خوش خبری دے مہر کرنے والوں کو کہ جب

إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۸

پہنچے ان کو مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جا رہے ہیں ایسے ہی

عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝۱۵۹

لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور ہرانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

رابطہ | اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی آیات آئندہ میں اور بھی بعض واقعات غلامیہ طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں جن میں قتل و قتال مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، اور وجہ سے اول بوجہ اعظم ہونے کے کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجہ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا،

خلاصہ تفسیر | اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دین کے واسطے قتل کئے جاتے ہیں ان کی ایسی فضیلت ہو کہ ان کی نسبت یوں بھی مست کہو کہ وہ معمولی مُردوں کی طرح (مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں، لیکن تم اپنے موجودہ حواس سے اس حیات کا اور اک نہیں کر سکتے، اور دیکھو، ہم صفت رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضایا ایمان کا ہے، تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ هجوم مخالفین یا نزول حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور کسی قدر فقر و فاقہ سے اور کسی قدر مال اور جان اور بھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مرگے یا کوئی آدمی مر گیا یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا، اور جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آؤں اور مستقل رہیں تو آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے جن کی یہ عادت ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ ردل سے سمجھ کر یوں کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد و حقیقتہ) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں (اور مالک حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے ملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جاسنے والے ہیں، سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جاکر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مہذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشترک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت حال تک، رسانی ہو گئی کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے۔

معارف مسائل

شہداء اور انبیاء کی حیات برزخی یہ قوسب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی روش سے ہر مرنے والے کو اور اس کے درجات میں تفاضل برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ فہر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات ہیں ایک درجہ قوسب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجہ انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنۃ اور شبہات سے پاک ہو، اس کو سیدی حضرت بحیم الامتیت تمھارویؒ نے بیان القرآن میں واضح فرمایا ہے، اس جگہ اس کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

فت: ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مُردوں کی سی موت سمجھنے کی نفی کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزاء و سزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مُردوں سے ایک گونہ امتیاز، جو اور وہ امتیاز یہ ہو کہ اس کی یہ حیات آثار میں اور دونوں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مُردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلات معمولی مُردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے، کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو احیاء کہا گیا، اور انکو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی مانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مُردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، ان کی ازدواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آ سکتی۔

پس اس حیات میں سب قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء پھر اور معمولی مُردے،

البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس شہداء کے شریک ہیں، سو مجاہدہ نفس میں مرنے کو بھی حق شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہونگے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مسرورن کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہر تہہ و دو سرے لوگ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر دوسرے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہو اور اگر فحشا ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائط شہادہ ہو، تاویل قطعی تو اثر وغیرہ سے ثابت ہو، جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے، تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھائی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام اور انواع کی وحاشیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دوسرے اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اغلاط و اجسام بیہلہ مثل آب آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد المات انبیاء کی حیات قبل المات سے اتنی نہیں، اور بعض حصّہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزاء غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جائیں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہو کہ اعتناء از اجساد شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات زیادہ مرتبت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جائیں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارق عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ و تہذیب اور حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مرکب نہیں ہوتا اس لئے لا شعور کن فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

معنا یہ ہے کہ آسان ف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت کرنے کی خاص تدبیر آیت وَاِذَا ابْتَلٰی اِبْرٰہِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ کٰثِرٰتٍ لِّیْکُنْ مِنْ اُولٰٓئِکَ اَلْمُقٰہِدِیْنَ اور حواریت کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دقت کوئی مسئلہ

پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو کچھ لینا چاہئے کہ دنیا دارا لمن ہے یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے، اس لئے یہاں کے حواریت کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفس عمل صبر میں سبب شریک ہیں، اس لئے اس کا حاصل مشترک تو عام رحمت ہو، جو نفس صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا حاصل جدا جدا خاص غنائتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دنیا میں مواقع انعام پر دعوت طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو مل سکتے ہیں، قدر اعلیٰ و الخیریت و الخیریت دینے جاتے ہیں۔

مصیبت میں اتنا بردبار نہ ہو کہ کچھ نہ کرے | صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے تو تکلیف طلب کا بہترین علاج ہے | وقت ان اللہ و اتالیقہ را جوں کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہو کہ مصیبت و انوں کو ایسا ہنسنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے کچھ کرے الفاظ کہ جائیں تو غم درخ کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّ الصَّافِیْنَ الْمَرْوۃَ مِنْ شَعَابِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیۡتَ اَوْ اَعَمَّرَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی سوجھ بوجھ کر بیت اللہ کا یا عمرہ

فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطُوۡفَ بِہِمَا وَاَوْ مِنْ تَطَوُّعٍ خَیۡرًا وَّ اِنَّ اللّٰہَ

تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ

شَاکِرٌ عَلَیۡہِٗمۡ ۝۱۵۸

قدر دان ہے سب کچھ جانتے والا

رابط آیات متقدمہ میں وَاِذَا ابْتَلٰی اِبْرٰہِیْمَ رَبُّہٗ سے درر تک خانہ کعبہ کا فضل ذکر ہوا، جو چہ کے اوّل میں خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دعائے ابراہیم کی حکایت تھی کہ انھوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکام مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہو، پس بیت اللہ کا مقصد ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیت آئندہ میں اس کے مقصد حج و عمرہ بننے کے مطلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ

صفاد مردہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں، جس کو سعی کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہی جڑی تھی، اور اس وقت صفاد مردہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجب گناہ ہو، اور بعض جاہلیت میں ہی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہو کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمایا مقصود ہے، پس مضمون سابق میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر اعتراض کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمون لاحق میں کعبہ کے مقصد حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفاد مردہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمایا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصہ تفسیر | صفاد مردہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کر رہا کیونکہ تحقیقاً صفاد مردہ داران کے درمیان میں سعی کرنا منجملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا اس کا عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان سعی کے محدود طریقہ کے مطابق آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے) اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امر خیر ہے، اور رہائے میاں کا ضابطہ ہو کہ جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ اس کی بڑی قدر دانی کرتے ہیں اور اس خیر کرنے والے کی نیت و غلوں خوب جانتے ہیں، پس اس ضابطہ کی نوسہ سعی کرنے والے کو بمقدار اخلاص ثواب عنایت ہوگا۔

معارف مسائل

بعض لغات کی تحقیق | شاعر پر اللہ، شاعر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، شاعر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیے ہیں، حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص خاد کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعال مخصوصہ کے ادا کرنے کو حج کہا جاتا ہے، عمرہ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں اور اصطلاح شرع میں مسجد حرام کی حاضری اور طواف سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفاد مردہ کے درمیان حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہی امام احمد کے سن واجب ہر نزدیک سنت مستحب ہے، اور مالک اور شافعی کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے، کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ کے الفاظ سے پر شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفاد مردہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت

ہو اگر سعی باعات میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان لا یجتاح کا سوال کی مشابہت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفاد مردہ پر بتوں کی عورتیں رکھی تھیں اور اہل جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفاد مردہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنت ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْكِتَابِ وَالْهُدَىٰ مِنْ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے انارے سات حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے

تَعْلَىٰ مَا بَشَرُ لِّلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ

کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں

الْعَالَمُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا أَنَّهُمْ كُفَرُوا

ان پر لعنت کرنا چاہئے، مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور میان کر دیا حق بات کو قرآن کریم

عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا

کرتا ہوں اور میں ہوں پڑا سات کرنا لا ہدایت ہر ان، بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مرتے

وَهُمْ كُفَرُوا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ

کافر ہیں انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی

أَجْمَعِينَ ۝ خُلِدَ لِنِ فِيهَا لَا يَخْفَىٰ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَ

سب کی، ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں نہ ہٹا ہوگا ان پر ہے عذاب اور

لَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝

نہ ان کو ہمت ملے گی۔

ربط | اور پر بحث قبلہ کے ضمن میں صاحب قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں الَّذِينَ اقْبَلُوا الْكِتَابَ یعنی قومہ الیٰ ذلٰکَ یُکْتُمُونَ الْکِتٰبَ آئے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمان حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر دعائی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اخفاء کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفاء بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان مضامین کو کتاب (والہی توراۃ و انجیل) میں نازل فرما کر عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے ان کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتر سے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہی ان پر لعنت بھیجتے ہیں) کہ ان پر بددعا کرتے ہیں (ہاں) مگر جو لوگ (ان اخفاء کرنے والوں میں) اپنی اس حرکت سے (توبہ) یعنی حق تعالیٰ کے رو بروئے شہر سے معذرت کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہو گئی تھی) آئندہ کے لئے اس کی اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفاء کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے) اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہار معتبر عند الشرع یہ ہے کہ اسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوت محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں، تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے کہ توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے) البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لادیں، اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی راستہ میں رہیں گے (جہنم میں رہیں گے) اور ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا اور ہمیشہ ملعون رہنا ہی ہو، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت (ان پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) ہلکت دی جائے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے، جب کہ مقدمہ میں گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر ازل ہی پیش میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلا نا واجب | آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے | جو ہدایات و نجات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا ناشائستہ

بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے :-

اول یہ کہ جن علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَتَلَ عَنْ عِلْمٍ يَكْتُمُهُ فَكَلَّمَهُ	یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہو
الْجَمْعَةُ النَّفَقَةُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے اگر وہ
يَلْتَجِئُ إِلَى النَّارِ (رواہ ابوہریرہ)	اس کو چھپا کر قیامت کے روز اس کے منہ میں
وَمَنْ بَيَّنَّ الْعِلْمَ أَخْرَجَهُ ابْنُ مَرْثَدَةَ (ازنہ)	اللہ تعالیٰ آگ کا نظام ڈالیں گے۔

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جب کہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کر لو (قرطبی، جصاص)

دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرأت نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل سے متعلق ہے، جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہو، باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتاب علم کے حکم میں نہیں ہو آیت مذکورہ میں لفظ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْأَشْكَالِ سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناتے ہو جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ عوام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کر دو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر حکام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی کر دو اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد کہتے ہیں هَذَا أَوْشَا يُغَرِّى وَلَا يُغَرِّى

یعنی یہ مسئلہ ایسا جو کراہی علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلا نا چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَسْتَعْمُوا الْحِكْمَةَ أَهْلَهَا
فَتُظْلِمُوا هَمًّا وَلَا تَقْصُوا هَاتِي
عَائِرَ أَهْلِهَا فَتُظْلِمُوا هَمًّا

یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ دو کہ
جو اس بات کے اہل ہوں اگر تم نے ایسا کیا تو ان
لوگوں پر ظلم ہوگا اور جو اہل نہیں ہیں ان کے

سامنے حکمت کی باتیں نہ دکھو کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کس کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو یا کوئی مبتدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علم دین سکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کس بادشاہ یا حاکم وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعہ وہ رحمت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکام دین میں رخصتیں اور جیلوں کی صورتیں بلا ضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ احکام دین پر عمل کرنے میں حیلہ چوٹی کے مادی بن جائیں (قرطبی)۔

حدیث رسول بھی قرآن مجید بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہو کر انھوں نے فرمایا اگر قرآن کی حکمت میں ہے ۱۱۱ یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا، آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کمان علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہو، ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایات حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کمان علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کمان کی وعید ان لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحت ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھا کر اس کے انکار کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوگا کہ **وَيُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ تَتُوبُ** میں تشرآن کریم نے لعنت کرنے والوں کو اس پر ماری مخلوق لعنت کرتی ہو کہ متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرنے میں، امام تفسیر مجاہدؒ اور مکرّمؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور وحشرات الارض بھی ان پر لعنت

کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بد اعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے، حضرت ہر ابن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ **الْكَافِرُونَ** سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں (قرطبی بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن)۔

کسی شخص پر لعنت اس وقت تک جائز **وَمَا كُنَّا أَهْلًا لَّهَا** کے لفظ سے جنہاں اور قرطبی وغیرہ نے نہیں جب تک اس کے کفر پر نہ کاغذ ہو یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں دوسرے کا تعین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاصہ کا تعین علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منہا نب اللہ علم ہو گیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہو کہ کسی کافر پر بھی مقرر ہو جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس کی بدعت کفر ہی پر ہوگی، تو کبھی مسلمان پر یا کسی حالور پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں خصوصاً عمرتیں کہ بہت بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ لعنت ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں، لعنت کے اصل معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود و راندہ و رگلائے شمار اور غیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

وَالْفُكْمُ إِلَهُ وَاحِدٌ، لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ

اور مہودم سب کا ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلنے رہنے میں

وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ

اور کشتیوں میں جو کہنے کر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کما کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہنا آنا

اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَخْيَارُهُ الْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ

اشرے آسمان سے پھر چلایا اس سے زمین کو اس کے مرچنے پیچھے اور

بَشَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ مِّنْ ذَاتِ نَفْسٍ زَلَّيجٍ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

بھیلائے اس میں سب قسم کے جانور اور ہواؤں کے بدلنے میں جو کہ تابعدار ہے

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَبْتَ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۶۳﴾

اس کے مابین آسمان و زمین کے بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں برآئین عقلیت کے

رابطہ | مشرکین مریئے جو آیت وَاللَّهُكُمُ إِلَهٌُ وَاحِدٌ اپنے عقیدہ کے خلاف سن تو توجہ سے کہنے لگے کہ ہمیں سائے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق رہ تو ایک ہی معبود (حق) خلاصہ تفسیر | ہر اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمن ہے، رحیم ہے،

راور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدین کمال صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہو پس جو سب معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنائے ہیں اور بجے بعد و بگیرے رات اور دن کے آئے ہیں اور جہازوں کے چلنے میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں راور اسباب ہلے گوا اور بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تم نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تر و تازہ کیا، اس کے خشک ہونے پیچھے پانی

اس میں نباتات پیدا کئے، اور ان نباتات سے ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دیے کیونکہ حیوانات کی زندگی اور تولید و تناسل اس غذائے نباتی کی بدولت ہے، اور ہواؤں کی (رحمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں رکہ کبھی پر داسے کبھی بچھا کبھی گرم ہے کبھی سرد، اور ابر کے (وچنے میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل توحید کے موجود ہیں، ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف مسائل

توحید کا وسیع مفہوم | وَاللَّهُكُمُ إِلَهٌُ وَاحِدٌ۔ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک ہر تحقیق عبادت میں یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا

تجزیہ و تقسیم ہو سکتی ہے۔

جو تھے یہ کہ وہ ایک ہی یعنی اپنے وجود ازلی ابدی میں ایک ہی وہ اس وقت بھی موجود تھا، جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہی گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حقیقتیں توحید کے ملحوظ ہیں (جہاں) اس کے بعد حق تعالیٰ کے واضح حقیقی ہونے پر ٹکونی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جنکو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے، کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے دائمی انقلاب اس کی قدرت کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں، اگر ان چیزوں کی پیدائش اور بقاء میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اس طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیت قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جو ہر سال بنا دیا کہ زمین اور سیال ہونے لگے، اور اسکی پیچھے پر لاکھوں وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر پانی حکمت کے ساتھ ان کے تھجہ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنا اور چلانے والا کوئی بڑا عظیم و خیر اور حکیم ہے، اگر پانی کا مادہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہو سکتا، اور مادہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا لمبی لمبی مسافرت طے کرنا ممکن نہیں، قرآن کریم نے اس مضمون کو فرمایا،

إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِبَ عَلَيْهَا ظُهُورُهُمْ (۲۲: ۳۳)
اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دینا
اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کھڑے رہ جائیں۔

یَسَّيْرُ الْفُلَيْنِ الشَّامِ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہونچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینہ کے پانی کا کوڑا اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہو جانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمائیے

ارشاد فرمایا:

فَأَشْنَسْتُ لِمَنِي الْأَرْضَ بِحُلِّي وَأَنَا لَكَ يَا ذَا الْجَلَالِ
وَالْإِكْرَامِ ۝ (۱۸: ۲۳)

میں نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا،
اگرچہ میں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا
برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔

مگر قدرت نے پانی کو اہل زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور
حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر تار دیا اور
پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچا دی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا اور
اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برت کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لا دیا جو
سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پھیل کر زمین کے اندر تراتی
پائپ لائن کے ذریعہ پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیت مذکورہ میں قدرت کا ملکہ کے چند مظاہر
کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علماء مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے،
رہتے جہاں، قلبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ إِندَادًا يُحِبُّونَهُمْ

اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے

كُتِبَ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ

محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ

ظَلَمُوا أَذْيَرُونَ الْعَذَابَ ۚ إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ

ظالم اس وقت کہ جبکہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ

شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝ (۱۹)

کا عذاب سخت ہے۔

رابطہ | اوپر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر | اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک

(خدا تعالیٰ) سترار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت
اللہ سے رکھنا ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ
کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے
بھگ پر کوئی ضرر چڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع و ضار
حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت و رضا اس کی پائی رہتی ہے، و نیز اکثر مشرکین
مصیبت شدیدہ کے وقت اپنے شرکار کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومنین من حیث الایمان
مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاررات میں اپنے قضایا باعتبار حالت غالبہ کے
بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت
کو دیکھتے تو (اس کے وقوع میں غور کر کے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے،
اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا
اور نہ ایسے وقت میں اود کوئی یاد رہا، اور اس مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے،
کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) کہارا ہوا ہے اور بھی سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے
سے تراشیدہ معبودوں کا عز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت مشکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار
کر لیتے)

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ

جب کہ ہزار ہو جاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے جو کہ ان کے پیرو ہوتے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ (۲۰) وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا

اور منقطع ہو جاویں گے ان کے سب علاقے، اور کہیں گے پیرو کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف

كُورَةٌ فَنَقَّبَرْنَا مِنْهُمْ كَمَا تَنْبَرُونَ ۚ وَإِنَّا لَنَكِيدُ لَكُمْ يَوْمَئِذٍ

لوٹ جانا بل جانا تو ہم ہم میں ہزار ہو جاتے آگے جیسے یہ ہم سے ہزار ہو گئے، اسی طرح یہ دکھائے گا اللہ

أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ (۲۱)

ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں تار سے۔

رابطہ | اوپر عذاب آخرت کو سخت فرمایا ہے آگے اس سخن کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

(وہ سختی عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جب کہ ان مشرکین میں سے (وہ زندگی) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عوام) لوگوں سے صاف الگ ہو جاویں گے جو ان کے کہنے پر پڑے تھے اور سب (عوام و غیرہ) عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے وہ ایک تاج تھا اور سراسر متبوع تھا وغیرہ وغیرہ اس وقت سب قطع ہو جاویں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں اور نتیجہ معذرت کے وقت سب الگ الگ پچھا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہدگر مشناخت تک کے منکر ہو جاتے ہیں) اور (جب) یہ تاج ٹوٹ (مقبولین کی بطوطا پٹی دیکھیں گے تو بڑے جھجکاویں گے، اور تو کچھ نہ ہوئے) مگر جلا کر ایدیں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا میل جا رہے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تاج ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے صاف (محکما) جواب دے کر) الگ ہو جاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہیں کہ جناب آپ دیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آئے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی انکی بد اعمالیوں کو خالی ارباب (کے پیرائے میں) کر کے ان کو دکھا دیں گے اور ان (تابعین و متبوعین سب) کو دوزخ سے نکلنا ہمیں نصیب ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خود فی النار ہے)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُلُوعَ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ١٦٩

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیردی نہ کرد شیطان

الشیطان انہ لکم عدو مبین ۱۶۹

کی بیشک وہ تمہارا دشمن ہے صریح، وہ تو ہمیں حکم کرے گا کہ بڑے کام اور جیانی کرو

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ١٧٠

اور کہو اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

خلاصہ تفسیر

(بعض مشرکین جنوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منتفع ہونے کو باعث) ان کی تعلیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الہی اور موجب رضائے حق و وسیلہ تقرب الی اللہ بواسلہ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی، حلال

پاک چیزوں کی نسبت اجازت، اگر ان کو کھاؤ (برقو) اور ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ کچھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اثر راضی ہوگا یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم شیطان کے قدم قدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے وہ اپنے اپنے خیالات و خیالات سے تم کو خسران ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (مشرک، بڑی اور گندی ہیں، اور یہ بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف و مسائل

حَلَالٌ طَيِّبٌ، لفظ حَلَال کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کر دی گئی ہو یا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹا دی گئی، حضرت سہل بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے، حلال کھانا، فراغت ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا، اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہو اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُلُوعُ، خلوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خلوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خلوۃ شیطان سے مراد شیطانی اعمال و افعال ہیں۔

الشَّيْطَانُ، سورہ وہ چیز جس کو دیکھ کر عقلمند شریف آدمی کو دکھ ہو، فحشاء، بے حیائی کا کام، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ سورہ سے مراد مطلق معصیت اور فحشاء سے مراد کبر و جبروت ہے، اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ شَيْطَانُكُمْ بِالسُّوءِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ، ایسا ہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی ابھام داخل ہوتا ہے اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی دوسرے کا اثر ہوتا ہے کہ بڑے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور ابھام فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام و فلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔

مسئلہ: ساند وغیرہ جو بتوں کے نام پر پھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور عرفاء، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نام زد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا بھی چار آیتوں کے بعد وَمَا أَهْلُ بَيْتِهِ يَخْلُفُوكَ تَحْتَ آتِ الْآيَةِ النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقدس اس فعل کی حرمت و ممانعت ہے کہ

غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب افعال ناجائز اور انکارنا گناہ ہے۔

تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہو کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بہتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر رکھاؤ، اور اگر ایسی حرکت چھالت سے ہو جائے تو اصلاح نیست کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو قطعاً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار درجن کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے چھالت یا عقلیت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرام سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلْفَيْنَا

اور جب کوئی ان سے کہے کہ کتابعداری کرو اس حکم کی جرک نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو ابعداری

عَلَيْهِ آبَاءُ نَدَا أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

کرجا انکی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپے ادوں کو بھلا اگرچہ ان کے باپے انے نہ کہتے ہرگز بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ،

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعُو بِمَا لَا يَتِمُّ إِلَّا دُعَاءٌ

اور مثال ان کافروں کی ایسی ہے جیسے کچھ کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ گئے سوائے پکارنے

وَنِدَاءٌ مُّذْمُومٌ عَلَيْهِمْ لَا يَعْقِلُونَ

اور پکارنے کے بہرے گئے اندھے ہیں سورہ کچھ نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر

کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو جواب میں کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختصار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر تو فرماتے ہیں) کیا ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے)

اگرچہ ان کا پادار (دین کی) نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ کسی آسان کتاب کی ہدایت رکھتے ہوں، وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعُو بِاللَّهِ وَأَعْقَلُونَ، اور ان کافروں کی کیفیت (دافنی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بزدلانے اور پکارتے کے کوئی (پرہیز) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات باطل) بہرے میں (مگر یا سننا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کہ کچھ نفع نقصان نظری نہیں آتا) سو (جب سارے ہی جو اس شخص میں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندس تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی اس طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا، جس کی طرف دو غفلتوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقِلُونَ اور لَا يَعْقِلُونَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں عقل تھی نہ ہدایت، ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد و تعویض شرعی سے مستنبط کئے گئے۔

تو وہ ان کے اتباع و تقلید کے حرم جواز کی یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس مشرک و سنت کا علم ہو، اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحت قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو تفویض قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور اند مجتہدین اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلید ائمہ مجتہدین کے خلاف کی تقلید میں فرق اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام مشرطی نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آباء کے منوع ہونے

کا جو ذکر اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورۃ یوسف میں اس طرح آئی ہے:

إِنِّي نَزَّيْتُ وَلِيَّةَ قَوْمٍ لَا يَفْقَهُونَ
بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ لَمَّا كُتِبُوا
ذُكِّرُوا وَلِيَّةُ آبَائِي لِيُضِلُّهُمْ
إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ (۱۲: ۲۸-۳۰)

میر نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا
جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے
منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آباؤ اجداد
السنن اور یعقوب کا۔

اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حتیٰ میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

امام سترلین نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں اور فرمایا ہے،

تعلق قوم بمن والایۃ فی ذم التقلید
والی، وهذا فی الباطل صحیح امتا
التقلید فی الحق فاضل من اصول
الدین وعصمة من عصم المسابین
یلجاء الیہا الجاہل المقصر عن
درک النظر
(قطبی ص ۱۹۳، ۲۳۷)

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت
میں پیش کیا ہے اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح
ہو، لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی
تعلق نہیں حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول
میں سے ایک مستقل بنیاد ہے اور مسلمانوں کے
دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو
فحش اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ دین
کے معاملہ سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا

لَهُ إِن كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿۱۰﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کے بندے ہو ۱۰۔ اس نے تم پر بھی حرام کیا ہے مردہ جانور اور

الذَّمَّ وَلَحْمَ الْخَيْزُرِ وَمَا أَهَلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَن اضْطُرَّ غَيْرَ

پر اور گوشت سور کا اور جس جانور پر ناپاکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا پھر کوئی بے اختیار ہو چکا

بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۱﴾

نہ تو نافرمان نہ گناہگار نہ اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر

اور پر اکل طبیعت کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح
مقصود تھی، آگے اہل ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ
اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں اس کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر
اور اس پر اللہ کے شکر کی تعلیم بھی ہے۔

لئے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہو کہ) جو شرع کی رو سے پاک چیزیں
ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (بر تو) اور (اس اجازت کے ساتھ
پہنچو کہ) حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت و طاعت بجالا کر
بھی اور دل سے ان نعمتوں کو منجانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق
رکھتے ہو (اور تعلق ہو نامسلم اور ظاہری پس و پیش شکر بھی ثابت ہے)۔

رابطہ اور پر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو

حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ
کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ
بھی بتلادیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانور دن کو اپنی
طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے بچنے والوں کی تائید ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے اور ان چیزوں کو حرام
نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گذرا یعنی (مردار جانور) کو (جو باوجود
واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت
کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نام پر
ذبح کیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص
(جو کس بہت ہی) بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ قور کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدر
مزدورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی)
اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ پس بڑے عفو و رحیم کہ ایسے وقت میں یہ رحمت
منرمانی کر گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھا دیا)

معارف و مسائل

حلال کھانے کی برکت اور | آیات مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے اسی طرح حرام کھانے کی نغوت | حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلیہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاگرتا ہے، دعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلیہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے،

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ
وَاغْمِزُوا أَصْلَابَكُمْ ۚ (۵۱:۳۳)

اور نیک عمل کرو۔

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانع قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل سفر پریشان حال اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یا رب یا رب کہتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، ان حالات میں ان کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)۔

إِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ انشا صر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں حرام کی ہیں، جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ انشا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے، قُلْ لَا أَجِدُ فِتْنَةً أَوْذَىٰ، وَإِنِّي مُعَذِّبُ عَلَىٰ طَاعَةٍ (۱۲۵:۷) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہو کہ دوسری آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ صراحت حرمت نامہ ہی کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہو کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حالت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکین مگر اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پھل آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے

تھے، یا اپنے اور پر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم حستناہ نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ صریح مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں: ۱۔ خنزیر، ۲۔ خوک، ۳۔ لحم خنزیر، ۴۔ دہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملائے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

۱۔ خنزیر | جس کو اردو میں مردار کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے تو وہ مردار اور حرام ہو، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت اُجَلِّ تَكْفُفُیْدُ الذَّخِرِ (۹۱:۵) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بنا پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور ٹنڈی کو میتہ کے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے ٹنڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال (ابن کثیر، از احمد ابن ماجہ، دار قطنی)۔

۲۔ معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹنڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے (رحماص)۔

۳۔ اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیردغیر و دھار دار چیز سے زخم لگا دیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جاتا کافی نہیں، کسی آلہ جارح نیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

۴۔ مسئلہ: ہندو کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے | مسئلہ: آجکل ہندو کی ایک گولی تو کدو اور بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض

آیت میں مَوْقُودٌ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائیگا | مسئلہ: آجکل ہندو کی ایک گولی تو کدو اور بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض ماہر کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارح نہیں

بلکہ غارتگر جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، در نہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔
مسئلہ: آیت مذکورہ میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہاں تک مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز یا اختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتابی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔
 (جصاص، قرطبی وغیرہ)

مسئلہ: اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں میتہ کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح علی غلایہ قطعہ کے الفاظ کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم میں اَصْنُوا ذِئْبًا وَبَارِعًا وَشَعَارَهَا أَثْنَا مِائَةٍ وَتَمَنَعًا إِلَى جِبْنٍ (۸۰: ۱۶) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الا شقاع قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں (جصاص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے (جصاص)۔
مسئلہ: مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ: یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں مابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام ابن عمر، ابو سعید خدری، ابو موسیٰ اشعرئی نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (جصاص)

مسئلہ: دودھ کا پیر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے، جس کو عربی زبان میں انفر کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبح جانور کا گوشت چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس

میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام عظیم ابو حنیفہ اور امام مالک اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسف و محمد اور ثوری وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (جصاص، قرطبی)
 یورپ اور روس کے غیر اسلامی ملکوں سے جو پیر بنا ہوا آتا ہے اس میں غیر مذبح جانور کا انفر استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ امام عظیم اور امام مالک کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض غیر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ذبیحہ پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسئلہ: دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے لفظ دم بمعنی خون شامل اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۃ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ مَشْفُوح یعنی پینے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْ ذَمًا مَشْفُوحًا (۱۶۰: ۱۶۰) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجھ جیسے گردہ، تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

مسئلہ: جب کہ حرام صرف پینے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہ و تابعین اور امت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح بھرا، مکھی، مکمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو کھانا دھونا چاہئے (جصاص)۔
مسئلہ: جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خار بھی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

ریمین کو دوسرے کا خون: تحقیق اس مسئلہ کی یہ کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور جب پل دینے کا مسئلہ سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا درودجہ سے حرام ہو، اول اس لئے کہ اعضاء انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاست غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن خطاری حالات اور عام معالجات میں شریعت اسلام کی دی ہوئی ہولتوں میں غور کرنے سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں۔
 اول یہ کہ خون اگرچہ جزء انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل

کرنے کے لئے اعضاء انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، بجائے کے ذریعہ خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہو گئی جو بدن انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرا انسان کا جز بنتا ہے اور شریعت اسلام نے بچہ کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رزق ہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلاوے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دیکر اس سے دودھ پلاوے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْزُقُوهُنَّ
أَجْرَهُنَّ كَمَا لِلْأُمَّهَاتِ

اگر تمہاری مطلق بیوی تمہارے بچوں کو دودھ پلاوے تو اس کو اجرت و معاوضہ دیدو۔
خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جز انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے۔

وَلَا يَأْتِيَنَّ بِأَنْ يَسْعَطَ الرَّجُلُ
بِلَبَنِ الْمَرْأَةِ وَبِشَرِبِهِ لَلَّذِ مَاءٌ

(عالمگیری، ص ۳)
اس میں معائنہ نہیں کہ دوا کے لئے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔
اور مثنیٰ ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے (معنی کتاب الصيد ص ۱۰۲)
اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جز انسانی ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہو اور خون ناپاک، توجرت کی پہلی وجہ یعنی جز انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج دوا کے معاملہ میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مضر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچے گا، غالب ہوا ان مشروطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نفس بشری کی مدد سے جائز ہے، جس میں نقص

کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحت مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوا میں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف تھا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ بحث مداوی بالمحرم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم، اس کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے، جس کا نام ہے "اعضائے انسانی کی پیوندکاری" اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحريم خنزير | تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لحم خنزیر ہے، آیت میں حرام لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، چٹھے سب ہی باجماع حرام ہیں، لیکن لفظ لحم بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں کی طرح نہیں ہے، کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی ہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے حرام بھی، صرف جڑا سینے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے (جصاص، قرطبی)

مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنُ اللَّهِ | چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو کی تین صورتیں | غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع ائمہ حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جسز سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنُ اللَّهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے نادان مسلمان بزرگوں پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذکورہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین رفتار نے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنُ اللَّهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ خواشی بیضاوی میں ہے:

فَكُلْ مَا تَدْرِي عَلَيْهِ يَوْمَ ذَٰلِكَ
اللَّهُ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ دُفِعَ

ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَيْثُ أَنتُمْ
الْعُلَمَاءُ تَوَاقُّوا أَنْ مُسْلِمًا ذَبَحَ
ذَبِيحَةً وَفَصَدَّ بَيْنَ بَيْتِهِ
الْقُرْبَى إِلَى غَيْرِ اللَّهِ صَاحِبِ
مَرْكَبٍ أَوْ ذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مَرْكَبٍ

نیز در مختار کتاب النہای میں ہے:

ذَبْحُ لَعْنَةٍ وَهِيَ الْأَوَّلُ تَحْرِيمٌ
لِوَأَحَدٍ قَبْلَ الْعُكْمَاءِ يَحْرُمُ
لِأَهْلِهِ أَهْلٌ بِهِ يُغَيِّرُ اللَّهُ ذَكَرَهُ
ذَكَرَ اسْمُ اللَّهِ وَأَقْرَبُ الشَّاهِدِ

نام لیا ہوا اس کو کہ ملّا فقہاء کا اتفاق ہو
کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے قرب کے لئے
اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد
ہو جاوے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا
ذبیحہ کہلاتے گا۔

کبھی امیر یا بڑے کے آگے جانور ذبح کیا
تو وہ حرام ہو گا کیونکہ وہ مال الہیہ بغیر اللہ
اللہ میں داخل ہے، اگرچہ بوقت ذبح
اللہ ہی کا نام لیا ہو۔ اور شاہی نے

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مآہل پہ بغیر اللہ کا مدلول صریح قرار نہیں دیا
کیونکہ وہ ہمیشہ عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی
نیست کے اس کو بھی مآہل پہ بغیر اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احتیاط کے
نزدیک یہی وجہ احتیاط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذَبَحَ
عَلَى النُّصُبِ نُصُبٌ اِنْ تَمَّامٌ حَيْثُ رَدُّ كُفَّ جَانِبُهُ، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے
یعنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبودات باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا أَهْلٌ
بِهِ يُغَيِّرُ اللَّهُ ذَكَرَهُ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مآہل کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے
جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذَبْحٌ عَلَى النُّصُبِ (۳۵) کے بالمقابل آیا ہے جس میں
غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیست سے ذبح کرنا مراد ہے،
اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح

عندہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد یہاں کرنا
ہو اور اس یہاں کیلئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت یہاں کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود
نہ ہو تو یہ سنت ضیافت ہے اور جائز ہے اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں ہیزائی کیلئے گوشت کا حصول
ہوتا ہے اور پہلی صورت میں تعظیم کی ملامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت
کھا یا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ فقہاء میں آگے ہی وضاحت کی گئی ہے: وَلَوْ ذَبَحَ لِلضَّيْفِ لَا يَحْرُمُ لِأَنَّهُ سَنَةُ الْفِيلِ
وَأَكْرَامُ الضَّيْفِ أَكْرَامُ اللَّهِ تَعَالَى. وَالْقَائِدُ أَنَّهُ إِنْ قَدَّمَهَا لِأَكْلِهَا كَانَ الذَّبْحُ لِلَّهِ وَالْمَنْعَةُ لِلضَّيْفِ
أَوَّلُ لَوْلَاهُ أَوَّلُ الذَّبْحِ وَإِنْ لَمْ يَقْدَمْهَا لِأَكْلِهَا كَانَ الذَّبْحُ لِلَّهِ تَعَالَى. وَالْمَنْعَةُ لِلضَّيْفِ
عَلَامَةُ شَائِلَةٍ فِيهِ وَاسْتِخْرَاجُهَا مِنْ تَحْرِيمِ ذَبْحِهَا لِأَنَّهَا تَحْرُمُ لِأَنَّهَا تَحْرُمُ لِأَنَّهَا تَحْرُمُ

اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شہی حکیم الامت)

وَجَزَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالْقَبَاحِ
يَا أَيُّهَا الْمُقْسِدُونَ بِالذَّبْحِ بَيْتَهُ
ذَلِكَ فِي إِسْنِخْنَالِهِمْ خَشْيَ غَيْرِ
بِهِ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِي فِي عِلَّةِ
التَّخْرِيمِ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:
قرب کی ملامت تھی کہ جس پہلے ذبح کرنا مقصود
ہو یا ذبح کر کے وقت اس کا نام لیا اور اسے
پکارتے اور یہ واقع ان میں عام تھا یہاں تک کہ
اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل مطلب
قریم ہوا مال کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

امام قرطبی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرام میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ
رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ مائتہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں فرزدق شاعر کے رباب غالب نے ایک اونٹ ذبح
کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی
مآہل پہ بغیر اللہ کے نام لینے میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول
کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ مائتہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث
نقل کی جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے
ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار بھی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار
ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں
یا نہیں؟ اس پر صدیقہ مائتہ نے فرمایا:

أَمَّا مَا ذَبَحَ لِلذَّبْحِ الْيَوْمَ فَلَا
تَأْكُلُوا وَذَلِكَ لِكُلِّ وَابْنِ أَخِيكُمْ
(تفسیر قرطبی ص ۲۵۸)

جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا
وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل
وغیرہ کھا سکتے ہو۔

الغرض یہ صورت ثانیہ جس میں نیست تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا
نام لیا جائے، اول تو اشتراک علت یعنی نیست تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مآہل پہ بغیر
اللہ کے حکم میں ہو، دوسرے آیت وَمَا ذَبَحَ عَلَى النُّصُبِ کا بھی مدلول ہے کہ یہ بھی حرام ہے۔
تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری ملامت لگا کر تقرب الی
غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے
کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مآہل پہ بغیر اللہ اور مآہل پہ
عَلَى النُّصُبِ دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو بھیرہ یا سائبہ وغیرہ کہا جاتا ہے،
اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو نہیں مسترآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ تَحْتِهَا

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام دوا پاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء امت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطراب کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاۃً یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطرابی حالت میں عام علاج اور اضطرابی حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احب عامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطراب اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ عزیضی کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویہ کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطراب مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام دوا پاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدوا المختار قبیل فصلی البیہ

اختلاف فی التداوی بالمحرم و

ظاہر المنہب المنہب کما فی

در مختار میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہے

حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے

میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثم و همنا عن العادری قیل
بیرخص اذا عیلم فیہ الشفاء
ولم یعلم دواء اخر کماتخص
فی الخمر للعطشان و علیہ
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر
ص ۳۵۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ بحر الرائق کتاب
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاۃً
یعنی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكَلِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۖ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَالَمِ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کرتے ہوئے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

پ

پ

استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔
آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ
ہر حرام دوا پاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باقائے فقہاء امت
جائز ہے، ان شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں۔

(۱) حالت اضطراب کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو (۲) دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو
یا موجود نہ ہو (۳) اس دوا سے مرض کا ازالہ عاقلہ یقینی ہو (۴) اس کے استعمال سے لذت
حاصل کرنا مقصود نہ ہو (۵) قدر ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطرابی حالت میں عام علاج اور اضطرابی حالت کا مسئلہ تو شرائط مذکورہ کے ساتھ نص قرآن
دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال سے ثابت اور احکامی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی
ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں، اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر
فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطراب اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز
نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: "اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان
کے لئے حرام میں شفاء نہیں رکھی (بخاری شریف)"

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا،
وہ واقعہ عروہ بن زبیر کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ادویہ کا دودھ اور پشیا استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے
ان کو شفاء ہو گئی۔

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہو،
اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط اضطراب مذکورہ موجود نہ ہوں حرام
دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہاء متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام دوا پاک دواؤں کی کثرت اور ابتلا
عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری
حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

کما فی الدار المختار قبیل فصلی البیہ

اختلاف فی التداوی بالمحرم و

ظاہر الذہب المنہ کما فی

در مختار میں فصل ہر سے پہلے مذکور ہے

حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے

میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس

رضاع البحر و لکن نقل المصنف
ثم و همنا عن العادری قیل
بیرخص اذا علم فیہ الشفاء
ولم یعلم دواء اخر کماتخص
فی الخمر للعطشان و علیہ
الفتویٰ و مثله فی العالم کثیر
ص ۳۵۵

کی مانعت آتی ہے، جیسا کہ بحر الرائق کتاب
الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر
نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی
حادی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما
نے فرمایا دوا و علاج کے لئے حرام چیزوں
کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس
دوا کے استعمال سے شفاء ہو جانا عاقلہ
یقینی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ
پینے کی اجازت دی گئی ہے۔

مسئلہ: تفصیل مذکور سے ان تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو روپ
وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیا کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں
حرام و نجس اجزاء کا وجود مشکوک ہو ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط
بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر

بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَكُونُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارُ وَلَا

تھوڑا سا مال وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات

يَكْتُمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے لئے ہے

أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَالَمِ

عذاب دردناک، یہی ہیں جنہوں نے خرید لیا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَلَ

بدلے بخشش کے، مگر کس قدر صبر کر رہے ہیں دوزخ پر، یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمایا

پ

پ

بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ دی، اور غمنا کوئی خطاب مسلمانوں کو ہر جانا اور بات ہو۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورۃ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، مگر غمنا غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جائے، اور بعض ختم سورۃ تک چلا گیا ہے، جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان ہے، لفظ پڑھ کر الباء۔ عربی زبان میں مطلق خبر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اول آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایثار مال و دقا، عہد و صبر، امان و غیرہ، جس میں شرعی تمام احکام کے بنیادی اصول آگئے، کیوں کہ شریعت کے کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں، عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگئے اس پڑ کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام باقتضائے وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و انفاق و حیض و ایلاء و یتیم و یتیم و نکاح و عدت و قہر و نکاح و جہاد، و انفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملات بیع و شراء، و شہادت بعد ضرورت بیان مشرک و بشارت و وعدہ رحمت و مغفرت پر ختم فرمایا، سبحان اللہ! کیا بلیغ و قریب ہو پس چونکہ ان مضامین کا حاصل پڑ کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعہ کا لقب ابواب الیٰز رکھا جاوے تو نہایت زیادہ ہے، واللہ اعلم۔

خلاصہ تفسیر

ابواب الشیر | کچھ سارا کمال اسی میں نہیں آگیا، کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرو، یا مغرب کو کرو، لیکن (اصل) کمال قریب ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آئے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی) کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، اور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں، اور (سب) کتب (سداویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے عاجتہ) رشتہ داروں کو (اور نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لا چاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی) مال خرچ کرتا ہو، اور (وہ شخص) نماز کی پابندی

(بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) نزلت بھی ادا کرتا ہو اور جو شخص اس رکاز ان عقائد و اعمال کے ساتھ اپنے خلاق بھی رکھتے ہوں کہ اپنے عہد دل کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کر لیں اور اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے) معرکہ (قتال) (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں) یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف ہیں، اور وہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی رکھے جاسکتے ہیں (غرض اصل مقاصد مکافات دین کے یہ ہیں نماز یا کسی سمت کو نہ کرنا اپنی کمالات مذکورہ میں ایک کمال خاص یعنی اقامت صلوٰۃ کے قواعد اور شرائط میں سے ہو، اور اس کے حق میں اس میں بھی حسن آگیا، ورنہ اگر نازل نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو نہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا،

معارف مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کر دیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں عیب جوئی کی فکر میں رہتے تھے ان میں بڑا شور و غضب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا ہے کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی مراد اس سے مطلق چہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جهت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہو گئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کیلئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل پڑ اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے وہ جس طرف رخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہو جائے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب و جهت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعت کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہو جائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلہ ربط آیات بیان ہو چکا ہے، کہ اس آیت سے سورۃ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہوا، جو جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین

کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکام اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بعترہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آگیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ آمَنَ بِاللهِ میں مفصل آگیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَالَّذِي آتَى الزَّكَاةَ تک آگیا، پھر معاملات کا ذکر وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصَّابِرِينَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اشارات ہیں، مثلاً مال کو حشر چ کرنے میں غلے خجّہ کی قید لگا دی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ خجّہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام دغور کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس حشر چ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہو جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آسکے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ آتَى میں جو اس کا مصدر آیا۔ مفہوم ہوتا ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو یہ نہ ہو کہ حشر چ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل ذکر رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کر دیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (جصاص قرطبی)

جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالی میں داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پروقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً زوی القربی، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے فقیران سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر وَالَّذِينَ آتَى الزَّكَاةَ میں، حرت فی

بڑھاکر اشارہ کر دیا کہ ملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے، اس کے بعد وَالَّذِينَ آتَى الزَّكَاةَ کا ذکر بھی

اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ صیغہ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایثارِ عہد کی عادت رائج ہو چکا، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر ناجبر بھی کہیں نہ کہیں کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایثارِ عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی روح ایثارِ معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمال باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف صبر کو بیان کیا گیا، کیونکہ صبر کے معنی ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور ہزائیوں سے بچانے کے، اگر غور کیا جا تو تمام اعمال باطنہ کی اصل روح صبری ہے، اسی کے ذریعہ اخلاق فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیر اسلوب بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ ذکر کیا تھا یہاں وَالصَّابِرِينَ نہیں بلکہ وَالصَّابِرِينَ فرمایا، حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہو اور صابرین اس کا مفعول ہو، یعنی ان سب نیکو کار لوگوں میں خصوصیت سے قابل مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمال مذکورہ میں مدد ملی جاسکتی ہے، اس طرح آیت مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول بھی آگئے ہیں، اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہو گیا۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی، طرفین کے بہت سے آدمی آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔

ان کے جابلانہ اور ظالمانہ مطالبہ کی تردید کرنے کیلئے آیت نازل ہوئی **الْحُرُّ بِالنَّحْرِ وَالْعَبْدُ بِالنَّحْرِ وَالْأَنْثَى** جس کا حاصل ان کے مطالبہ کو رد کرنا تھا کہ

غلام کے بدلے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کوئی مرد قتل کرے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کر دے تو اس سے قصص نہیں لیا جائے گا، مشرآن مجید کی اسی آیت کے شرع میں **أَنْتُمْ صَاحِبُوهُ فِي الْقَتْلِ** اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے، مثلاً **أَنْتُمْ صَاحِبُوهُ فِي الْقَتْلِ** وغیرہ۔

مسئلہ: اگر قاتل عہد میں قاتل کو پوری معافی دیدی جائے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دوستوں سے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورت مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو سزا کے قصاص سے تو قاتل بری ہو گیا، لیکن معاف

ذکر کرنے والے کو نصف دیت (خونیا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خون بہا شریعت میں سواندھ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آجکل کے درجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۲۶ تولے ۸ ماشے۔

مسئلہ: جس طرح ناقص معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جائے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ: مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خون بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بھٹا وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیملہ ہر حق قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابل تقسیم ہے، اس لئے کوئی اولیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معاف کر دیا تو دوسرے وارثوں کا حق قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں انکو دیت (خونیا) کی رقم حسب حصہ ملے گی۔

مسئلہ: قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکم سلطان مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جسزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاء مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاق علماء امت حق قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے (قرطبی)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا

فرمان کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى

دیت کرنا ان باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے

الْمُتَّقِينَ ۚ فَمَنْ يَدَّلْهُ بَعْدَ مَا سَمِعَكَ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى

پر ہیزگاروں پر، پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ اپنی پر

الَّذِينَ يَبْدُلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوَسِّ

ہے جنہوں نے اس کو بولا بیشک اللہ سنیے والا جاننے والا ہے ۔ پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے

جَنَافًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ

والے سے طرفداری کا یگانہ کا پھر ان میں باہم صلح کرانے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۸۹﴾

بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہو

رَبِطِ آيَاتٍ وَخُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

حکم دوم از ابواب البتر وصیت ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے خواہ زندگی میں یا بعد الموت ، لیکن عورت میں اس کام کو کہا جاتا ہو جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

تحریر لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں ، جیسے قرآن میں ہے ، قُلْ إِنَّهُ يُحِبُّ الْخَيْرَ لَشَدِيدٌ (۸۱۱۰) اس جگہ باتفاق مفسرین خیر سے مراد مال ہے ۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حقے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے ، عجم تھا کہ ترک کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے ، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا ، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا ، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہو یعنی :-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے

بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور دیگر اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جائے (اس کا نام وصیت ہی جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری دیکھا جاتا ہے ، پھر جن لوگوں نے اس وصیت

کو سنا ہو ان میں سے جو شخص زہمی (سن لینے کے بعد اس کے مضمون) کو تبدیل کرے گا اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا ، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاوے گا ، تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا ، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو قیسناسنہ سنہتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور حذ در ہونا بھی جانتے ہیں) ، ہاں (ایک طرح کی

تبدیل کی اہازت بھی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے وصیت کے بارے میں کسی غلطی کی یا قصداً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ مستحقان مال وصیت میں نزاع کا خطرہ یا دفریق معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کر لے (مگر وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیل وصیت ہی تو اس شخص پر کوئی دباہر گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) مساف فرماتے والے ہیں اور دیکھنا کہ پر رتم کرنے والے ہیں اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہو ، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)

مَعَارِفُ مَسَائِلِ

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہو جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو اس حکم کے عین جسز ہیں ، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حقے مقرر نہیں ہیں ، ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا ۔ دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے ۔ تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں ۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تراکض صوابہ ونا بعینہ کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا ، ابن کثیر نے تصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا ، یعنی وَلِلرَّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴۱۳) اور حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہی ، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں ، ان کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے (جصاص ، قرطبی) یہی باجماع امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں ، ان کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں ، اس لئے فرضیت وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (جصاص ، قرطبی) یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی ۔

دوسرا حکم وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باجماع امت منسوخ ہے ، اور نسخ اس کا وہ شد متواتر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ أَعْطَىٰ كُلَّ نَفْسٍ بِحَسَنَتِهَا
فَلَا تَصِيَّةَ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۖ الْخُرُوجُ
الَّذِينَ هُمْ عَنْ أَهْلِ بَيْتِهِ
حَسَنٌ مِّمَّنْ

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:
لَا وَصِيَّةَ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ إِلَّا آتَ
تُحْيِيهِمْ أَوْ يُرْسِلَهُمْ
(جصاص)
اس لئے مصل اس حدیث کا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے داروں کے حصے خود مسترر
فرمادیے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت
کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دیدیں تو جائز ہے
امام جصاص نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہاء
امت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیت شریفہ کا
نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علماء امت میں متفق علیہ ہو کہ جب کوئی حکم
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقیناً طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر مشہور وغیرہ
میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے،
اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیت قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محل شبہ نہیں، پھر سنایا
کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے
سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماع صحابہؓ
اور اجماع امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے،
ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر
اجماع نہ کرتے۔

تیسرا حکم، وصیت ایک ہتائی
مال سے زیادہ کی جائز نہیں
یہ باتفاق امت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت
سے ایک ہتائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت
جائز اور قابل قبول ہے۔

تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے
مسئلہ: خود مسترر کر دیئے ہیں ان کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ ہر وارث
اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے
وصیت کرنے کی اجازت ایک ہتائی مال تک ہو۔

مسئلہ: اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے مت و مکہ
مال کے متعلق کرتا تھا، جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب
ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اس پر ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت
واجب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں
کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے
پاس موجود نہ ہو۔

مسئلہ: آدمی کو جو ایک ہتائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی
میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے (جصاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى

اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

اگلوں پر تاکہ تم پر ہنسنا نہ ہو، چاروں روزوں میں گنتی کے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو ان پر ان کی گنتی کے اور دنوں سے

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کون خوشی سے کرو

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ

نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾
سمجھ رکھتے ہو۔

خلاصہ تفسیر

حکمِ صوم

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس موقع پر کہ تم روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ تقویٰ بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی اور اسی عادت کی پشتی بنیاد پر تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہی، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ جو شخص تم میں (ایسا) پیار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا شرعی (سفر میں ہو تو) اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہو، اور بجائے رمضان کے (دوسرا ایام کالاتناہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا (اس پر واجب) ہے، اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہو تو) ان کے ذمہ صرف روزے کا (فدیہ یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے اور جو شخص خوش سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے اور (مگر ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیدی ہے، لیکن تمھارا روزہ رکھنا اس حالت میں بھی زیادہ بہتر ہے اگر تم کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

صوم کے لفظی معنی امساک یعنی نہ کھانے اور نہ پینے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے نہ کھانے اور باز رہنے کا نام صوم ہے، بشرطیکہ وہ طلب و تمنا صادق سے نہ کر غریب آفتاب تک مسلسل نہ کار ہو، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غریب آفتاب تک ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھانی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

صوم یعنی روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عہد اور شعائر قرار دیا گیا ہو، اس کے فضائل بے شمار ہیں جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پہلی امتوں میں روزہ کا حکم دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی

فرضیت کچھ تھا جسے ساتھ خاص نہیں، پہلی امتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوتی، اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں، طبعی بات یہ کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ بالکل معلوم ہونے لگتی ہے (روح المعانی) قرآن کریم کے الفاظ **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ قَوْلَ رَسُولِهِمْ** عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی مشریت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ **مَنْ قَبِلَ كَفَّ** سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں وہ بطور ایک مثال کے ہو، اس سے دوسری امتوں کی نفی نہیں ہوتی (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پہلی امتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلی امتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے ارتقا کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان امور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں منسرق ہوتا رہا ہے (روح)

تَعْلَمُ تَعْلَمُونَ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

مَرِيضٌ كَارِزٌ مریض کا روزہ مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، بعد کی آیت **وَلَا يَزِيدُ فِي كَمَلِ الْعُسْرِ** میں اس طرف اشارہ موجود ہے، مگر فقہاء امت کا یہی مسلک ہے۔

مَسَافِرٌ كَارِزٌ مسافر کا روزہ مسافر کے بجائے علی سفر کا لفظ احتیاطاً فرمایا، کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا:

اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصت سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ **سَفَرٌ** کا مفہوم یہ ہے کہ

وہ سفر پر سوار ہو جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا آسانی میں روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور بعض کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ علیٰ سفیر سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصت سفر کا حق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ علیٰ سفیر نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصت سفر کا بھی مستحق نہیں۔ مسئلہ: اسی سے یہ بھی نکل آیا کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصت سفر کا حق رہے گا، کیونکہ وہ علیٰ سفیر کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مریض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا مان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** منسرا کر اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی، جب کہ مریض صحت کے بعد اور مسافر معتمہ ہونے کے بعد اتنے دنوں کی ہمدت پائے، جنہیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن کے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا یا وصیت فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** میں جو کہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھو، یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیاریہ، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیوں کہ **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ اس آیت کے بے تکلف معنی وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، مگر جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کر دیں، اسکے ساتھ اتنا فرما دیا **وَأَن تَصُومُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ**، یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔ پر حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے یعنی **مَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**، اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں اب بھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص) یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی امید ہی نہیں رہی، جو ہر صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے (جصاص، منظری)۔

یحییٰ بخاری و مسلم و ابوداؤد و نسائی و ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ** نازل ہوئی تو ہمیں خستیاں دیدیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے روزے رکھے جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتدائے اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر شہینہ میں تین روزی اور ایک روزہ یوم عاشوراء یعنی دسویں محرم کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی، **كَيْتَبُ عَلَيْكُمُ الْعِيَامُ** تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو خستیاں ہو کہ روزہ رکھے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت **مَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** نازل فرمادی، اس آیت نے متندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت

أَجِنَ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الَّذِي نَازَلَ مِنْهُ مَا كَرِهَ آسَانِي عِلَافَرَادِي كَرِ الْكَلِّ دَلِ كِي صَح
صَادِقْ كَمَا نَافِيَا وَغَيْرُهُ سَبْ جَائِزْ هِي، سَوَكْرَ أَتَشْنَعِ كَعْبُدْ سَحَرِي كَحَانِي كَوَسْنَتِ قَسْرَارِ
وَيَدِيَا كَلِيَا، صَحْ بَخَارِي، سَلَمُ الْبُورَادِ دَمِي هِي اسْ مَضْرُونِ كِي احَادِيثِ آتِي هِي (ابن كثير)

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف
فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل

کو مال کا طور پر دیدینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مجذومہ کی خدمت کے عوارض پیش نہ ہوں۔
مسئلہ: ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا یا چند روزوں کے فدیہ کو
ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بجزاز قنیہ نقل کیا ہے
اور بیان العشرین میں اس کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت نے امداد الفتاویٰ میں فتویٰ اس پر نقل
کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، البتہ امداد الفتاویٰ
میں ہے کہ احتیاطاً اس میں ہے کہ کسی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دیدینے
میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ امداد الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے
مسئلہ: اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور
دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا (بیان القرآن)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَ

ہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطہ لوگوں کے

بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور دلیل روشن راہ پلنے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی سوچ کوئی پائے تم میں سے اس ہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

تو ضرور فستے رکھے اس کے اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرتی چاہئے اور

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلَا يُكَلِّمُ الْعِدَّةَ

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی

وَلِتُكْمِلُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی اور تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر اور ربط آیات

تعیین ایام صیام اور پرارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے

روہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے، ماہ رمضان ہی جس میں ایسی برکت ہے کہ اس
کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں، قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسان دنیا پر) بھیجا گیا ہے،
جس کا ایک (وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ذریعہ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ
ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالة ہے، اور ان دونوں وصفوں میں

منجملہ ان کتب (ساویہ) کے (ہے) جو کہ انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعہ) ہدایت
(بھی) ہیں اور (وضوح دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں،

سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو
اوپر مذکور تھی منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اہل قانون تھا وہ البتہ

اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ جو شخص (بیمار ہو جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضرب ہو) یا
(شرعی) سفر میں ہو تو اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان

کے، (دوسرے ایام کا راتنا ہی) شمار کر کے ان میں روزہ رکھنا اس پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ
کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کی رعایت، کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام معسر

کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا، اور تمہارے
ساتھ احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام بخیر کر دیتے) اور

یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور
کسی شرعی عذر سے وہ جاریے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ

(ایام ادا یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا
حکم اس لئے کیا، تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثناء) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو ایک

ایسا طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات و ثمرات صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا
واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا، اور (عذر سے خاص رمضان

میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دیدی، تاکہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر
ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)

معارف و مسائل

اس آیت میں پچھلی جمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں آیاتاً متعطفہ کا لفظ بھل ہو جس کی شرح اس آیت نے کر دی کہ وہ پورے ماہ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت بہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اپنی دہی اور آسانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند حسد میں حضرت دائرہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی (ابن کثیر)

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کر دی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سا بنیاد پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تینیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شقیہ تھی اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۳ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؓ کے نزدیک چوبیسویں شب شب قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیت قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہر حال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شب قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

مَنْ شَهِدَ مِنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اس ایک جملہ میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارات ہیں، لفظ شَهِدَ شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور اللہ بھی عربی لغت میں ہینہ کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے ہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہو گئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے ہینہ کے روزے رکھے،

روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے ملحوظ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پاس کرے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گذر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں جیسے کافر، نابالغ، مجنون، توہر لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہو مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، تو انہوں نے ایک حیثیت سے ماہ رمضان بحالت صلاحیت پایا، اس لئے حکم آیت کا ان کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضاء لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بحالت صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہو کر جتنے دن رمضان کے پاسے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آٹھ روزے لازم ہوں گے، گزشتہ ایام رمضان کی قضاء لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ ایام رمضان کی قضاء بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت، وسط رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گزشتہ ایام کی قضاء لازم ہوگی۔

مسئلہ: ماہ رمضان کا پالینا شرعاً عین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا پاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روز پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ: شعبان کی انیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابرو وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہنچے تو اگلے روز یوم الشک کہلاتا ہے، کیونکہ

اُس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقت چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہو کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہود شہر یعنی رمضان کا پالینا صاف نہ نہیں آتا، اس لئے اُس دن کار و زہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور الاستباس نہ پیدا ہو جائے (جصاص)

مسئلہ: جن ملکوں میں رات کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں وہاں شہرہ کہ
یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا مقتضی یہ ہے کہ ان پر روزے فرض نہ ہوں
نہتائے حنفیہ میں سے حلوئی اور قبائی وغیرہ نے نماز کے متعلق قواسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں
پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد
صبح صادق ہو جاتی ہے وہاں نماز عشاء فرض ہی نہیں (رہائی) اس کا مقتضی یہ ہو کہ جہاں چھ مہینے کا
ہو وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی اور رمضان وہاں کسے لگا ہی نہیں، اس لئے
روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ادا الفرائض میں روزے
کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ، اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر سے ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضاء کر لیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا ہے تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہو گئی ہو اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے ہل چھین میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں قبول کرتا ہوں عار مانگنے والے کی دعا کر

إِذَا دَعَاكَ فَلَيسْتَ جَلِيْبًا إِلَيْهِ وَلَيْسَ مِنْكَ إِلَيْهِ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿٦٦﴾

جب مجھ سے دعا اٹھے تو چاہئے کہ وہ حکمائین میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ ٹیکہ راہ پر آئیں۔

خلاصہ تفسیر مع ربط آیات

پہلے تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے

بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہو، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر و نشر اگر اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعا مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں۔ اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیان جملہ ترغیب و دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزہ کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

یہی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ کی دعا مقبول ہے۔

”یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ کی دعا مقبول ہے۔“

برواية عبد الله بن عمر

اسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اظہار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے، تفسیر آیت کی یہ ہے:

اور ولے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور) تو (میری طرف سے ان سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور) باستثناء نامناسب درخواست کے (منظور کر لیتا ہوں) (ہر) عرض درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست ہے، سو (جس طرح میں ان کی عرض محروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی میرے حاکم ہونے پر بھی میرے جھیم ہونے پر اور رعایت و مصالح پر بھی اس طرح) امید ہے کہ وہ لوگ رشد (وفلاح) حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ: اس آیت میں اِنِّیْ قَدِیْضٌ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعا آواز سے
اور خفیہ کرنا چاہئے، دعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں، البتہ کثیرہ فی آیت کا شان نزول یہی
ذکر کیا ہے کہ کسی گھاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر
ہم سے قریب ہو تو ہم دعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور دور ہو تو بلند آواز سے پکارا کریں
اس پر یہ آیت نازل ہوئی :-

أَحِلَّ لَكُمْ كَيْلََةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے وہ پوشاک ہیں تمہاری

وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ مَا عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ

اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ کو معلوم ہو کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے

فَقَاتِبْ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ

سرمعات کیا تم کو اور درگزر کی تم سے پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہو

اللَّهُ لَكُمْ صَوَافِحُ لَكُمْ وَأَشْرُ بَوَاحِشٍ يَتَّبِعْنَ لَكُمْ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ

اللہ نے تمہارے لئے اور کھاد اور زبرد جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری

مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُمُوا الصِّيَامَ إِلَى الْيَلِ

سیاہ سے پھر پورا کرو روزہ کو رات تک

وَلَا بَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ

اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں یہ حدیں باندھیں ہوئی ہیں اللہ کی

فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچے رہیں

خلاصہ تفسیر

حکم چہارم، رمضان کی راتوں میں جماع | اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا اور پہلے جو اس سے مانعت تھی وہ موقوف کی گئی (کیونکہ بوجہ قرب و اتصال کے) وہ تمہارے (بھائے) اور بھینچے بھرنے (کے) ہیں اور تم ان کے (بھائے) اور بھینچے بھرنے (کے) ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس علم انہی میں) خیانت (کر) گئے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت نسمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو

(جب اجازت ہو گئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہو (بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہمبستری کی اجازت ہو اسی طرح یہ بھی اجازت ہو کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط صبح (صادق کی روشنی) کا تمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے) تو پھر صبح صادق سے رات رات کے تک روزہ کو پورا کیا کرو۔

صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے۔

حکم پنجم اعتکاف | اور ان بیبیوں کے بدن سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ) مسجدوں میں

(ہوا کرتا ہے) یہ سب احکام مذکورہ خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس امید پر کہ وہ لوگ احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف نہ کریں گے۔

معارف و مسائل

أَحِلَّ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ اس سے پہلے حرام تھی، صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براہ بن عازب مذکور ہے کہ ابتداء میں جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو انظار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سو نہ جاتے، سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرام کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاری دن بھر مزدوری کر کے انظار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، پوری نے کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے بھوکے بھوکے ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا، دو پہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے، (ابن کثیر) اسی طرح بعض صحابہ سونے کے بعد اپنی بیبیوں کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دیدی گئی، اگرچہ پورا کھانے کے بعد ہو، بلکہ سو کر اٹھنے

کے بعد آخر شب میں سحری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایات حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

روزے کے لغوی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرنا کہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے لیکن اتفاقاً سنت اس جگہ اس سے مراد چھٹا شربت احکام شریعہ کے لئے اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم شترآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم سے صحابہ کرام اس حکم پر عمل کرتے تھے، رکاوٹ اور احادیث، کئی کئی حکم الہی قرار دیکر منسوخ کیا اس آیت میں پہلے حکم کو حکم الہی قرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ (بعض خاص وغیرہ)

سحری کھانے کا آخری وقت

تحقیق یتبیین نکھڑ الفیظ الک فیض، اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرما دیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے تحقیق یتبیین کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کر دو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے بعد جو کھانا پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزہ کے درمیان حد فاصل صبح صادق کا یقین ہے، اس یقین سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور یقین کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، سحری کھانے میں وسعت اور عجائز صرف اسی وقت تک ہر جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرام کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پردائی سے کھاتے رہے، یا اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت بلالؓ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دیدیتے ہیں، اس لئے تم بلالؓ کی اذان سنکر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک اہل تم کو سحری کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوع صبح صادق پر اذان دیتے ہیں (بخاری و مسلم)

اس حدیث کے ناتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا جائے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اذان ابن ام مکتومؓ جو ٹھیک طلوع فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے ترک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ شترآن کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوع صبح کا یقین پر اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نص شترآن کی خلاف ورزی ہوا صحابہ کرامؓ اور اسلاف امت سے جو افطار و سحری مسابقت کی روایات منقول ہیں ان سب کا عمل نص شترآن کے مطابق ہی ہو سکتا ہے کہ یقین صبح صادق سے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نص شترآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے اسی آیت کے اخیر میں تِلَاقُ لَحْنٍ ذِکْرُ اللّٰہِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَؤُہَا فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ: یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو ہمیشہ خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہ راست افق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا افق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعہ وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا کہے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو یقین نہ ہو ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس کے متعلق امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھالی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضاء اس کے ذمہ لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گناہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضاء اُن پر باقائ لازم ہے، اس طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضاء اس پر واجب ہے۔

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھینگا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قصا۔ بھی اس پر لازم ہوگا، اور مشک کو ک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قصا ساقط نہ ہوگا، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظی التماسی کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سکر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد بنکنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

آخر آیت میں تِلْكَ آيَةُ الْيَوْمِ لَا تَعْلَمُونَ کہا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جبرماعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کتنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہچاؤ اُن کے جانوروں تک کہ

لَتَأْكُلُوا مِنْهُمَا مِمَّا قَلَّ مِنْكُمْ فِي الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ لَبِئْسَ مَا تَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

کھاجاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کرتے (ناحق) اور ہم کو معلوم ہے۔

رابط آیات و خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معتین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مالِ حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادتِ صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا تو گر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی عطالی ہٹا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مالِ حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مالِ حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مالِ ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریقِ گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف ومسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے جس میں ارشاد ہے:

۲۰ یسین اسے لوگوں کا آئینہ کی چیزوں میں سے
جو چیزیں حلال اور حرام ہیں اور شیطان کے
قدیم برپہ چلار کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن ثَمَرِ الْأَرْضِ
حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ
الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

امام جصاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضاء بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضاء ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اعتکاف کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت اس کے مسائل میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام اعتکاف ہے، لفظی التماجد کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہو کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو غیر آبا مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہو گیا کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ: روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اور پر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہو جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرت نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ: اعتکاف کے دو سر مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد رکھنا بغیر حاجت طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ اعتکاف سے مستفاد ہیں کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

آخر آیت میں یُلَاقُ مُحَمَّدٌ ذُو الشَّوْكَ فَكَانَ تَقَرُّ بَوَہَا، فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی ہر ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں ممانعت کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس کنا مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا، بہتر ہے، اس میں بے پردائی اور سہل انگاری اس ارشاد خدا ربی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں باحق اور نہ پہنچاؤ ان حکاموں تک کہ

لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾

کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبارت صوم کا اصل منشاء یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہو کہ جب روزہ ختم ہوا فطار کے لئے مالی حلال ہٹا کر نا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم، مال حرام سے بچنا اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف و مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے اسی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:

”مِن اِیْمَانٍ لَّوْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ“
جو چیزیں حلال اور حلال ہیں اور شیطان کے قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

اور سورۃ نمل آیت ۱۸ میں ارشاد فرمایا۔

تَكُونُوا مِمَّنْ يَتَقَرَّبُونَ إِلَى اللَّهِ خُلَاقًا
مُطِيبِينَ وَتُشْكِرُونَ لِلَّهِ إِنْ
كُنْتُمْ لِرَبِّكُمْ تَعْلَمُونَ

یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے
ملائی اور پاک اور شکر کر اللہ کے احسان
کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

جس طرح مال کی ضرورت اور مدار زندگی ہونے پر
ساری دنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے،
اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے

کسب مال کے اچھے برے ذرائع
اور اچھائی بُرائی کا معیار

کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور منوع ہیں، چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی
دنیا برا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں
نہیں، اور ہر بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور
پورا عالم انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو
رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا اختیار ہو
تو جو لوگ اس کا قانون بناتیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ چاہیں
وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا۔
اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شاہد ہو کہ وہ بھی
ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ قانونی ناانصافی انجام کار
جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظام معاش پر شریعت اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بتایا، وہ ضرور وحی الہی
دنیا میں قائم کر سکتا ہے۔ یہی بات مسکند اور وہی ایک ایسا معقول فطری و جماعی قانون جو ہر قوم و ملت
اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور امن و امان کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانون الہی میں قابل
اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقف عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام انسان مساوی حق رکھتے ہیں جیسے
ہوا پانی، خورد و گھاس، آگ کی حرارت اور غیر ملوک جنگلات اور غیر آباد زمینیں جی جنگلات کی پیداوار
وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو ان پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں اور جن چیزوں
کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدل کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں
ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت
کا قانون جہاں ہے، اور پھر انتقال ملکیت کا جہاں اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہو کہ کوئی
انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے،

اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو جمع و دافرا میں
مقبول نہ کرے، انتقال ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانون الہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شرا
وغیرہ کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو
ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال
نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی فوجت آئے۔

یہ اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی
ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعت اسلام میں جتنے معاملات ہل یا
فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں ان سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ان میں وجوہ مذکور ہیں کسی وجہ سے
خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے،
کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ
میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سو، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوق عامہ
کے لئے مضری ہیں، ان کے نتیجہ میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے،
ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف
ایک جرم ہے، اہمیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر مادی ہے، ارشاد ہے، وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُتَنَادِمِينَ
يَتَنَادَوْنَ بِالْبَاطِلِ، یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر، اس میں ایک بات تو یہ قابل
غور ہو کہ قرآن کریم کے الفاظ میں آمَنَّا بِالْحُكْمِ آیا ہے جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال جس
میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور
کر دو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال
سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچا، اُس کا اس وقت بھی
ایسا ہی احساس کرو، کہ گویا وہ تمہارا مال ہو۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں
کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے
مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف حقیقت
اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اس شیا ضرورت میں ملاوٹ
کی رسم چل جائے، کوئی نگہ میں تیل یا چربی ملا کر تاد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے
کی ضرورت پڑے گی دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ
ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ

کر کے زائد حاصل کرنے اور سوا کسی دوسرے کے پیسے اس کی جیب نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے کسی دوسرے کے ہاتھ سے بیوقوف اپنی جگہ بیسیوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے ہاتھ سے کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے وہ حقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ منکرین کی رضا مندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحت کھانے کی مانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے، خواہ کھانی کو باپس کر دیا دے سکر طریقہ کے استعمال سے، مگر محاورات میں ان سبب کے ہتھماؤں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، نہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا لیا، اگرچہ وہ مال کھانے پر اپنے کے لائق نہ ہو۔

شان نزول آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت صحابہ کرام میں سے دو صحابہ کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، امت محمدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گولہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حاکم کر کے حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہو گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت ان کو یہ آیت سنائی: **إِنَّ أَوْلَىٰ بَيْنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ يَتَخَذُونَ بِأَمْتَانِهِمْ قَسَمًا لِّبَايَعَتِهِمْ**، جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا اور زمین مدعی کے حوالہ کر دی۔ (روح المعانی)

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے، اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلولے کی سخت مانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: **وَلَا تَكُونُوا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ كَمَا كُنْتُمْ بَيْنَ أَيْدِي النَّاسِ يَكْفُرُونَ بِالْأَيْمَانِ**، یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھاؤ یا بطریق گناہ جب کہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو، **وَلَا تَكُونُوا تَفْخَرُونَ** سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی منالطہ کی بناء پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں

دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَأَشْكُرُ تَخَفِصُونَ
إِلَّيَّ وَتَقُلُّ بَعْضُكُمْ أَنِّي كُنْتُ
أَلْعَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ تَقْصِيصِ قَاتِلِي
لَهُ عَلَى رَجُلٍ مَا أَسْتَمُ مِنْهُ فَتَقُولُ
قَضَيْتَ لَهُ بِئْسَ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ
فَلَا يَأْخُذُ شَيْءٌ قَاتِلًا أَفْطَمَ لَهُ
يَقْلَعُهُ بَيْنَ النَّاسِ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ
وَمُسْلِمٌ عَنْ أَمِّ سَلَمَةَ

”میں میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زبان رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو زیادہ کھو کہ حقیقت حال تو عجب معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے، اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہو تو اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کرے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہو اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الفرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص جھوٹ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور عظیم ذخیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فیخ ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بناء پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ عقد یا فیخ صحیح ہو جائے گا، اور حلال و حرام کے احکام اس پر مائدہ ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلوانے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مال حلال کی برکات
اور حرام کی نحوست
حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اپنا بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاق حمیدہ اور

اعمال صالحہ کا صدور شکل ہو، ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ مَنكُم مَّنْ جَاءَ بِالْغَيْبِ
وَأَعْتَمَلُوا صَالِحًا لِّيُؤْتِيَنَا قَعْلُكُمْ
عَلَيْكُمْ (۵۱: ۲۳)

”یعنی اے گروہ انبیاءِ حلال اور پاک چیزیں
کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال
کی حقیقت سے واقف ہوں“

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عمل صالح کا حکم مشرک اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انھیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مامور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی رعاء قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور یارب یارب پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ امت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آجکل تو یہ حالات آپ کی امت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ نے فرمایا: ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دعا فرمادیجئے کہ میں مستحب الی دعا ہو جاؤں، ہو دعا کیا کروں قبول ہو کرے، آپ نے فرمایا اے سعد اپنا کھانا حلال اور پاک بنا، لو، شجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو

چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے قہرہ کی آگ ہی لائق ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ آئندہ تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبانِ مسلم نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کا تک ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی چیز سے بڑے عمل کو نہیں دھوئے، ہاں اچھے عمل سے بڑے عمل کو دھو دیتے ہیں۔

مشرکین ہر انسان کا باغ ہم سوا ہے اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَا تَزَالُ قَدْ مَا قَبْلَ يَوْمِ لَيْلِيَا مَسْجِدِ
حَتَّى يَسْأَلَ عَنْكُمْ عَنْ قَوْمِكُمْ فَيَسْأَلُ
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ فَيَسْأَلُ فَيَسْأَلُ
وَعَنْ تَالِيَةِ يَوْمِ لَيْلِيَا مَسْجِدِ
وَعَنْ تَالِيَةِ يَوْمِ لَيْلِيَا مَسْجِدِ
فَيَسْأَلُ عَنْكُمْ مَاذَا عَمِلْتُمْ
فَيَسْأَلُ (البیہقی، مرغیب)

”قیامت کے روز میری کوئی بندہ اپنی
جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار
سواؤں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس
اپنی عمر کس کام میں نکالی اور دوسرے یہ کہ اپنی
ہوائی کس شغل میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا
مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے
یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ اے جماعت ہا جریں، باغِ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ ہے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلنے لگے تو ان پر طاعون اور وبایں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے کئے تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ ان پر اجنبی دشمن مسلط فرمادیتے ہیں، جو ان کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کسی قوم کے اربابِ اقامت دار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ان کے دل کو نہ لگیں تو

عہ معنی رذالت میں پلکا کھانڈ ہے اس میں مال کے دو سوالوں کی آگ ایک شکار ہے

اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دینے میں مدد دیتا ہے اور حکم نے اس کو صحیح علی شرط مسلم فرمایا ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ كُلِّ هِي مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ مَا وَلَّيْتَ

تم سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا کہہ دے کہ میادقات مقررہ ہیں لوگوں کو واسطے اور حج کے واسطے اور

الْبُرْيَانِ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مِنَ الْتَقَىٰ وَ

یکں نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے اور یکں یکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے اور

اَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا سَوَاءً لِّلّٰهِ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ﴿۱۳﴾

گھروں میں آؤ دروازوں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو،

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُوكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کر دینیک

اللّٰهُ لَا يَحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۴﴾ وَاَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَ

اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو، اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور

اَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِئْتَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

نکال دو ان کو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچنا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہو

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ

فَاتْلُوْهُمْ فَاَقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِيْنَ ﴿۱۵﴾

خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مار دے یہی ہے سزا کا فسروں کی۔

رَبُّ اَيَاتِ اَيَّتْ لَيْسَ الْبِرَّ كَالَّذِيْ يَدْعُوْا اِلَيْهِ كَيْفَ كَانَتْ اَيَّاتُ الْبَقَرَةِ

ابو ابیہ کا بیان ہوگا، ہر ایک حکم شرعی پر شکی ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا دوسرا وصیت کا،
تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلق مسائل کا پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا،
مذکورہ صدر دو آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ
بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری ہینوں اور دونوں کا اعتبار ہوگا۔

لغاست: اہلہ، ہلال کی جمع ہے، قمری ہینوں کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ہلال
کہا جاتا ہے، مَوَاقِيْتُ، میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا مہینہ گذشتہ کے آتے ہیں (ذہبی)

خلاصہ تفسیر

حکم ہفتم، اعتبار حساب (یعنی آؤنی، آپ سے ان) چاندوں کے (ہر ہینہ گھٹنے بڑھنے کی،

حالت اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ کی تحقیقات کرتے ہیں

قمری درج و غیرہ آپ فرمادیجئے کہ فائدہ اس کا یہ ہو کہ وہ چاند اپنے اس گھٹنے اور

بڑھنے کے اعتبار سے لڑ دیا یا سہولت (آلہ مشناخت اوقات ہیں لوگوں کے اختیاری معاملات

مثل عدت و مطالبہ حقوق کے لئے اور غیر اختیاری عبادات مثل حج و زکوٰۃ و روزہ وغیرہ)

کے لئے۔

حکم ہشتم، اصلاح رسم جاہلیت (بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی

ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے، تو دروازہ سے جانا ممنوع

جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیواریں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل

کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں

کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کر دے، ہاں لیکن فضیلت یہ ہو کہ کوئی

شخص حرام (چیسروں) سے بچے اور چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے

اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ،

اور راصل الاصول تو یہ ہو کہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ امید ہے کہ تم راہین

میں ہکا میاب ہو۔

حکم نہم، قتال کفار (۱۵ روزی فعدہ سلسلہ ہجری میں حضور صل اللہ علیہ وسلم اولے عمرہ کے

قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے آئے اس وقت تک مکہ معظمہ مشرکین

کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صل اللہ علیہ اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ

کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سال آئندہ

تشریف لاکر عمرہ ادا فرمادیں، چنانچہ ذی قعدہ ۸۳۵ھ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں اور آمادۂ مقابلہ و مقابلہ نہ ہو جاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے، اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ منجملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اُشہر حُرّم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل و قتال حرام و ممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائی کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے ابتداء قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ، اور (بے تکلف) تم رہیں، لڑو! اللہ کی راہ میں یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں، ان لوگوں کے ساتھ دفع جہد کر کے، تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد و معاہدہ سے مست نکلا، (کہ عہد شکنی کر کے لڑنے لگو)، واقعی اللہ تعالیٰ حد و قانون شرعی سے بچنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جاں ان کو پاؤ اور (خواہ) ان کو زندہ نکال باہر کرو جاں سے انہوں نے تم کو (تنگ کر کے اور ایذا میں پہنچا کر) بچنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا ہے، اور تمہارے اس قتل و خراج کے بعد بھی عقلاً الزام انہیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی شرارت (ضرر میں) قتل و خراج سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل و خراج کی نسبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچی ہے)، اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ ابتداء قتال کرنے سے ایک اور امر بھی منہ پورہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گرد اگر دایک واجب الاحترام جگہ ہے، اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (فواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کر لے لگیں تو اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ تم (بھی) ان کو مارو (و حارثہ) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سسر ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں صحابہ کرام کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ

کی ایک خاص شان ہو، کہ انہوں نے بوجہ عظمت و سعادت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلے امتوں کے کہ جنہوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ صحابہ کرام کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کل چودہ ہیں جن میں سے ایک سوال ابھی اور ہرگز رہا ہے، **وَاَسْأَلُكَ جِبَادِي**، دوسرا سوال یہ ہے، اور ان کے بعد سورۃ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیت مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آہلۃ یعنی شروع پہنچنے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ بھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پھر پورا دائرہ ہو جاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا، دونوں احوال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہے، تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرام کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب تبجا حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جائے گا۔

قری اور ٹیسی حساب | اس آیت سے قرائن معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا شرعی حیثیت حساب معلوم ہو جائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورۃ یونس کی آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے، **وَقَدْ تَرَكْنَا مِثَالِهَا** یعنی اُن کے لئے مِثَالِهَا (یونس) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے:

فَتَعْلَمُونَ آيَةَ النَّبِيِّ وَجَعَلْنَا آيَةَ الْفَخَّارِ

”پھر تمہاری راہت کا نمونہ اور بنا دیادوں کا

تَعْلٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ الْيَتَامٰى وَالْعَبْدَانِ

تین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں
اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔

اور ابو داؤد میں بروایت انسؓ جہاد پر جانے والے صحابہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات منقول ہیں، تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بوڑھے ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو (منظہری)

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیانؓ کو ملک شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں (قرطبی)

آیت کے آخر میں قَوْلًا تَعَسُّدُ ذَا کا بھی جہور مفسرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو کہ عورتوں بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَأَقْتُلُوا الْمُشْكِكِينَ ۖ لَيْسَ بِكُمْ جُنَاحٌ عَلَى الْقَتْلِ مَنْ خُيِّرَ ۚ خِلَافَةُ تَفْسِيرِ
میں بیان ہو چکا کہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی ہے، جب صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضاء کے لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دیدی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤں کو قتل کرو، اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقابلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ عفو و درگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا برا اور ممنوع ہے، اس خیال کے ازالہ کے لئے فرمایا وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت برا کام ہے، مگر کفار مکہ کا اپنے کفر و شرک پر چل رہا تھا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، آیت میں لفظ فتنہ سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے (جصاص قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کر دی گئی وَلَا تَقْتُلُوا هُمُومًا

الْمُسْلِمِينَ الْحَرَامِ حَتَّى تَقْتُلُوا كُفْرًا بِهِ، یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے اس میں تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ: حرم مکہ میں انسان کیا کس شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی ممانعت میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداء جہاد و قتال کی ممانعت صرف مسجد حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد و ضروری ہر اسی طرح ابتدائی جہاد و قتال بھی درست ہے۔

فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۱۰ وَ قَاتِلُوا الْمُشْكِكِينَ ۖ لَا تَكُونُوا

پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہو، اور لاؤ ان سے یہاں تک کہ

فِتْنَةٌ وَ يَكُونُوا لِلدِّينِ لِلَّهِ فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ

نہایتی رہے فساد اور حکم پر خدا تعالیٰ کا پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر

الظَّالِمِينَ ۝۱۱۱ الشُّهُلُ الْحَرَامُ بِالشُّهُلِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ

ظالموں پر، حرمت والا جہنم بدلہ (مقابلہ)، حرمت الی جہنم کے اور ادبے کفر میں بدلہ ہے،

فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ

پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّادِقِينَ ۝۱۱۲ وَأَلْفِقُوا فِي

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پر ہیزگاروں کے، اور خرچ کرو اللہ

سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۖ وَأَحْسِنُوا ۝۱۱۳

کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں، اور نیکی کرو

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝۱۱۴

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر | پھر اگر بعد شروع قتال کے بھی وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز نہ آجائیں

اور اسلام قبول کر لیں، تو ران کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ اللہ تعالیٰ ران کے گزشتہ کفر کو بخش دے گا اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر ہر باتیں رکھے، فرادہ گئے اور اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کر لیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چنانکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صورت دہانے ہی اسلام یا قتل اس واسطے، ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ ران میں فساد عقیدہ یعنی شرک نہ رہے اور ران کا دین (خالص) الشریعہ کا ہو جائے اور کسی کا دین و مذہب کا خالص اللہ کے لئے ہو جانا معروف ہے، قبول اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیں، اور اگر وہ لوگ (کفر سے باز آجائیں جس کا ذکر ابھی ہوا بھی ہے) تو آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے ستم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی سختی کسی پر نہیں ہو کر لی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو قبول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ ہے، لہذا ان پر سزا سے قتل کی سختی نہ رہی اور مسلمانوں کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں ان سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو کیونکہ حرمت والاہینہ دہم کو قتال کفار سے مانع ہو سکتا ہے بعض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے دسبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (جو یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور جو تم پر ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور ران سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے رہو کہ کسی امر میں حد قانونی سے تجاوز نہ ہونے پادے) اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ اپنی عنایت و رحمت سے، ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم انفاق فی الجہاد اور ستم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں جہاد میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جبن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور محالان کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ علین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرد) اچھی طرح کیا کرو مثلاً اس فتح پر خرچ کرنا بادل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کی گستاخرچ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح

کام کر لے والوں کو۔

معارف مسائل

مسئلہ جاری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے یہ معیت صحابہ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرام جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں ممکن ہو کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرم مکہ میں جنگ کی توہمت آئے گی، جو اسلام میں ناجائز ہو، اس کا جواب پچھل آیت میں درج کیا گیا کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حد و حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو ان کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہو دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے جو ان چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہے اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالت دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی ان سے دفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتداء اسلام میں بھی سب سے جاری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماع آ دیدی گئی مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہو کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بغیر مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَأَقِمْ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دیکھی ہیں اور نہ ان کے لئے کوئی نصاب اور مقدار

الْحَيِّجْ مَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَتَرَوْهُ فَأَنْ خَيْرٌ

جائے کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے اور زاد راہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر

الزَّادِ الْقَوْمِيَّ وَاتَّقُوا يَ أُولِيَ الْأَلْبَابِ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

فانہ زاد راہ کا پہننا جو سوال سے اور محمد سے ڈرتے رہو اسے عقلمند، کچھ گناہ نہیں تم پر کہ

أَنْ تَبْتَغُوا أَفْضَلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا

تلاش کرو فضل اپنے رب کا پھر جب ملوات کے لئے لوتو عرفات سے تو یاد کرو

اللَّهِ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۝ وَادْكُرُوا هَذَا نِعْمَةً وَإِنْ كُنْتُمْ

اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھایا اور بیشک تم تھے

مِنْ قَبْلِهِ لَيْسَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ

اس سے پہلے نادان ، پھر ملوات کے لئے پھر جہاں سے سب لوگ پھریں،

وَأَسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ ۝ فَإِذَا أَقْضَيْتُمْ

اور مغفرت چاہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ہر بان، پھر جب پورے کر چکو

مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ وَأَشْذِذُوا لَهُ

اپنے حج کے کام کو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ

پھر کہ آدمی تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ

مِنْ خَلْقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

حصہ نہیں، اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خیر اور

وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نُصِيبُ

آخرت میں خیر اور بچاؤ ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے

مِمَّا كَسَبُوا ۝ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي آيَاتِهِ

اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے، اور یاد کرو اللہ کو نعمتی کے چند

تَعْدُوا ذٰلِكَ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ

دونوں میں پھر جو کوئی جلدی چلا گیا وہ بھی دین میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رو گیا

فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ الْاَثْمُ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ لَیْسَ

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہڑتا ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جانی لو بیشک تم سب

تَحْشَرُونَ ۝

اسی کے پاس جمع ہونگے۔

خلاصہ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور رجب حج یا عمرہ کرنا ہر تو اس حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے راضی کرنے کے واسطے

پورا پورا اور کیا کرو ذکر اعمال و آداب بھی سب بجا لاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو پھر

اگر کسی دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیا جائے

تو اس حالت میں یہ حکم ہے کہ قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو روزی کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع

اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں جس کا طریقہ شرع میں سر منڈی

ہو اور بال کشا دینے کا بھی یہی اثر ہے اور یہ نہیں کہ فوراً رک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام

کھولنا درست ہو جائے بلکہ اپنے سروں کو احرام کھولنے کی غرض سے، اس وقت تک مت

منڈاؤ جب تک کہ (رہ) قربانی کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا، اپنے موقع

پر نہ پہنچ جائے اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور عدد و حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا کہ

وہاں اگر خود نہ جاسکے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جائے جب جانور ذبح ہو جائے اس وقت

احرام کھولنا جائز ہوگا البتہ اگر کوئی تم میں سے رکھے، بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ زخم یا درد

یا جو درد وغیرہ کی تکلیف ہو اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت

پڑے (تو اس کو اجازت ہو کہ وہ سر منڈا کر) قدیم (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ مخواہ)

دو تھپے سے یا چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں (خیرات

دے کے طوطا دیدینے سے یا ایک بکری) ذبح کر دینے سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ

نہ پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جائز ہو) تو اس صورت میں حج و عمرہ

کے متعلق قرآنی کرناہر ایک کے ذمہ نہیں ہو بلکہ خاص (جو شخص عمرو سے اس کو حج کے ساتھ مل کر ملتفق ہوا) یعنی ایسا ہج میں عمرو بھی کیا ہو) تو نقطہ اس پر واجب ہے کہ جو کچھ شرابی میسر ہو (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرو کیا ہو یا صرف حج کیا ہو اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی مسترانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو شرابی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو اس کے ذمہ بجائے قربانی کے (تین دن کے روزے ہیں (ایام حج میں رکہ آخر ان ایام کا نویں تاریخ ذی الحجہ ہو) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے ٹھکانے لوٹنے کا وقت آجائے (یعنی حج کر چکے خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہو کر (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں) بلکہ خاص (اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) (مجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور ان سب احکام کی بجا آوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں خلافت نہ ہو جائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ درپیک اور مخالفت کرنے والوں کو سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور) معلوم ہیں (ایک شوال، و دسرا ذی قعدہ تیسرا دس تاریخ ذی الحجہ) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کر لے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی غرض بات (جائز ہے اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے) اور نہ کسی قسم کا نزاع (دشمنی) زیبا ہے، بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں رکھو (اگر سے) بھار ہنا ہے اور اے ذی عقل لوگو! ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت بہرہ لجانا مصلحت سمجھو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (دھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات (میں) ٹھہر کر وہاں سے واپس آئے (تو اگر وہاں حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں) اگر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو اللہ تعالیٰ نے بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی نادانقت تھے، پھر اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور رکھا رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی

میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں قرآنی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو (یعنی اللہ تعالیٰ معاف کر دے) اور ہر بانی فرمادیں گے۔

(جائزیت میں بعضوں کی توبہ عادت تھی کہ حج سے فایز ہو کر مٹی میں جمع ہو کر اپنے آباء و اجداد کے مفارقت و فضاائل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال حج پر سے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو بلکہ یہ ذکر اس سے (بہتر) بڑھ کر ہو (نا چاہئے اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہذا تامل و ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دعاء مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر و ارباب طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بیٹھے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دیدیجئے (وہیں) سوان کو جو کچھ ملنا ہو گا دنیا ہی میں مل رہے گا، اور اسی شخص کو آخرت میں (بوجہ انکار آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بیٹھے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیدیجئے، اور ہم کو عذاب و دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اور ہر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دو دنوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلب خیر و ارباب) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مست سمجھو) اور (یعنی میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں گیارہویں یا چوبیس تاریخ ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد (دو دن میں) ملے واپس آئے (میں) تعجب کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں، اور جو شخص (ان) (دو دن میں) واپس ملے (میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آئے، بلکہ تیرہویں کو آؤ) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرتے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

معارف و مسائل

احکام حج و عمرہ | ابراہیم بن کثیر کے بیان کا سلسلہ نصف سورۃ بقرہ سے چل رہا ہے ان میں سے اس لئے اس کے متعلقہ کچھ مسائل قرآن کے بیان میں ضمنی طور پر سورۃ بقرہ کی آیات ۱۲۵ سے ۲۸ تک **وَلَا جَعَلْنَا الْكِبَیَّتَ شَأْنًا** سے شروع ہو کر **وَأَن تَأْتُوا بِلَاہِکُمْ** تک ذکر میں آگئے ہیں، پھر بحث قبلہ کے ختم پر ایک آیت ۵۸ **إِنَّا الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ** میں مغامروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم بھی ضمنی طور پر بیان ہو چکا ہے، اب آیت نمبر ۱۹۶ سے آیت نمبر ۲۰۳ تک **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ** سے شروع ہو کر **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَئِذٍ** تک آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔

حج باجماع امت اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن اور فرائض اسلام میں سے ایک اہم فرض ہے جس کی تاکید و اہمیت قرآن کریم کی بہت سی آیات اور بے شمار احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے۔ ہجر کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ہجرت کے تیسرے یعنی غزوہ احد کے سال میں سورۃ آل عمران کی اس آیت سے ہوتی ہے: **وَذَلَّلْنَاهُ عَلَى النَّاسِ حِجًّا أَلْبَسْتُمُ اللَّيْلَةَ** بشر اس آیت میں فرضیت حج کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید مذکور ہے۔ مذکورہ صدر آیتوں میں سے پہلی آیت **أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ**، باتفاق مغتبرین قصہ مدیبنہ میں نازل ہوئی، جو سترہ صریح واقع ہوا ہے، اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس آیت کا مقصد حج کی فرضیت بتلانا نہیں بلکہ بتلانی جا چکی ہے بلکہ اس جگہ حج و عمرہ کے کچھ خاص احکام بتلانا مقصود ہے۔ عمرہ کا حکم اور چونکہ سورۃ آل عمران جس میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے اس میں صرف حج ہی کا ذکر ہے عمرہ کا نہیں، اور یہ آیت جس میں عمرہ کا ذکر ہے اس میں اصل وجوب و فرضیت کا بیان نہیں بلکہ ذکر اس کا ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بندید احرام شروع کرنے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسا امام غزالی نماز اور روزہ کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہو یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کرنے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ابن کثیر نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت عمارؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر و افضل ہے، وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح، اس وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؒ

مالکؒ وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں، سنت ہے، آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں، اس کا بیان بعد کے جملہ میں **وَأَن تَأْتُوا بِلَاہِکُمْ** سے فرمایا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے | یہ آیت چونکہ واقعہ مدیبنہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرامؓ عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، انھار نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا مسئلہ ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے **وَلَا تَحْلِفُوا** امر و نہی کے تحت میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں، جب تک تحریم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جاتے۔

موقع پر پہنچنے سے مراد امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حسد و حریم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کر سکیں تو کسی دوسرے سے کرا دیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحۃً مذکور ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں با شتر اک علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل بیان سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ احرام میں سر منڈاننا یا بال کٹوانا منوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج و عمرہ کے افعال ادا کرنے سے توجہ نہ کرے، مگر حالت احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالت احرام میں بال منڈالے | **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَئِذٍ** سے مراد یہ ہے کہ کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں بخود ہی پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہو تو ایسی صورت میں بال منڈاننا بقدر ضرورت جائز ہے، مگر اس کا ذیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حد و حریم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کر سکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور

نہیں ہی مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دیدیں (صحیح بخاری) آدھا صاع ہمارے انٹی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، ان کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو اسلام سے پہلے عربیہ جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کر دی گئی کہ حدیث میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اٹھارے میں جمع کرنا منع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اٹھارے کے دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدیث میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں میقات وہ مہینے مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے لگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، **لَمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلَهُ حَاضِرًا** ان کے لئے احرام کا یہی مفہوم ہے، کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجد حرام کے قریب و جوار یعنی حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج و عمرہ کو اٹھارے میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو حج و عمرہ کو اٹھارے میں جمع کریں ان پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکر ادا کریں اور یہ کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے خارج ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر ایام ابو حنیفہ اور اکابر صحابہ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرائے (جصاص)

تمتع وستران اٹھارے میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں قرآن کہا گیا ہے اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام

حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھ لے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر اٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں تمتع کہا جاتا ہے، اور لغتی معنی کے اعتبار سے لغت تمتع دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں **فَمَنْ تَمَتَّعَ** اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلافت ورزی آخر آیت میں ازل تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اور کوتاہی موجب عذاب ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: **وَأَمَّا لَكُمْ أَنْ تَدْعُوا مَشَاءَ الْبَوَاقِ**، یعنی جو شخص جان بوجہ کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، آجکل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، ازل تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کاموں اور ساختیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح عمل کی توفیق عطا فرمادیں۔

احکام حج کی آیتوں میں سے **الْحَجَّ أَشْهَرُ مَعْلُومَاتِ**، اٹھارے میں حج ہے جس کے معنی ہیں دوسری آیت اور اس کے مساں مہینہ، پھل آیت میں بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ معین نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینے اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، جو معروف و مشہور ہیں، جاہلیت عرب کے لیکر زمانہ اسلام تک یہی مہینے حج کے مقرر رہے ہیں، وہ مہینے شوال ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابوامامہ و ابن عمر منقول ہے (منظری) شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبائل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا (منظری)

فَمَنْ تَمَتَّعَ فلا تَرَکَ وَلَا تَسُوِّغَ الیٰ فِی الْحَجِّ، اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالت احرام میں

پہنچ کر لازم و واجب ہو، وہ تین چیزیں ہیں: رفت، فسق، جدال۔

رفت ایک لفظ جامع ہے جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی مکمل گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالت احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کناہ کا مضائقہ نہیں۔

فسق کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول بھی اور ناسرمانی کو فسق کہا جاتا ہے جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ فسق کی تفسیر مخطورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالت احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی مانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اول عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ مکمل گفتگو بھی، دوسرے بڑی جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالت احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی پٹے پٹے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابوحنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک چہرہ کو ڈھانپنا حالت احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک مخطورات احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ اگرچہ فسق میں داخل ہے لیکن اس کو فسق سے پہلے الگ کر کے لفظ رفت سے اس لئے بتلادیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے مخطورات احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مسببلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً دقوت عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جبرانہ بھی گھاسے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو خلافت ذق کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

جدال کے معنی ایک دوسرے کو پھانٹنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات مقام حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ جدال کے معنی یہ

لئے ہیں، کہ جاہلیت عرب کے لوگ مقام دقوت میں اختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں دقوت کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں دقوت ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقع ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اسی طرح اوقات حج کے معاملہ میں بھی اختلاف تھا، کچھ لوگ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کر لیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآن کریم نے لآجذک الیٰ فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ دقوت فرض عرفات میں اور پھر دقوت واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف مخطورات احرام کا بیان ہوا اگرچہ فی نفسہ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز روزہ کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزیں کہ منع کر دیا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس جگہ فسق و جدال کو عام معنی میں لیکر مقصد یہ بتلادیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح اہم جدال و خلاف ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالت احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور بے نیکی بے نیکی پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کر رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی پیاکی اور اسشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ رفت، فسق، جدال سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہر صحتی ہے کہ مقام حج اور زمانہ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں ابتلا کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالت احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و منیٰ، عرفات، مزدلفہ منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے رفت کی حرمت کا بیان فرمادیا، اس طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے لآفسق کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفر حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رقاء سفر اور دوسرے لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا والی ہو جائے، اس لئے لآجذک الیٰ کا حکم دیا گیا۔

بلاغت قرآن

اس آیت کَلَّا تَقُولُ لَكَ قُصُوۡیْ وَلَا حِجۡۃَ اِلَیَّ کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نفی اور مانعت کرنا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لَا تَقْصُوۡا وَلَا تَقْصُوۡا وَلَا تَقْصُوۡا لَوْ اَبَا جَانَا، مگر یہاں نفی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

وَمَا تَقْلَعُوۡا مِنْ خِیۡرٍ یُّعَلِّمُہُ اللّٰہُ، محظورات و منوعات احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہ نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غیبت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، اتم جو بھی نیک کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہو اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

وَتَذَرُوۡۤہُ فَاِذَا كَانَ خِیۡرَ الْمَآذِ الْاٰخِرِیۡ۔ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ تھک کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستہ میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، ان کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے معنی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و مسائل کو اپنے معتد و ر کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے بالکل ترک اسباب کا نام توکل رکھنا جائز ہے۔

سفر حج میں تجارت یا لیسہ ہر گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کما لو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو، واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے جس طرح تمام عبادات و معاملات کو حج کے طرح طرح کی یہود و نصاریں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشہ بنا دیا تھا، اسی طرح افعال حج میں بھی طرح طرح کی یہود گلیاں کرتے تھے، منی کے عظیم حرم تارح میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے، اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام یہود و رسول کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مست جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایام حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و مانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

پاس آئے، اود یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ پہلے سے اونٹ حج کے لئے کرایہ پر لیجاتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپؐ وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہو ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی، لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوۡا فَضْلًا مِّنْہُمْ یَسْتَعْمِلُوۡۤہُمْ اَس دَیۡۤیۡمًا، اس وقت آپؐ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ان تمہارا حج صحیح ہے۔

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دوران حج میں کوئی بیع و شہارہ یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منہاں اور نمائش گاہ بنا لیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کما میں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کرے، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سیٹھا مقصد نہ ہو، فَضْلًا مِّنْہُمْ یَسْتَعْمِلُوۡۤہُمْ اَس دَیۡۤیۡمًا، جس میں ایک اشارہ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کا مل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور ہرکاتب حج جیسی مہل مہل پیٹہ وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے ثواب میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہو، اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کر لی یہ اخلاص کے بالکل معافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو غافل عبادت و ذکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو منوع بھی فرمایا ہے۔

وفات میں وقت اور اس کے بعد اس آیت میں ارشاد ہے، فَاِذَا اَقَضْتُمْ مِّنْ عَمَلِکُمْ کے بعد مزدور کا وقت فَاِذَا کُمُۢمۡ وَاَلَّیۡتُمۡ بِعِنۡدِ الْمُسۡعِرِ الْخَوَیۡمِ وَاِذَا کُمُۢمۡ وَاَلَّیۡتُمۡ بِعِنۡدِ الْمُسۡعِرِ الْخَوَیۡمِ، یعنی پھر جب تم وفات سے واپس آنے لگو تو شعر حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلاد کھلا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی نادان تھے، اس میں بتلایا گیا ہے کہ وفات

سے واپس میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہیں۔

عرفات، لفظ آج ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے جس کے حدود اور بجز معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوالی آفتاب مغرب تک یہاں قیام کرنا حج کا اہم ترین فرض ہے جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور ذبیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو عرفات کہنے کی بہت سی وجہ بتلائی جاتی ہیں، ان میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے، ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شمار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ پہاڑ شمار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعر حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت کے دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے۔

آیت کے جملہ **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَذَارِجِ** میں شاید اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے اسی طرح اس کو یاد کرو، اپنی راستے اور قیاس کو اس میں دخل نہ کیونکہ راستے اور قیاس کا مقصد ہی تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اس روز اس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہو کہ مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے، ارشاد قرآنی **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَذَارِجِ** سے ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا، کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، ان کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، لہذا عبادت اور صدقہ و خیرات وغیرہ میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف کچھ خصوصیت اور اضافے کر لیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطا وار سمجھتے ہیں

اس آیت نے ان کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہل جاہلیت کی سی عبادت ہے، کہ اپنی راستے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں، اور چند رسوم کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد ہے، **ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلذَّنِّ**، اہل اللہ تعالیٰ نے اس سے مراد یہ ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے۔

اس جگہ کا شان نزول یہ ہو کہ قریش عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سائے عرب میں ان کا اقتدار مسلم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانہ جاہلیت میں وہ اپنی امتیاز شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدود حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدود حرم کے اندر ہے، اور عرفات سے خارج ہے، یہ پہاڑ کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آ جاتا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس جیلہ پہاڑ کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی، اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔ اول تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک شکرانہ فعل ہے جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباس حرام اور پھر قیام و مقام کی یکساں کے ذریعہ اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالت احرام میں یہ امتیاز ہی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسانی مساوات کا زریں سبق | اس ارشاد قرآنی سے اصولی معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کی بہتری علی صورت قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تعزین ملتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا، کہ کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مسد ر تقویٰ اور اطاعت خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں

معاف فرادیں اور اپنی رحمت فرادیں۔

رسوم جاہلیت کی اصلاح بتائی میں | ہر نئی پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رسوم جاہلیت کی اصلاح کی گئی
نفل و اجتماعات کی ممانعت | ہر ایک تو یہ کہ عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف
و قربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے قرآن کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی
تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں
کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی اغوار و نفول
جیسندوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعال احرام کو پورا کر چکو اور
منیٰ میں قیام کرو، تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور مخصوص
ان کے جھوٹے بچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑ دو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ
بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو، قرآن کی اس آیت نے عرب کی
ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ
کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ساتھ نہ آئیں گے
ان کو غلبت جانتا جاتے۔

علامہ ازہر ج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت
کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہو
اس میں حوادث کا پیش آجانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد ج
میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں
کامیاب فرمایا اور فرائض ج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضایہ یہ ہے کہ اور
زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہو، ان اوقات کو فضول و اجتماعات اور نفول کام یا کلام میں
ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفع
دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے
بھی آخرت کے لئے بھی، ابھل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی، کہ مشاعرے
قائم کریں اور آباء و اجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو نفول
اجتماعات میں فضول و عورتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے
کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے
بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب پہلا اور سب سے زیادہ کلام یا آیت یا آیت ہوتا ہو

تم اب بالغ ہو، جوان ہو، مائل ہو، یا آیت یا آیت کی جگہ یا آیت یا آیت کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو
کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے،
انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے
باپ کا محتاج ہے، نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر نثر بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت
کرتے تھے تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ خود عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز
مؤثر نہیں (روح البیان)

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین | جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ
دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال | دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گذاریں، اسی طرح کچھ
لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایام حج میں مشغول تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر ان کی
تمام دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں آخرت
کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ
وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے،
ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ سر لہجہ حج بھی
انہوں نے محض رہنماؤں کیلئے یا دنیا میں فخر و جاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ
کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں
اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں
جس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ وہ دنیا کے لئے بھی حسنہ کے طلبگار نہیں، بلکہ اغراض دنیویہ میں
ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ
اچھی ہو یا بُری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا بُرے راستہ سے، لوگ ان کو اچھا کہیں یا بُرا۔

اس آیت میں ان مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقامات مقدسہ
میں بھی دعاؤں میں اپنی اغراض دنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے
صرف کرتے ہیں، اور اگر ہلکے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دو تہند لوگ
یہاں بھی جو وظائف اور دعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت لوگ ایسے
ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی و تجارت میں برکت
اغراض دنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے وہ بہت سے وظائف اور فرائض پڑھ کر یہ بھی سمجھ گئے ہیں
کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دنیا پرستی ہوتی ہے، بہت حضرات

زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دنیا کی آفات دور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہو، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے، کہ ظلمات و لوافل اور دمار و دروسے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمہ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُولُ اِنَّنَا اِيْتَانِي الَّذِي يَخْتَصِمُ لِي فِي الْاٰخِرَةِ خَيْرًا مِّنْ الَّذِي يَخْتَصِمُ لِي فِي الدُّنْيَا اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّمَنْ يَّعْقِلُ
التَّائِبِينَ یعنی ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذاب جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔

اس میں لفظ خستہ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دنیا کی خستہ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزق حلال میں وسعت و برکت و نیروی سب ضروریات کا پورا ہونا اعمال صالحہ، احسان، محمودہ علم نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی درستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاص کامل سب داخل ہیں، اور آخرت کی خستہ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون عیدتر آتا ہے، آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے رَبَّنَا اِيْتَانِي الَّذِي يَخْتَصِمُ لِي فِي الْاٰخِرَةِ خَيْرًا مِّنْ الَّذِي يَخْتَصِمُ لِي فِي الدُّنْيَا اور حالت طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دعا منفون ہے، اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دعا مانگتے کہ عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیال خام ہو، انسان اپنے رجو اور بقا اور عبادت و طاعت سب میں ضروریات دنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دنیوی حاجات کے لئے دعا مانگے کہ زہد و بزرگی کے غلات سمجھے وہ مقام انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو مقصد زندگی نہ بنائے،

اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہو، انجام ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دعاؤں کا نتیجہ ان کو دنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے وَاللّٰهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ، یعنی اللہ جلد حساب لینے والا ہے، کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرت کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں ان آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور ان پر جزاء و سزا مرتب فرمائیں گے۔

مٹی میں دو باہن دن کا قیام آٹھویں آیت جو اس جگہ احکام حج کی آخری آیت ہو اس میں حجاج کو ذکر اللہ اور ذکر اللہ کی تاکید کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصد حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے، وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْمَاتٍ، یعنی اللہ کو یاد کرو غنتی کے چند دنوں میں، ان چند دنوں سے مراد ایام تشریق ہیں جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔ آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی کہ مٹی میں قیام اور ہجرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہل جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیس ہجرتیں یا پانچ ذی الحجہ تک مٹی میں قیام اور ہجرات پر مٹی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجاتے تو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اس طرح دوسرے لوگ بارہویں یا پانچ کو چلے آنا ضروری سمجھتے، اور تیسروں تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی، کہ قَمَتْنِ تَعْتَجِلْنَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِنَّ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ، یعنی جو شخص عید کے بعد صرف دو دن مٹی میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

حج یہ ہے کہ حجاج کو دو دنوں صومہ میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل اولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروب آفتاب سے پہلے مٹی سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی ری واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب مٹی میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی ری کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آجانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی ری میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوال آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

مٹی سے واپس آکر اس میں حجاج کو اختصار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دو دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آجائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۲۰۵)** "یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں" اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** - "یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے حج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہو، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف مایوس ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا، اس کی مقبول ہے، دوران حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فرما ہر داری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آسکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ حج کر گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج دراز سی کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہو، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَتَقُوا اللَّهَ مَعَاضٍ وَمِنْ تَوْفِيقِي وَتَقُوا اللَّهَ مَعَاضٍ**

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُحِبُّ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَشْهَدُ اللَّهُ

اور ایسا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گواہ کرنا ہو

عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَكْذَابُ الْخَصِمِ (۲۰۶) وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ، وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ (۲۰۷)

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (۲۰۸)

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدھ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كَسَبَ وَالنَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ

اور وہی ملک جو ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ ط وَاتَّقُوا اللَّهَ رُكُوفًا بِالْعِبَادِ (۲۰۹)

میں، اور اللہ نہایت ہرمان ہے اپنے بندوں پر

کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے، **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۲: ۱۷۵)** "یعنی اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعائر بندے ہیں" اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا، اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا جرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا **وَاتَّقُوا اللَّهَ تَرَوْا ثَمْرًا أَنْتُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** - "یعنی ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کر دو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو، وہ تمہارے کھیلے ہوئے اور چپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو ادھر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت ان سب کی روح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس ایام حج میں جب کہ اعمال حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، احکام حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور بعد میں بھی اپنے حج پر معسرور نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ دوزخ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھٹا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور دوزخ ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہو، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علمائے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف مایوس ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دعا، اس کی مقبول ہے، دوران حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت فرما ہر داری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا دوسرا پیدا ہوا، مجھے غیب سے ایک آواز آئی کہ کیا کرنے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرما دیا۔
ایک ترک بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مريد تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر

ایک نور کا شادہ کیا کرتے تھے، وہ حج کر گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بھلے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے سر شادہ مولا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارا اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گھنگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاج دراز کر تے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہو، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرانی عبادت ضائع نہ ہو جائے۔ **وَتَقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ**

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُحِبُّ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ

اور ایسا آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہو تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگیوں کے کاموں میں اور گواہ کرنا ہو

عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۖ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ

اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت جھگڑا رہے، اور جب پھرے پھرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک

لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ ۖ

میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو

وَلَا إِقْبَلَ لَهُ اتِّقَ اللَّهُ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ

اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آدھ کرے اس کو غرور گناہ پر سوکانی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كَسَبَ ۚ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ

اور وہ ہے ملک جو ٹھکانا ہو، اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہو کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی

اللَّهُ ط وَاللَّهُ رُفُوفٌ بِالْعِبَادِ ۖ

میں، اور اللہ نہایت ہرمان ہے اپنے بندوں پر

ربط آیات اوپر کی آیتوں میں دمار لگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی گئیں، ایک کافر کہ مستکر آخرت ہو، اس نے صرف دنیا مانگنا ہے، دوسرا مؤمن کہ محققہ آخرت ہو، دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اگلے آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض غلط ہیں۔

خلاصہ تفسیر اگر کوئی شخص تھا افسوس بن ستر بن، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر نہیں کھاکھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و اذکار و سالی فلن میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں، اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو شخص و نبی غرض سے ہوتی ہے، دیکھ کر انہیں اسلام سے مسلمانوں کی طرح قریب خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی نصاحت و بلاغت کی وجہ سے مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ اپنا اعتبار بڑھانے کو، اللہ تعالیٰ کو گمراہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر حالانکہ بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں، وہ (آپ کی) مخالفت میں رہنا ہی ہے، اور جس طرح آپ کا مخالفت ہو اس طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہو، چنانچہ جب (آپ کی مجلس) پیچیدہ پھیلتا ہے تو اس دور و صوب میں پھرتا رہتا ہو کہ شہر میں (کوئی) فساد کرے اور (کسی کی) حکمت اور موافقی کو تلف کرے، چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا، اور اللہ تعالیٰ فساد کی باتوں کو پسند نہیں فرماتے، اور اس مخالفت و اذکار کے ساتھ مغرور اس درجہ ہو کہ جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر تو (اور زیادہ) آمادہ کر دیتا ہے اس کو طرد و گناہ پر، سو ایسے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ بڑا شکاک ہے، اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے ہندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف و مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مؤمن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ ان مخلص صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہو جنہوں نے بے مثال شہرانیوں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت حبیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہو کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفار قریش کی ایک جماعت

نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت حبیب رومی اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہو گئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیرھے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلہ قریش تم سب سچے ہو کہ میں تیرا اندازی میں تم سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیرے کی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلوار سے کام لوں گا جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کر لینا، اور اگر تم رفع کا سودا چاہتے ہو تو میں نہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا سستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہو گئی، اور حضرت حبیب رومی نے صحیح سالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے فرمایا

رَبِّعَ النَّبِيِّ أَيْ تَجْنِي رَبِّعَ النَّبِيِّ

تمہارا رب ربیع بخش رہا، تمہاری بیعت نفع بخش

آبَا تَجْنِي

دیکھا

اس واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کر دی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا تھا۔

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرام کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا نشانہ نزول بتلایا ہے (منہجی)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اے ایمان والو! داخل برجائز اسلام میں پورے اور ملت چلو قدموں پر

الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۖ فَإِنْ تَرَكْتُمُ مِنْ بَعْدِ مَا

شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے، پھر اگر تم بچنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے

جَاءَ تَكُمُ الْبَيْتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۖ هَلْ

تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا، کیا وہ

يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ

اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آدھے ان پر اللہ ابر کے ستابافوں میں اور فرشتے

وَقَضَى الْأَمْرَ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۖ

اور طے ہو جائے قعدہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

رابط آیات

اور پھر خلاص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہر جائز سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علماء یہودی تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کار ورمعظم تھا، اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی تعظیم واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں بھی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، ہمیں کا حاصل یہ ہو کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا واجب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور یہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو رہے نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو، اور دایہ خیالات میں پڑ کر شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہو رہا ہے، اسی پٹی پر صادق رہنا ہے کہ ظاہر میں تو مسلمان ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف، پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلائل احکام و شرائع اسلام کی پہنچ چکی ہیں، پھر بھی مراکتبہم سے لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دینے اور کچھ دنوں تک سزا دینے تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ حکمت والے رہیں) پس کسی حکمت و مصلحت سے کبھی سزائیں دیر بھی کر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں، صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے یعنی کیا اس وقت امر حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا، اور یہ سائے جزا و سزا کے، مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جا دیں گے رکونی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سو ایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے۔

معارف و مسائل

اَذْكُمُوْا اِنِ الْيَسْلَمَ كَاذِبًا، سلم یا کسر یا فتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح دوسری استقام، اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر) لفظ کاذبہ جمیعاً اور عامۃ کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں قائل واقع ہوا ہے، جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اَوَكُمُوْا کا قائل مسترار دیا جائے، دوسرے یہ کہ سلم بمعنی استقام کا قائل ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۃ اسلام و اطاعت اہلبیت کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام اسلام بحال رہے مگر دل و دماغ اس پر مطیع نہیں یا دل و دماغ سے قراس پر مطیع ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام کو تو قبول کرو بعض میں پس و پیش ہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ سے اسلام کا جو مکمل نظام حیات، ہر قسم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکام اسلام خواہ وہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب و باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کر دو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا مصلح نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں سائے غائب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ ۱۔ اس میں آن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادت کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گو با دین کا جزو ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی نہیں سمجھتے، نہ ان کے معلوم کرنے یا سمجھنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ ہم ازکم محقر سالہ آداب معاشرت حضرت سیدی حکیم الامت کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے ساتھ ان میں ان کے پاس آجائیں قیامت میں پہلی آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا مشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جہور صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلاف امت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے معنوں کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلِّ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا أَتَيْنَهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ

یوحنا بن اسرائیل سے کس قدر عنایت کہ ہم نے ان کو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے

نِعْمَةً اَللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اَللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچا چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے،

زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَتَبْخُرُوْنَ مِنَ الَّذِينَ

فریفتہ کیا، کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنسے ہیں ایمان والوں

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اٰتَقَوْا فَرَقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَاللّٰهُ يَزْنِيْ

سے اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں کے بالاتر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ يَّشَاءُ مِنْ غَيْرِ حِسَابٍ ۝

دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار

رابط آیات | اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضعہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے،

پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت

پر سزا دی گئی:

خلاصہ تفسیر | آپ (علاء) بنی اسرائیل سے (دعا) پوچھتے (تو یہی) ہم نے ان کو دینی ان کے

بزدلوں کو) کتنی واضح دلیل دی تھیں مگر ان لوگوں نے بجاے اس کے کہ

اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گرا ہی پر کمر باندھی پھر دیکھو سزائیں بھی جھٹکتیں مثلاً توبہ اعلیٰ،

چاہئے توبہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھکی دی گئی، اور مثلاً

حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہو تھا سزا محکموں پر رکھتے مگر شہادت نکالے آخر بکلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً

دریا میں شگاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر

سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً حق و سلائی نازل ہوا سحر کرنا چاہئے تھا، اناسیروانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ معروف ہو گیا، اور کھیتی کی معیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غیبت سمجھنے ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، اعلیٰ حد مذہبیت سے معاملات اسی سورہ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں، اور دہارا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائل واضعہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی) بہاتے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور انکار کرے، تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں مخالفت حق کی اصل علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہو جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبان دین پر ہنسنا ہی، چنانچہ بعض رؤسائے بنی اسرائیل اور چہلا سے مشرکین غریب مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ بڑھائے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ دنیوی معاشی کفار کو آراستہ پہر پہر سستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمیز کرتے ہیں حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ رک حالت، میں ہوں گے قیامت کے روز کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دیدیتے ہیں پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بڑا معزز ہو اور بڑی عزت ہی جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھا جو قوی ہے)۔

معارف و مسائل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی حقیقت قیامت کے روز انکھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مومن مرد یا عورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اولین و آخرین کے مجمع میں دوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا جب اس کی طرف غصہ کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ

کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔

(ذکر الحدیث القریبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِينَ مُبَشِّرِينَ وَ

تھے سب لوگ ایک دین پر پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور

مُنذِرِينَ ۚ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

ڈرانے والے اور اناری اُن کے ساتھ کتاب بھی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس پر

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ

میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑاؤ الا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس

مَا جَاءَهُمْ مِنَ الْبَيِّنَاتِ بَغْيًا بَلْ يَكْتُمُونَ ۚ هَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے بھرا ہوا ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو

لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِآذِينِهِ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى

اسی سچی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جسکو چاہے

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۳﴾

سیدھا راستہ۔

ربط آیات اور دین حق سے اختلاف کرنے کی علت حجت دنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون

کی تائید فرماتے ہیں کہ مذمت سے ہیں قصہ چلا آ رہا ہے کہ ہم دلائل واضعہ دین حق

پر قائم کرتے ہیں، اور طالبان دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلافت کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر (ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے دیکھو کہ اول دنیا میں حضرت

آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوئی یعنی ان کو

دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے ایک مدت اسی حالت میں

گزر گئی، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہوا شروع ہوا حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد

اعمال و عقائد میں اختلاف کی فزیت آ گئی، پھر اس اختلاف کے رفع کرنے کو اللہ تعالیٰ نے

(مختلف پیغمبروں کو بھیجا جو کہ حق ماننے والوں کو) خوشی دے دے، سناتے تھے اور (نمانے

والوں کو مذاہب، ڈراتے تھے، اور ان پیغمبروں کی جمعی جماعت) کے ساتھ آسانی کتابیں بھی

ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا، اس غرض سے تھا کہ

اللہ تعالیٰ راہِ رسل و کتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ

رہنہ میں فیصلہ سرمدیں دیکھو کہ رسل و کتب امر واقعی کا انہماک دیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین

ہونے سے ظاہر ہے کہ فیرو واقعی کا غلط ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہی، اور ان پیغمبروں کے

ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار کار رکھ کر اپنے سب

اختلافات مٹاتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع

کر دیا، اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو اول

وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم و اہل فہم نے) کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے

ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا، بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح

پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف، باہمی

مذاہب کی وجہ سے) اور اصل وجہ مذاہب کی حجت دنیا ہوتی ہے، حجت مال ہو یا حجت جاہ، پس

مدار علت مخالفت حق کا وہی حجت دنیا ٹھہری اور یہی مضمون تھا سابق میں، پھر یہ اختلاف کفار کا

کسی اہل ایمان کو مضرب نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں اختلاف

اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ

تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلا دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب و ملت اور

تعلیم و خیال پر تھے جو ملت حق اور دین فطرت تھی، پھر انہیں مزاج و ذوق اور رائے فکر کے اختلاف پہنچے مختلف خیالات

و عقائد پیدا ہو گئے، جن میں یہ بہت سبب از کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کو تسلیم کر لیا اور باطل کو تسلیم کر لیا

واضح کرنے اور صحیح راہ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے، اور ان پر کتابیں

اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اصلاح کے بعد انسان دو گروہوں

میں منقسم ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام

کے متبع ہو گئے، جن کو مومن کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام

کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ کافر کہلاتے ہیں، اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: كَانَتِ

النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا ہے کہ لفظ "أُمَّة"

عرب لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اتحاد اور وحدت

قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطہ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ و غیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابل غور ہیں،

اول یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی، امر اول کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلافات جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا، اس کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدت فکر و خیال اور وحدت عقیدہ و مسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ تمام افراد انسانی صرف ایک ہی عقیدہ و خیال اور ایک ہی مذہب و مسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ و مسلک کیا تھا، اس میں دراحتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدہ توحید و ایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کفر و ضلال پر متحد تھے۔ مگر جمہور مفتقرین کے نزدیک رائج یہ ہے کہ مراد عقائد صحیحہ توحید و ایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورہ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے،

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً
فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كِتَابٌ مِّنْ قَبْلِكَ
لَبَدَّلْنَا لَكَ الْفُتُورَ ۚ بَلْ يَسْتَعْجِلُونَ
بِقَوْلِكَ ۖ وَيَخْتَلِفُونَ ۚ (۱۰: ۱۹)

جملہ لوگوں کا ایسا فیصلہ کر دینا کہ جن سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔

اور سورہ انبیاء میں فرمایا:

إِن هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوا ۚ (۲۱: ۹۲)

اسی طرح سورہ مؤمنون میں فرمایا:

وَأَنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً
وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوا ۚ (۲۳: ۵۲)

یہ تھوڑی جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمھارا رب ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے ہو۔

یعنی یہ تھوڑی جماعت ایک ہی جماعت ہو اور میں تمھارا رب ہوں، اس لئے تمھارے ہی ڈرنے والے ہوں۔

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دین حق توحید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ یہ دین حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفتقرین صحابہؓ میں سے حضرت ابی بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالم ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارجح کہ پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ یعنی کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بلیک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افراد سالانہ ایک ہی عقیدہ حق پر قائم تھے جس کا نام ایمان و اسلام ہے (قرطبی)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہو جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ حواء کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پہلی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور اپنی کی تعلیم و تلقین کے تابع توحید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدت عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت تک سب کے سب علم اور توحید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر قرن سے ایک صدی مراد ہو تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جب کہ نوح علیہ السلام کی بددعا سے دنیا میں طوفان آیا، اور جب زرگن لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دنیا میں رہے وہ سب سلمان مومن اور دین حق کے پیرو تھے۔

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے ایسے ہی تھے جن میں سارے انسان ملت واحدہ اور امت واحدہ بنے ہوئے دین حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے، فَبَعَثْنَا إِلَيْكَ الرُّسُلَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَلَٰكِن مَّا يَكْمُلُ إِلَيْكَ الْإِنسَانُ إِلَّا لِيُخْشِيَ اللَّهَ ۚ (۲: ۲۱۳)

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا امت واحد اور ملت واحد ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اس پر تفسیر کی گئی ہے کہ ہم نے انبیاء اور کتابیں بھی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے پیچھے کی ملت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیت مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتداء عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدہ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اوپر صرف امت واحد ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اسلوب حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں کہ قرآن کریم احوال ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سائے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاق کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجو، تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے، یوسفُ اٰیۡتۡہَا الصِّدِّیْقِیۡنِ، اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پہلے اور اگلے جملوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدت ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اختلافات کا وقوع تو ساری دنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان اختلافات کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذر چکا ہے جس میں سارے انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دین حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلاف دنیا میں پہلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آتے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت تھی، ان یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راہ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا فَتَعَثَّ اٰلۡہٖمۡ الذِّہۡنِ، یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دین حق کا اقباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی غرض خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذاب جہنم کی دھمک سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجی جو مختلف عقائد و خیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کر کے بتلا دیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء

رسل اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایات واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اول وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیات الہیہ بھی گئی تھیں، یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی استنباط یا القباس کی گنجائش نہ تھی، اگر ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دوسرا گروہ وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہ ہدایت پر لگا دیا اور جس نے انبیاء و رسل اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انھیں دونوں گروہوں کا بیان قرآن کریم نے سورۃ تہا میں اس طرح فرمایا ہے:

خَلَقْنٰكُمْ فَمِنْكُمْ کَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّسْلِمٌ
فَمَنْ اَشْرٰکَ فَمِنْکُمْ اٰیۡتَہٗمۡ
تَبٰیۡنَ اللّٰہُ فَاٰیۡتَہٗمۡ
کَافِرٌ وَّ مُّسْلِمٌ

فلا منہ معنوں آیت حکایت انسان امتی و اجماع کا یہ ہے کہ پہلے دنیا کے سب انسان دین حق پر قائم تھے، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی فہستہ آ گئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں القباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتابیں راہ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دین حق پر دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجی جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات واضحہ اور آیات مبینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کر لی۔

مسائل

مسئلہ: اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دین حق کی ملت واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں پھر ان کو اسی ملت واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا آتا کہ جب لوگ اس راہ حق سے پچھلے قوانین کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نئی بھیجا، اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی بچے خود دوسرا نئی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اس راہ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک بیمار پر بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور دوا پر ہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا

اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بیماریوں سے بچنے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصول علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخہ جامع اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید گئے، اور کئی کتابوں میں تحریر ہو کر پچھلے انبیاء کی تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ ادھر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نبی اور نبی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی، اس کا یہ انتظام فرمایا گیا کہ قرآن کریم کے تحریر سے محفوظ رہنے کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا جو ہمیشہ دین حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں مشائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازہ نبوت اور دہی کا بند ہو جانا ناگزیر امر تھا، آخر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دور میں نہ بڑ جائے کہ انبیاء کو کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ منشاء ان سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دین حق کے پیرو ہو کر ملت واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دین حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ: دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بنا، بر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا در قوی نظریہ میں منشاء قرآنی کے مطابق ہر آیت **فَبَنَیْکُمْ کَافًۢرًا وَبَنَیْکُمْ مُؤْمِنًا** اس پر شاہد ہوا اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس در قوی نظریے کی اصل بنیاد و حقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتداء آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر تھی بلکہ عقیدہ حق اور دین حق کی پیروی پر تھی، ارشاد قرآنی **اِنَّ اِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَافٍ** بتلایا کہ ابتداء عالم میں اعتقاد صحیح اور دین حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدت قوی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جدا گانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ: تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ بڑے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتاب الہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور و خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہل ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے متکفل نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عداوت اور انبیاء کی مخالفت

کا اختیار کیا، اسی طرح مؤمنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلائے رہیں، اور شاید اس مناسبت سے اہل آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات پر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ

کہ تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن

الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاسَاءُ وَالضَّرَآءُ وَ

لوگوں کے جیسے جو تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور

رَزَزُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا مَعَهُ مَتٰی

بھڑ بھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اُن کے ساتھ ایمان لائے کب آدے گی

تَصْرَافُ الْاٰلَانِ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ

اللہ کی مدد، سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

رابط آیات اور ہر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مؤمنین کے ساتھ اختلاف اور مخالفت کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو سہ تنہا کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مؤمنین کو انواع الفواعل کی ایذا میں اور شکار پیچھے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذا میں پہنچتی ہیں اُن پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خلاصہ تفسیر (دوسری بات سنو) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جاؤ گے حالانکہ (ابھی کچھ مشقت تو اٹھانی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہنوز ان

(مسلمان) لوگوں کا سا لمحہ وصال پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی مشکی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں

ہدینہ کے (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی جس پر ان کو جوابے تسلی کی گئی کہ: یاد رکھو! بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

معارف ومسائل

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں :

ازل یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا اس طرح محنت و مشقت کا کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عسب سے زیادہ سخت بلائیں اور عسبیتیں

أَشَدُّ النَّاسِ بِلَاغِ الْأَنْبِيَاءِ

انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، ان کے بعد جو

فَمَثَلُ الْمَثَلِ قَالِ الْمَثَلِ

آن کے قریب تو ہیں ۛ

— *Journal of the American Medical Association*

دوسری بات یہاں قابلِ نظر یہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد و کتب آئے گی کیسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو اُن کی شان کے خلاف ہے بلکہ اس سوال کا منشاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں منسرایا، اس لئے حالتِ خطر میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجی جائے، اور ایسی دعا کرنا تو مکمل یا منصبِ نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاج و زواہی کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحاء امت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ

تجھ سے بڑھنے ہیں کیا ہر خرچ کرے کہ دو کرو کہ نہ خرچ کرو مال سو مال باپ کے لئے

4

وَالْأَفْرَاقِينَ وَالْيَمَنِيَّ وَالْمَلَائِكِينَ قَائِمِينَ السَّيْلُ وَمَا

اور قرابت والوں کے اور بیٹھوں کے اور عیالوں کے اور مسافروں کے اور جو کچھ

تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾

کرو گئے تم بھلائی سودہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

خلاصہ تفسیر

بارہواں حکم، صدقہ کے مصارف

مالِ تم کو صرف کرنا ہو سو اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ ماں باپ کا حق ہے اور قربات داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مساکین کا اور جو نسیانک کام کرو گے (خواہ راہِ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سوا اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حقیقت سے یہ معصوم بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے، کہ کفر و نفاق کو چھوڑ دو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی اذیت و فرائز واری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال و جان اور دیگر معاملات مثلاً نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور ارد گرد سے جو سلسلہ احکام ابواباً بزرگ جاری ہے اس میں داخل ہیں۔ اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفتاء اور سوالات کا جواب براہ راست عرشِ رحمت سے براستہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے اور قرآن کریم کی آیت **قُلِ اللّٰهُ يُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ** (۱۱۱) میں مراد حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے۔ اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی بلقیں کئے گئے ہیں، بہر حال اس رکوع میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرام کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورہ بقرہ میں



یہ ایک سورہ مائدہ میں ایک سورہ انفال میں یہ نو سوالات تو صحابہ کرام کی طرف سے ہیں، سورہ اعراف میں دو اور سورہ بنی اسرائیل سورہ کہف سورہ لقہ سورہ نازعات میں ایک ایک یہ کل چھ سوال کفار کی طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں جواب کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انھوں نے سوالات بہت کم کئے کل تیرے مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ جہزات لمخزرت سوال نہ کرتے تھے (قرطبی) مذکور بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرام کا استفادہ یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے، يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر اپنی الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا، وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیت مستذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں یہ ممکن اُن حالات و واقعات میں غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہیں میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں مثلاً آیت متذکرہ کا شاہانِ نزول یہ ہے کہ عربین جو حج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ مَا مَنَعُكَ مِنْ أَمْرِ النَّارِ وَآيَاتِنَ لَنَصُحُّهَا (اگرچہ ابن المنذر منطہری) یعنی ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں: اور ابن جریر کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمر و ابن جوہر کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جز دیے، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصروف کیا ہو کہ کن لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اسی سوال پر مشتمل ہے اس کا شان نزول ہر روایت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اتفاقاً فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے ہم اس کی رضاقت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کوئی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، اس سوال میں صرف ایک ہی جزء ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، اس کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزء کو یعنی کہاں

خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں
کا جواب ضمنی طور پر دیدینا کافی سمجھا گیا، اب الفاظِ شترآئی میں دونوں احزاب پر نظر فرمائیں،
پہلے جز یعنی کہاں خرچ کریں کے متعلق ارشادِ ہدیر مَتَا أَفْعَلْتُمْ مِمَّنْ تَحْبِبُونَ قَالُوا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ مَلِكٍ
وَالسَّبْغِيِّ وَالْأَنْبَسِيِّ ذَاتِ الْإِسْبِطِ۔ یعنی جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے لئے
ماں باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافر ہیں۔

اور دوسرے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا وَمَا تَنْفَعُكُمْ اَمِّنْ تَحْلِيْلُ قَاتِ اَمِّنْ بِہٖ عَلَیْکُمْ یعنی تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہو، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کرو، بلکہ کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کر دے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پائے گے۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصروف کیا ہو کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دینا کافی سمجھا گیا، اور بعد دلی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا اَنْفَعُوْا، یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ: اول یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصاب مال بھی مسترر ہو اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پر رسی طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ بھی نصاب مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقات نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مفہوم الدین کو بھی مسترر دیا گیا ہے، حالانکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضہ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ: دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ ماں باپ اور دوسرے اہل
استراار کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو
وہ بھی موجب اجر و ثواب اور انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ: ہمیری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفل صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے، کہ جو مال اپنی ضروریات سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگ میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے قرضخواہ کو ادا نہ کرے اور نفل صدقات و خیرات میں اڑائے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دیگر حضرات نے حکم و حجت قرار دیا، کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کر کے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ دینؓ اس پر ہیں کہ ارشاد و شرعی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، ہر صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید کہ بری لگے تم کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمھارے حق میں اور شاید تم کو چل لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمھارے حق میں

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۸﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، تم سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

الْحَرَامِ قَالِ فِيهِ قُلْ فِيهِ كَيْبُورٌ وَصَلُّ عَنْ سَبِيلِ

کراس میں لڑنا کیسا، کہہ دے اس میں لڑائی بڑا مکنا ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے

اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے

أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ

اس سے بھی زیادہ مکنا ہے اللہ کے نزدیک اور لوگوں کو دین سے بھلانا قتل سے بھی بڑھ کر بری اور کفار حق ہمیشہ تم سے

يَقَاتِلُوكُمْ مَّعَشَىٰ يَرْدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنْ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ

لڑتے ہیں تم سے یہاں تک کہ تم کو پھر دین تمھارے دین سے اگر قابو پاویں، اور جو کوئی

يُرْتَدِدْ دِينَكُمْ عَنْ دِينِهِ فِيمَتٌ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ

پھر تم میں سے اپنے دین سے پھر مجاہدے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے منافع ہوتے

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ

عمل دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں وہ اس میں

فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۱۹﴾ إِنَّ الدِّينَ أَمْرٌ أَوَّلُ الَّذِينَ هَاجَرُوا وَجْهَهُ

ہمیشہ رہیں گے، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور لڑے

فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ

اللہ کی راہ میں وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا

رَحِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر

تیرہواں حکم فرضیت جہاد جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو ملے گا (معلوم ہوتا)

ہو، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ

تمھارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو اور (ہر شے کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم

(پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے بُرے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کر دو کچھ اللہ کا حکم ہو جاتے، یہی

سو اجالا مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)

چودھواں حکم تحقیق قتال در شہر حرام (حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ کا ایک سفر میں

ان کے ساتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا جب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جادوی الاخریٰ

کی تیسری سچتے تھے، اور جب شہر حرم میں سے ہے کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے

شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار تشریف لے گئے بھی حاضر ہو کر اعتراضا سوال کیا، اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے)۔

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عدا) قتال کرنا جرم عظیم ہے مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے بسبب غلط سے ایسا ہو گیا یہ تو تحقیقی جواب ہے، اور الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کس طرح نہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کر زار دین مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حق کو گناہ اور مجرم حرام (یعنی کبیر) کے ساتھ کفر کرنا کہ وہاں بہت سے بیت رکھ چھوڑے تھے، اور بچائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے، اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دس مومنین) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا جس سے فوجت ہجرت لین ترک وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ جرم عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پروازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پروازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے، خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو ضرر پہنچا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے) اور یہ کفار تمھارے ساتھ ہمیشہ جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی رکھیں گے، اس فرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پا دیں تو تم کو تمھارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجمل ارتداد اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں، (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جواب مذکور منکر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔

وعدۃ ثواب اخلاص نیت حقیقتہً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے ماہ خدا میں جو دین کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہو کر رہتے ہیں، (اور) تم لوگوں میں یہ صفات علی سبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، اور اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمھاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا امید

ہوتے ہو، اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کر دیں گے اور ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر رحمت کریں گے۔

معارف و مسائل

بعض احکام جہاد مسئلہ ۱۔ مذکور الصدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کَتَبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالَ، یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا، ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر ملک پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیات قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ مسلمانین کے طور پر ہر مسلمان پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمان کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کرے تو باقی مسلمان سبکدوش بھی جاتے ہیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ ہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گنہگار ہو جائیں گے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اَلْجِهَادُ مَآجِنٌ اِلٰی یَوْمِ اَقْبَیَا مَتَّحَ کَا یہ مطلب ہو کہ قیامت تک ایسی جماعت کا موجود نہ ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی ہے، قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُنُوْا عَلٰی الدِّیْنِ حٰزِمِیْنَ
تَعْلٰیل دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے در فوج
بھلائی کا وعدہ کیا ہے

تَحٰقُّ عَلَیْکُمُ الْجِهَادُ بِمَا مَرَرْنَا
وَاَنْتُمْ حَرَجٌ عَلَی الْقَوْمِ دَیْنًا
وَوَعَدَ اللّٰهُ الْخٰیِرَ (۹۵:۱۴)

اس میں ایسے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہو کر جہاد میں شریک نہ ہوں ان سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض میں ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ حسن یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت تھی، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:

اُوْکُیُوْا عَلَی الْکُفْرِ ہُوْنًا
چھوٹی جماعت اس کام کیلئے کہ وہ دین کی بوجھ بوجھ

لَقَدْ لَا تُغْنِیْ عَنْکُمْ فِیْزَاقُہُمْ وَبَنَیْنُہُمْ
طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّہُوْا فِی الدِّیْنِ (۱۱۲:۱۹)

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں اور کچھ تعلیم دین میں مشغول رہیں، اور یہ جیسی ہو سکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔ نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمھارے ماں باپ زندہ ہیں

مذکورہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت زد القعدہ میں نہیں، مثال میں ہوسے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الشَّعْرُ الْخَرَامُ بِالشَّعْرِ الْخَرَامِ** الآیہ - (۱۶۴:۲)

توضیح یہ ہوا کہ ابتداء قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعت قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّعْرِ الْخَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتَطَّتْ أَعْتَاكُمُ فِي النَّبَاِ وَالْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، عالیت اسلام میں نماز روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادت میں ثواب نہیں ملتا، ابد الابد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصلی ہو اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلقت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جو قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لادے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام جس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھے پوچھتے ہیں علم شراب کا اور جوئے کا کہہ لے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نُّفُوعِهِمَا

بہی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان دونوں چیزوں کے ہستمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی رہتی ہیں جاتی ہیں اور لوگوں کو رہتی ہیں، فائدے سے بھی ہیں اور روزہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداء اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

مذکورہ کو اس کا نسخہ نہیں کہا جاسکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ طاقت زد القعدہ میں نہیں، شرال میں ہول ہے اس لئے اس کو بھی نسخہ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہر حرم میں قتال کی حرمت مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان ہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے جس کی تصریح اس آیت میں ہے، **الشَّعْرُ الْخَرَامُ بِالشَّعْرِ الْخَرَامِ** الآیہ - (۱۶۴:۲)

توضیح: یہ ہوا کہ ابتداً قتال تو ان ہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان ہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعتاً قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہر حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتدا کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔

انجام ارتداد آیت مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّعْرِ الْخَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **يَحْتَطَّتْ أَعْتَاكُمُ فِي النَّبَاِ وَالْآخِرَةِ** یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔

مسئلہ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہو کہ اس کی بی بی نکاح سے بچل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، عالیت اسلام میں نماز روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابدال آباد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جائے تو آخرت میں دوزخ سے بچے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر کچھ کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزہ کے ثواب کا عود کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز روزہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ لیکن جو کافر اصلی ہوا اور اس حالت میں کوئی نیک کام کرے اس کا ثواب ملتا رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مگر تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں اسلمت علی ما اسلفت من خیر اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ، فحش مرتد کی حالت کا فرائض سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جود قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام دلا دے اگر مرد ہے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام جس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی امانت ہوتی ہے، سرکاری امانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا آثَمُ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ

تجھے پوچھتے ہیں علم شراب کا اور جوئے کا کہہ لے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدہ

لِلنَّاسِ وَآثَمُ مِمَّا أَكْبَرُ مِنْ نُّفُوعِهِمَا

بہی لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیں گے کہ ان دونوں چیزوں کے ہستمال میں گناہ کی بڑی بڑی بائیں بھی رسید ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو (بیٹھے) فائدے بھی ہیں اور (دوہ) گناہ کی بائیں ان فائدوں سے زیادہ بڑی ہوتی ہیں اس لئے دونوں قابل ترک ہیں۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہوا یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے۔

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ اعمال

ابتداءً اسلام میں عام رسوم جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جو کھیلنے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر ان پر فریقہ تھے، ان کے اندر جو بہت مفاسد اور خرابیاں ہیں ان کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادیۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خط میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبیعت خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرامؓ بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد چند حضرات صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا حضرت فاروق اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی حشراب کرتے ہیں، اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی، یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور قمار سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور قمار میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑی ہوتی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بن جائیں، مثلاً شراب میں سبکے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہو جاتا ہے جو تمام کمالات اور شرف انسانی کا اصل اصل ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو بڑے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر بڑے کام کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کر دیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، مگر اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ کو اس مشورہ ہی کو قبول کر کے اسی وقت شراب کو چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا ہے بلکہ مفاسد دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سبب گناہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفاسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں اس لئے پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد

حسب دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورۃ قل یا یٰٰہٰیہا النّٰخِرۃ یٰٰہٰیہا کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دو سرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰٰہٰیہا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْعَبُوْا
الْخَمْرَ وَآلَہٗا سَکَرَہٗا (۲: ۲۱۹)

تین ایسے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں
نماز کے پاس نہ جاؤ۔

اس میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی، جن حضرات صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو چھوڑا تھا اسی آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو قطعاً ترک کر دیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقات نماز کے شراب کی حرمت مطلقاً پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اب بھی اوقات نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عتبہ بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی جن میں محمد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسب دستور شراب کا ذور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعرو شاعری اور اپنے اپنے مفاسد کا بیان شروع ہوا، محمد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصار مدینہ کی بھو اور اپنی قوم کی مدح و ثناء تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا، اور ادب کے جھڑکے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر مار دی، جس سے ان کو شدید زخم آ گیا، حضرت سعدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اَللّٰهُمَّ یٰٰہٰیہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْعَبُوْا الخ، یعنی یا اللہ شراب کے بارے میں ہیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے، اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورہ مائدہ کی مفصل نازل ہو گئی، جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا، آیت یہ ہے:

یٰٰہٰیہا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْعَبُوْا
الْخَمْرَ وَآلَہٗا سَکَرَہٗا
ہَکَیۡلَ الْخَمْرِ فَاِذَا کُنْتُمْ عَلَیْہِ
تَقْلِیۡحُوۡنَ ۚ اِنَّ مَسَابِقَ الْبَیۡتِ
اَنَّ یُزَوِّجَ بَیۡنَکُمَا اَعۡنَ اَوۡفَ
الْبَغۡضَآءِ فِی الْخَمْرِ وَآلَہِ السَّکَرِ

تین ایسے ایمان والو! بات یہ ہے کہ شراب
اور خمر اور مسکرات اور جو کچھ کے برابر سب گھنہ
ہیں شیطانی کام ہیں اس سے بالکل الگ
الگ رہو تاکہ تم نہ ہو شیطان قورہ جانا
ہے کہ شراب درجہ کے ذریعہ تمہارے آپس
میں بغض اور مداومت پیدا کر دے

وَيَسْتَكْبِرُونَ وَكَرِهُوا اللَّهَ وَيَحِبُّونَ الصَّلَاةَ
فَقُلْ أَنتُمْ مَنْتَهُونَ (۹۱: ۵)

اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے۔
سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔

حُرمت شراب کے تدریجی احکام

احکام الہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکام الحاکمین ہی جانتا ہے، مگر احکام شریعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اعتبار میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود مستران کریم نے فرمایا: لَا تَكِلُكَ إِلَهُكَ تَقْسَالًا لَّكَ وَتَشَقًّا (۲۸۹: ۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔ اسی رحمت و حکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔ شراب کی تدریجی مانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر ادھر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورۃ بقرہ کی چوتھی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفاہم کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا ایک مشورہ دیا کہ یہ پھوڑنے کی چیز ہے، مگر پھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورۃ نساء کی لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ میں خاص اوقات نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورۃ مائدہ کی ہیں، جو ادھر پر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دیا۔

شریعت اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر انتہائی شاق اور مگرانہ ہوتا، علماء نے فرمایا: نِظَامُ الْعَادَةِ آمَنٌ مِنْ فُطْرَمِ الْوَصْلَةِ عَيْنٍ جِيسَ بَجْعَ كَوَالٍ كَادِرٍ دَحِ بِنِي كِي عَادَتِ چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے انسان کو اپنی کسی عادت مستحضرہ کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے، اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اول اس کی بڑائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں منوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔ ان جس طرح ابتدائے تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی مانعت کے قانون کو بڑی شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اول سخت و عیب مذاہب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ اتم الخبائث اور اتم الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی تجھ سے گھٹے

گناہ کا مرکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ دو ایسی نساتی ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی، پھوڑنے والا، بنانے والا، پینے والا، پلانے والا، اس کو لاد کر لانے والا، اور جس کے لئے لائی جائے، اور اس کا بیچنے والا، خریدنے والا، اس کو بہہ کرنے والا، اس کی آمدنی کھانے والا، اور پھر صرف لربانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ علی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔ حتیٰ میں تعلیم حکم کا پیشال جہذا فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھر نہیں جو شراب استعمال کیلئے رکھی تھی اُس کو تو اسی وقت پہاڑیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گھلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبویا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لاکر توڑ دیا، حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دُرِ جام کے ساتھی بنے ہوئے تھے، ابو طلحہ، ابو عبیدہ، بن جراح، ابی بن کعب، ہبیل، رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتی ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سب توڑ دو، بعض روایات میں ہے کہ اعلان حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب ہوں تک پہنچا ہوا تھا اُس لے وہیں سے اس کو پھینک دیا، مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی ڈک پانی، اور مدینہ کی گھلیوں میں عرصہ ملازمت یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بواور رنگ مٹی میں بکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب، ہر وہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرما سب دار صحابہ کرامؓ نے بلا تا مل معسرہ جگہ پر جمع فرما دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا اور بانی دوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کر کے چاک کرا دیا، ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملک مشم سے شراب درآمد کیا کرتے تھے اتفاقاً اس زمانے میں ابھی ساری رقم جمع کر کے ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلان حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابیؓ نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی مصلحت کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آ رہے تھے اعلان حرمت

سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دیدیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہا دو، فرمانبردار محبتِ خدا و رسولؐ نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا، یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز دے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جن چیزوں کی عادت ہو جائے سب چھوڑ دیتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم الہی اور فرمانِ نبویؐ نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور مخمر سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام
ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمتِ شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشر کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، ان کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغض اور نفش و نا پاک ہو گئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب چند سال پہلے امریکہ کے ماہرینِ صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگادیتے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستوں میں ترمیم کر کے امتناعِ شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکہ میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے اربابِ سیاست کی رپورٹوں سے دنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعتِ قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور وہ جو ترقی یافتہ امریکہ کے حالات و معاملات کا یہ عظیم منسرق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہو کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔

ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعتِ اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیاوی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسولؐ کی آواز پر اپنی جان و مال آبر و سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں سکی زندگی کے پورے دور میں یہی انفراد سازی کا کام رہا حضرات کے ذریعے ہوتا رہا، جب جان نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکہ نے بھی اپنے بے مثال ذرائع استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ و پے میں فکرِ آخرت سمائی ہوئی تھی۔ کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخہ کیمیا کو استعمال کر کے دیکھیں تو دنیا کو امن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد
اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے

مفسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند نفی ضابطے بیان کئے جائیں گے، جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں پہلے شراب کر لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنِ انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوی پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمن ڈاکٹر نے بیان کیا ہے کہ جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے، جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی وہ جہانی اور قوت کے اعتبار سے ٹھیک سے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ

شراب بگرا اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، بیل کی پیاری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں بیل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدمی اموات مرض بیل میں ہوتی ہیں اور آدمی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جبکہ وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود وقت مافکہ کو بھی ضیعت کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی فوبت پہنچ جاتی ہے، اہلباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جزو بدن بنتی ہے اور نہ اس کا خون بنتا ہے، جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں بھجوان پیدا کر دیتی ہے جس سے وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعہ ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ نیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب کے شرابیں یعنی وہ رنگیں جن کے ذریعے سانس بدن میں روح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہیں جس سے بڑھا پا جلدی آ جاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور نفیس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی دائمی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار سیل تک فوبت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے، اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں ہستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں حقانیت کا انکار کرتے ہیں، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر نہ بھی طویل نظر ہو تا شروع ہوتا ہے، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ سب مضرتیں مشاہدہ میں آ جاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت و در تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں، شریعت اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورۃ مائدہ میں نص صریح کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْمِرُ وَالْمُنْجَرُ فِي الْبَغْضَاءِ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ** (۹۱: ۵)

”یعنی شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جڑے کے ذریعے تمھارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کر دے“ شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر دیتا ہے جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آ سکتا ہو اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں، شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ ام الخبائث ہے، انسان کو تمام بُرے سے بُرے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں، اور اس کی روحانی مضرت کو ظاہر ہی ہے، کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: **وَيُضِلُّكُمْ كَثِيرًا ذِكْرَ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ** (۹۱: ۵) یعنی شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قیاس بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچ پوری مملکت فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے جس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ام الخبائث ”یا ام الفواحش“ ہے، جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ قول ضرب المثل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آرمے شراب خانے بند کر دیے جاتیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آرمے شفا خانے اور آدھو جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لمفتی عبیدہ، ص ۲۲۶ ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اپنی کتاب التجا پر میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب مؤخر و سوانح فی الاسلام میں لکھتے ہیں: ”بہت زیادہ ہلک ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بچ کنی کی گئی اور وہ دھماکا

تو اگر جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ شراب تھی۔ ہم نے الہود اثر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ ان کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے ذرہ چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک انگریز قانون دان بتام لکھتے ہیں کہ :

”اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سراپت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چمک لگ گیا ان کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔“

غرض جس بجلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ جس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس آئم الخبائث سے باز آ جاؤ،

فَقُلْ إِنَّمَا نُنْفِئُ عَنْ طَمَاسٍ (۱۱: ۵)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق مسترآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اور پرآچکا ہے سورہ نمل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے :

وَمِنْ شَرِّهِمُ الْخَمْرُ وَالْمَيْمُونُ	اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے ہم لوگ نشہ
الْأَعْنَابُ سَخِيحٌ وَزَيْتُونُهُ	کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو،
سَكْرَانُ وَيَرْفُقُونَ، إِنَّا نَفِي	بے شک میں میں ان لوگوں کے لئے بڑی ذلیل
ذُلًّا لَا يَتَّقُونَ يَتَّقُونَ يَتَّقُونَ (۱۶: ۶۷)	جو جو قتل رکھتے ہیں و

پہلے آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذا میں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں

پہلے ذرہ کا ذکر کیا، جس کو قدرت نے حیران کے پیٹ میں غن اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نسقیکم استعمال فرمایا کہ ہم نے ذرہ پلایا، اس کے بعد سنسرایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور صنعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اس دخل کے نتیجہ میں وہ طرح کی چیزیں بناتی ہیں، ایک نشہ آور چیز جس کو خمر شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تر و تازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عتلا کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت لغت ہونے سے نہیں بچل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ ”سکر“ کے مقابل ”رزق حسن“ رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جھوٹے شہین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں، رزق المعانی، قرطبی (جصاص)

یہ آیات اتفاق امت مکتی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزل آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان مام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحت شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے (ذہا ملخص مانی الجصاص والقرطبی)

۱۵ بعد مام نے اس کے معنی سکر یا بے نشہ بنیڈ کے ہیں (جصاص، قرطبی)، مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

حرمت قمار (جوا)

میسر مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یا سر تقسیم کرنا کہ جس کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جو اکھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پوتے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقرائیں تقسیم کیا جاتا خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوئے میں چونکہ فقر کا فائدہ اور جو اکھیلنے والوں کی فداوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعٹ فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کجوس اور مخوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؓ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام المسترآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن عمرؓ اور قتادہؓ اور معاذ بن صالحؓ اور عطاءؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا:

المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعب والجریر، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے ٹکڑوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا المکھاطرة من الکھتارۃ یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔ (رجحان)

ابن سیرینؒ نے فرمایا جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ (روح البیان)

مخاطرہ کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آجکل کی لاشری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بناء پر نفع خالص یا تادان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں دشامی، ص ۲۵۵ جلد ۲ کتاب الخطر والاباحۃ، مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید ہر تادان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں وہ سب میسر اور قمار اور کھلائے گا، معنی حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لاشری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب العام مقرر کیا جائے

کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیث صحیحہ میں شرط نفع اور جو سر وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مسال کی بارجیت پائی جاتی ہے، تاش پر اگر روپیہ کی بارجیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نزد شیر (جو سر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شرط نفع میسر یعنی جوئے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شرط نفع تو نزد شیر سے بھی زیادہ بڑی ہے (تفسیر ابن کثیر)

ابتداء اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مگر جب سورۃ روم کی آیات غُلِبَتِ الذِّکْرُ نَازِلٌ ہوئی، اور مسترآن نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حرلین کسری سے مغلوب ہو گئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط پھرائی، کہ اگر اتنے سال میں رومی غلب آئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپؐ نے اس واقعہ پر اظہار مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دیدیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی لئے شراب اور تمعار سے ہمیشہ آپؐ نے جہتنباب کیا، اور خاص خاص صحابہؓ کرامؓ بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امینؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیار کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں، عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جب کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دی تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اس لئے میں کسی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے یہوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع و ضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کسی بت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے اس لئے میں نے کسی زانیہ نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ بھوٹ بولنا دناہیت اور زوالت کی بات ہر

اس لئے کہیں جہالت میں بھی بھوٹ نہیں بولا (روح السببان)

قمار کے سامنے اور اجتماعی نقصاناً قمار میں جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے ہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے، کہ جیت جاتے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بد حال آدمی ایک ہی دن میں مالدار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا رد بارے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منہدم حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی افغان کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسائی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خوشخوار و درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کر دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جہانز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بگھٹی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوئے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب کا مادہ محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوئے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بیان کی ہو کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوئے کا معاملہ اگر در چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان عاقبت نا اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے بکنگ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوئے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تقوڑا تقوڑا رہ رہ کر تباہ ہو جاتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہو وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ

اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو در چار آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے مام افراد کی دولت گھٹتی جائیگی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرکوز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹڈ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرمادیا ہے، اِنِّیْ لَا یُکُوْنُ ذُوْ لِقَابٍ اِلَّا غَنٰیًا وَیُنْکَذَرُ (۵۹: ۵۹) یعنی مال نے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار میں جوئے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت ہملک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے،

اِنَّمَا یُرِیدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یَّوْذِعَ
بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَا فِی
الْاَمْرِ دَیْنِیِّ وَیَصُدَّ عَنْ
ذِکْرِ اللّٰهِ وَتَحَنِیْنَ الصَّلٰوۃِ (۵: ۵۵)

”شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے
کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض
و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز
سے روک دے“

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے پھلے برے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیت میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفاسد ذکر فرمائے ہیں، کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہیں، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریقہ ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو

قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے۔

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

توگوں کے مال باطل طریقہ پر مست

بِالْبَاطِلِ - (۲: ۲۸۸)

کھاؤ۔

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعہ بہت سے گھر بار ہو جاتے ہیں، لکھتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان معیشت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملے کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں وہ اب دیوالیہ ہو جاتے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر رہی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا رمانگ کی محنت سے کوئی دولت بڑھا کر اس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جائے۔ یہ مختصر فرست ہو قمار کے مفسدہ کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہو بلکہ اس کے سب متعلقین اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: **وَأَنذَرْتُمْ بَيْنَهُم مِّنْ قُلُوبِهِم**، یعنی شراب و قمار کے مفسدان کے نفع سے زیادہ ہیں۔

چند فقہی ضابطے اور فوائد | اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جس سے ایک اہم نتیجہ

یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اس در اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دنیا کی کوئی بھری سے بڑی چیز بھی منافع سے خالی نہیں، نہ ہر قائل میں سانپ اور بچھو میں، ورنہ دونوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفسدان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغوار، دھوکہ، فریب، وغیرہ تمام جرائم میں کوئی ناجرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان ان کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری عقلمندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ انکی

مضرت فائدہ سے بڑھتی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقلمند انسان ان کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعت اسلام نے شراب اور قمار کے تحت حرام قرار دیا ہے، کہ اس کے فوائد سے زیادہ مضرتیں اور دینی و دنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ | اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں گے جو بچے اپنے خرچ سے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ

لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۸﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

تہم کو واسطے علم تاکہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الَّتِي تُقْرِضُ قُلِ إِصْلَاحُ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ

اور تم سے پوچھتے ہیں تمہوں کا قرض کہہ دے سنو ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملا تو وہ

فَاخْرَاجُوا نَفْسًا وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ

نہا کر بھائی میں اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سوار کرنے والے کو اور اگر اللہ چاہتا تو

لَا عُدَّتْكُمْ إِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ ذَكِيمٌ ﴿۲۱۹﴾ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَ

تم پر مشقت ڈالنا، بیشک اللہ زبردست جو تدبیر والا، اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے

حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَا مَنَافَةَ مَوَدَّةٍ خَيْرٌ مِّنْ مَّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ

جب تک ایمان نہ لے آئیں اور اہستہ لہندہ مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ تم کو بہل گئے،

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُرَ كَيْنَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور اہستہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک

مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو

سے اگرچہ وہ تم کو بہلا گئے وہ بلا تے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم کو لوگوں کو تاکہ وہ

يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

تصیحت قبول کریں۔

خُلاصہ تفسیر

۱۲ سو لہواں حکم، مقدار اتفاق اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ غیر خیرات میں کتنا خرچ کیا کریں آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دنیاوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے آخری تکلیف میں پڑ جائیں، اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو۔

۱۳ ستر ہواں حکم، مخالفتِ تمیم رچو نکا ابتداء میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی جیوں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سنائی گئی کہ جیوں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے اٹھائے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ ان کا کھانا بھی الگ بکراتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور ستر ہواں حکم کیونکہ اس کا استعمال نہ ان لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ تمیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور تمیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا، اور لوگ آپ سے تمیم بچوں کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ راصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلاف مصلحت ہے، زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو دیکھو ڈر کی بات نہیں کیونکہ وہ (بچے) تمہارے (دینی، بھائی میں زور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تم مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو دالگ الگ، جانتے ہیں اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور باطل و بلا قصد کچھ کی بیشی ہو بھی جائے تو چو نکا اللہ تعالیٰ کو اس کی

تیک یہی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہو گا، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اس معاملہ میں سخت قانون معتر کر کے، تم کو عیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں) مگر قانون سہل اس کو مقرر فرمایا کہ وہ (تکلیف دالے بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)۔

۱۴ اور نکاح مت کر دکا فسر عورتوں کے ساتھ جب تک کہ مسلمان اٹھارہواں حکم مناکحت کفار نہ ہو جاویں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزادی بی ہی کیوں نہ ہو) گوردہ (کافر عورت) بوجہ مال یا جمال کے (تم کو اچھی معلوم ہو) مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور اسی طرح اپنے اختیار کی عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت درجہ تک وہ مسلمان نہ ہو جاوے اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزادی کیوں نہ ہو) گوردہ (کافر مرد) بوجہ مال یا جاہ کے (تم کو اچھی معلوم ہو) مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وہ ان کافروں کے برا ہونے کی اور وہی اصل سبب ان سے ممانعت نکاح کا بتایا ہے کہ یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا بظور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمایا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور سختی جنت و مغفرت ہو جاویں)۔

۱۵ فوائد از بیان القرآن مسئلہ: جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اپنی کتاب سمجھ جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آجکل عورتوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے ان کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقدہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد، سوائے لوگ عیسائی نہیں ایسی جماعت میں کی جو عورت ہوا سے نکاح درست نہیں، لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

۱۶ مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت میں مسلمان سمجھا جائے لیکن حقائق اس کے کفر تک پہنچے ہوں اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں، اور اگر نکاح ہو جائے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح کو جائز جیسے آجکل بہت آدمی اپنے مذہب کے نادانانہ سنسنے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں لڑکی والوں پر واجب کہ پیام آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف و مسائل

مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے آیات مذکور میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کے سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودت اور یکجہانیت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور شرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قریب محبت و مودت کا لازمی اثر ہے کہ ان کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت ان کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرمادیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں، اس جگہ چند باتیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ شرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہل کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ** (۵۱)، اور اگر شرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہل کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام ان غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ شرعاً کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات شریعہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں ماسدی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں توحید، آخرت، رسالت، ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں شرک تک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں

مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا، بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ نقطہ ضعیف ہو اور پھر شوہر اس پر ماکم اور نگران بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور اذرا کاشکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابل غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی قوا احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہو، اور وہ ہی اسلام قبول کرنے کو اس کا مقصد ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں محنت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی امید بھی ہو اور کسی ضرر کا خلوہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچے گا، اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، غار کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ **عقلندہ تریاق بیعتین وزہر گیہاں نخورد** اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابل غور یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت ہو جائے گی، لیکن روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دیندار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو کم (دیندار) ہونے کا موقع میسر آئے، اور جب غیر مسلم مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو یہ غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب غیر مسلم عورتی عراق دشام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے اندیشے

کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ مشرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دیا نہ بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاست بھی و کتاب الآثار (علامہ محمدؒ) اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہودی و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مفکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا استراخود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب حدیث و فاع میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دور بین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلاتے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی توہمت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ تورات پر نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر ظاہر ہے کہ حلت نکاح کا استراخی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن ذَا الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الذِّنِّ اُذُوًا لِّکِتَابِ کے مستثنائین داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحْضِيِّ قُلْ هُوَ آذَىٰ فَاَعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي

اور جو سے بچتے ہیں مسک حیض کا کہنے وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض

الْمَحْضِيْنَ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی يَطْهَرْنَ فَاِذَا طَهَّرْنَ فَلَهُنَّ

کے وقت اور نزدیک نہ ہوں گے جب تک پاک نہ ہوں پھر جب خوب پاک ہو جائیں تو مجازاً ان کے

مِنْ حَيْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

پس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں تو بہ کرنے والے اور پلٹتے آتے ہیں

الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاَنْتُمْ حَرْثُكُمْ اَنْتُمْ

گندگی سے بچنے والے، تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں سو مجازاً اپنی کھیتی میں جہاں سے

سَلَّمْتُمْ زَوْقَیْ مَوْلَا نَفْسِکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ

چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو

مَّا لَقَوْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝

اس سے ملنا ہو اور خوش خبری سننا ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۹، حیض میں جماع (القول) وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اور لوگ

کی عزت اور پاکی کی شرائط آپ سے حیض کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے کا حکم پوچھتے ہیں، آپ

فرمادیتے کہ وہ (حیض) اندر کی چیز ہے، تو حالت حیض میں عورتوں کے ساتھ صحبت کرنے سے

علقہ رہا کرو اور اس حالت میں، ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض) پاک نہ ہو جائے

پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جائیں کہ ناپاکی کا شک نہ رہے (تو ان کے پاس

آ جاؤ لیکن ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے)

یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں تو بہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالت

حیض میں صحبت کر بیٹھا پھر متنبہ ہو کر قرب کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک سات رہنے والوں سے (جو

حالت حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے مہنیات سے بچتے ہیں اور حالت پاکی میں اجازت

صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو اس لیے کہ تمہاری بیوی

تمہارے لئے (بمنزلہ) کھیت کے ہیں (جس میں لطف بھائے تم کے اور بچہ بھائے پیداوار کے ہے)

سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آ جاؤ اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح

بیویوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے خواہ کر دہ سے ہو یا پیچھے

سے یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت

کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت

نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ آئندہ کے واسطے

اپنے لئے کھلا اعمال صالحہ کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو

کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے

ایمان داروں کو جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جائے گا یقین رکھیں خوشی

کی خبر سننا دیجے کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی۔

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَقْوُوا وَتُصِلُوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سبک کرنے سے اور ہر ہر گاروی اور گوار

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۷، ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ تم بینک

کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنہماں کر بات کرنا اور دل میں برائیالات نہ لانا)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ

بِمَا كَسَبْتُمْ فَلَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۰﴾

نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۸، بھڑکی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار و گیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار و گیر نہ فرماویں گے اس بھڑکی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار و گیر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹ قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی جہالت دی،

لَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

كَأَوْ قَاتِلُوا فَإِنَّ اللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۱﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

مابہل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اگر شہرایا چھوڑ دینے کو

فَإِنَّ اللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۷﴾

زبیر اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۷، ایلار کا حکم لَّذِينَ يُؤْلُونَ (القول) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار

ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی جہالت ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کریں تب

تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و تقاضہ سے) معاف کر دیں گے (اور چہرہ کو اب بانی کے حقوق

ادا کرنے کا اس پر) مدت فرما دیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر

قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو چار ماہ گزرنے ہی قطع طلاق پر جاویں گی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں

(اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِي أَسْرَاحٍ وَهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ

مِثْلُ مَا لِلنِّسَاءِ وَأَمَّا الْيَتَامَ وَالْمَسْكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُنَّ وَلَا تُسْرِفُوا

فِيهِمْ ذَٰلِكُمْ يَذُوقُونَ ﴿۴۲﴾ وَالَّذِينَ يَبِيعُوكُمْ فَيُبَاعُوكُمْ وَإِنْ يُضَاهُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُنَّ وَلَا تُسْرِفُوا فِيهِمْ ذَٰلِكُمْ يَذُوقُونَ ﴿۴۳﴾

وَالَّذِينَ يَبِيعُوكُمْ فَيُبَاعُوكُمْ وَإِنْ يُضَاهُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُنَّ وَلَا تُسْرِفُوا فِيهِمْ ذَٰلِكُمْ يَذُوقُونَ ﴿۴۴﴾

وَالَّذِينَ يَبِيعُوكُمْ فَيُبَاعُوكُمْ وَإِنْ يُضَاهُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُنَّ وَلَا تُسْرِفُوا فِيهِمْ ذَٰلِكُمْ يَذُوقُونَ ﴿۴۵﴾

وَالَّذِينَ يَبِيعُوكُمْ فَيُبَاعُوكُمْ وَإِنْ يُضَاهُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُنَّ وَلَا تُسْرِفُوا فِيهِمْ ذَٰلِكُمْ يَذُوقُونَ ﴿۴۶﴾

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَقْوُوا وَتُصِلُوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سبک کرنے سے اور ہر ہر گاروی اور گوار

بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۸﴾

میں صلح کرانے سے بچ جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۸: ایک کام نہ کرنے اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نبی کے اور کی قسم کی ممانعت تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ تم سبک

کام نہ کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برائیالات مت لانا)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ

بِمَا كَسَبَتْ أَيْمَانُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۳۹﴾

جس کا قصد کیا تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۹: بھوٹی قسمیں کھانیکا حکم اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دار و گیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر جس میں بلا قصد جھوٹ بولا گیا،

لیکن دار و گیر نہ فرماویں گے اس بھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے کا ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں کہ ایسی بیہودہ قسم پر دار و گیر نہ فرمائی، حلیم ہیں کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزائیں آخرت تک کی جہلت دیں

لَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ

كَأَوْ قَانَ اللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۴۰﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

مَامْلُکٌ حَتَّىٰ تَوَاصَحُوا وَلَا مَسْرَبَ لَهُمْ

اور اگر تمہارا خیال پھوڑ دینے کو

فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۴۱﴾

زبیر اللہ سنتے والا جانتے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۴۱: ایلار کا حکم لَّذِينَ يُؤْلُونَ (الی قولہ) سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی جو لوگ (مطلقہ مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا جیتے ہیں اپنی بیویوں کے پاس جانے سے ان کیلئے

چار مہینے تک کی جہلت ہے سوا اگر ان چار مہینے کے اندر یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف رجوع کریں) تب

تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ و کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چر کہ اب بانی کے حقوق

ادا کرنے کا اس پر وقت فراہم کرے، اور اگر بالکل پھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر

قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو چار ماہ گزرنے ہی قطعاً طلاق پڑ جائیگی اور اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ

لَهُنَّ أَنْ يَكُنَّ مِنْ مَّا خَلَقَ اللّٰهُ فِي أَسْرَاحٍ وَهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحْسَنُ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا

ان کو جین آتا ہو، آزاد ہو، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں، عین جین ختم ہونے تک (اور اس کو عزت کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دان) میں پیدا کیا ہو (خواہ صل ہو یا جین) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عذت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (جو اس کے کہ اس یقین کا مقتضایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر جب کہ ان کو طلاق رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجد نکاح) پھر نکاح لینے کا حق رکھتے ہیں اس عذت کے اندل اور اس (نکاح لینے کو رجعت کہتے ہیں) بشرطیکہ رجعت کرنے سے (اصلاح کا قصد رکھتے ہوں) (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، گو رجعت تو ہو ہی جاوے گی اور یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق (مردوں پر) جو کہ دفع و جوب میں مثل اپنی کے حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں (مردوں کے ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (داد کیا جاوے) اور راتنی بات ضرور ہے کہ مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ تبارک و تعالیٰ رحیم و رحیم ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت (۱) اگر غلبہ شہوت سے حالت جین میں صحبت ہو گئی، تو خوب تو بہ کرنا از بیان العشر آن واجب ہے اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔

(۲) پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔

(۳) لغو قسم کے رد معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ کل گئی، یا سبکی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا جو اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم کل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم کل گئی اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اس واسطے لغو کہتے ہیں آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا، اور اس کے مقابلہ میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر منسخر مایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو لغو تو کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابو حنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی المذكور میں بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو اس لئے کہیں گے کہ مواخذہ نہ رہی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ لفظ لغو لغو کو بھی شامل ہے، کہ اس میں

اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہو منعقد کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

(۴) اگر کوئی قسم کھائے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا اس کی چار صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے، پس صورت اول دوم اور سوم کو شرع میں ایلا کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر طلعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، حنبلہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے، (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی دکر تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کر دی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدل نظام کا مقتضی یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اونچ نیچ یا انحطاط انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا پر دو پیریں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے اِدھر اُدھر کر دیا جاتا ہے تو یہی

چیزیں دنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔

فترآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے اس میں ای دو لون چیسروں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ ان کے فوائد و مميزات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے، دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو "اسلام کا معاشی نظام" کہا جاسکتا ہے، اس کا بیان اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ "تقسیم دولت" بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً یہی مضمون سورۃ نسا کی آیت میں اس طرح آیا ہے:-

الزَّكَاةُ لِلرَّأْسِ الْكَافِرِ عَلَى الْمَرْءِ الْمَرْءِ
فَقَسَلُ الْمَرْءِ قَبْلَهُمْ عَلَى الْقَبْضِ وَ
يَسْتَأْذِنُ الْإِمْرَأَةَ لِيَسْتَأْذِنَ

اسلام سے پہلے معاشرہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تمام دنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت میں عورت کا درجہ کی حیثیت مگر یہ استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوبازوں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی سیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے ادبیا جس کے حوالے کر دیتے رہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا بلکہ وہ خود مگر یہ اشیاء کی طرح مالی وراثت بھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیسز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آجکل دنیا کے سب سے زیادہ تمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں اب بھی لڑکی اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، روم کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا،

بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دینے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہتا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سستی کر دیا جاتا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے مششہ میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ شرار واد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو مرن کر بدن کے گرد گئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل دانٹ سے کام لیا جاتا تھا نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جاتے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لئے ہونے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک شرار و دی گئی جیسے مرد کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نا منظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا کہ کون کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادا، حقوق پر دردمندان پر مجبور کر سکتی ہے۔

عورت کو اس کے حقوق مناسبہ نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی غلطی ہے، اسی طرح ان کو کھلے ہمارے مجبور دینا غلطی ہے، اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود مشغول بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے نہ اس کی ساخت اس کی متعل ہے اور نہ مگر یہ کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃ اس کے سپرد ہے وہ اس کا متعل ہے۔

ملاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطۃ عظیم ہے جس سے دنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ متعل ہے۔

ہر ایک حیثیت سے تفوق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمون ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے ان کو خیال پیدا ہوا تو اتم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہو گئی۔
 اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
 مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجات جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں، یہ روایت لسانی ہنسبر احمد اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواج مطہرات کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآن کریم میں جا بجا مردوں کا تو ذکر ہے عورتوں میں سے ازواج مطہرات کا بھی مستقل ذکر ہو کر مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوق اور حاکمیت اعلیٰ مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے اور دنیا کی جزائر و دسرا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ بھی مضمون اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے۔
 مِّنْ عَمَلِكُمْ صَالِحَاتٍ
 ذِكْرًا ذُنُوبَكُمْ وَأَن تَكُونَ مِنَ الْخَالِفِينَ
 خیر و طیبہ (۹۴: ۱۶)
 اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ مَخْرَجًا

ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خدا داد تفوق کی بناء پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر رہے ہیں، مگر عورتوں کے حقوق کی ہوتی چاہئے، کہ وہ عادتاً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مبالغہ نہ کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ "مَثَل" کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مشابہت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض نقطۂ مجاہدہ ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی

اور ایسی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور قصور کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان فرائض و فرائض کو یکساں فرمایا ہے، کیونکہ مفہوم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحر محیط) اس جملے کے آخر میں ایک لفظ بِالْعُرْوَةِ اور بڑھاکر آپس میں پیش آنے والے جگہوں کا خاتمہ فرمادیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو مشرقاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عروت کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو اس کا حاصل یہ ہوا کہ مرد و عورت کے حقوق اور ان کو ازیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پڑی کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا یا ضرر تو نہیں پہنچتا جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رخی بے اتھالی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر بِالْعُرْوَةِ کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا، اس کے بعد فرمایا ذَلِيلًا عَلَىٰ عَمَلِكُمْ فَمَنْ بَدَلَ عَمَلًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُم مَّا كَسَبُوا فَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعْطُوا مِثْلَ مَا كَسَبُوا
 اس کا مشہور مطلب مفہوم تو یہی ہے کہ حقوق طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے فردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخر آیت کے الفاظ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ میں اشارہ فرمایا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے ان کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے ان کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں (قرطبی)

اَلْطَّلَانِ مَرَّتَيْنِ فَاَمَّا كَلِمَاتٌ فَلَمْ يَحْصُرْ وَلَا اَوْتَسِرْ بِمَا حَسَنٌ وَلَا

حلاق جس ہے دو بار تک اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلے طرح سے اور نہ کو

يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْ تَاْخُلُوْا مِمَّا اَنْتُمْ مُّوْهِنٌ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَّخَافَا

روا نہیں کہ لیسو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاندان عورت دونوں ڈریں اس

اَلَا يُقِيْمَا حُدُودَ اللّٰهِ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُودَ اللّٰهِ

بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں مگر اللہ کا پھر اگر تم ڈرو اس بات کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں اللہ کا حکم

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا

تو کہہ گناہ نہیں دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے جو چھوٹ جاوے اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان کے متجاوز ہو

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی ظالم ہیں ظالم ، پھر اگر اس عورت کو طلاق

فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ مُحْصًى تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا

دی دینی تیسری بار تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کرے کسی غرض سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ لَمْ يَأْتِ بَيِّنَاتٌ مِمَّا حُدِّدَ اللَّهُ وَ

دوسرا خاوند تو کہہ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم اور یہ حدیں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵، طلاق رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر (دوسرے طلاق دینے کے بعد دوبار اختیار نہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے خواہ (یہ کہ رجعت نہ کرے، عذرت پوری ہونے سے) اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶، خلع

اور تہا سے یہ بات معلوم نہیں کہ (تیسریوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ یہی) اسی (مال) میں سے (کہیں نہ ہو) جو تم نے (دی ہوئی) ان کو دیا تھا اگر (ایک صورت البتہ محال ہے)

وہ (یہ کہ) کوئی میاں بیوی ایسے ہوں کہ دونوں کو خطرہ ہو کہ (دوبارہ حقوق زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ

ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے مگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس حال کے لینے دینے میں جس کو دے کر

عورت اپنی جان چھڑاتے، (بشرطیکہ ہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خداوندی ضابطے ہیں، تم انچ باہر نہ نکلیں اور جو شخص خداوندی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲۷، تین طلاقیں کے بعد حلال

پھر اگر (دو طلاقیں کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (دی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق

دینے کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ

عذت کے بعد نکاح نہ کرے، (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے) پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے اور اس کی عذت بھی گزر جائے، تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ

دوبارہ آپس میں نکاح کر کے بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خاوندی ضابطہ کو قائم رکھیں گے اور یہ خاوندی ضابطے ہیں حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمندی ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پر سورۃ قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے مسائل میں ہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں ان کو سمجھنے کیلئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت | نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہو، جیسے اور حکیمانہ نظام

بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں، دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام امت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملہ

و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماع امت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء

میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا، اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا

معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کیلئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں، اور دونوں میں کوئی فتنہ نہ ہو، لیکن اختلاف و امکان بھی نہ کر

اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کا عدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے، اس طرح کی اور بہت سی

شرائط اور آداب ہیں، جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مستحسن ہیں۔

امام عظیم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت

کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھنے، طلاق کا حاصل نکاح کے

معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت سے کر عام معاملات و عبادات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہیے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کرے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے اسلامی تعلیمات کا اہل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے ٹوٹنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات فائدوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بڑی طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو ٹوٹنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، نہ وہ جن کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سبب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقیت کی صورت میں اول انہام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت **مَنْكُم مَّنْ أَهْلَبُ وَأَهْلَبُ وَأَهْلَبُ** اور **مَنْكُم مَّنْ أَهْلَبُ وَأَهْلَبُ** کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جائے اور دونوں میں زیادہ بعد پیدا ہو جائے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعت اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادتاً فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم پہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم مشرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات

کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کر اسکے اطلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزاد اختیار تو دیا، مگر ازل تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

ابغض الحلال الى الله الطلاق
یعنی حلال چیزوں میں سے مکروہ زیادہ مبغض اور
مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے؟

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالت غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالت حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالت ہلم میں بھی جس طہر میں صحت و بہستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا **فَطَلِّقُوهُنَّ رِحْلَةَ بَعْضِكُمْ** یعنی طلاق دینا ہر تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوتی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں بہستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ محل رہ گیا ہو تو عدت وضع محل تک طے مل ہو جائیگی طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہو کہ غصہ فرد ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح ٹوٹنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و عبادات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کرے، بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے ازل تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔

چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دوسری عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کرے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس لئے

حکم یہ دید یا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دیدی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اول تو ارشاد فرمایا، اِنْ طَلَّقَکَ مَرْءٌ مِّنْہُمْ یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ چمک دکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا فَاِذَا طَلَّقَکَ فَمَا تَعْلَمُ اِنْ رَّجَعَ اِلَیْکَ اَوْ لَمْ یَرْجَعْ اِلَیْکَ فَیَا حَسْبَ عِلْمِکَ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی مدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، وَ اِنْ کَرِهَ کَرِہَ نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا وَلَا یَجِزُ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا کَفَّیْتُمْ عَنْہُمْ مِنْ شَیْءٍ یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لیتے۔ البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا وَ اِنْ طَلَّقَکَ ثَلَاثًا فَیَا حَسْبَ عِلْمِکَ یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حد دے سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے)

میں دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مرجائے) تو اس کی مدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے وَ اِنْ طَلَّقَکَ ثَلَاثًا فَیَا حَسْبَ عِلْمِکَ کا یہی مطلب ہے۔

میں طلاق اور اس کے یہاں مسترآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت احکام کی تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظ اِنْ طَلَّقَکَ مَرْءٌ مِّنْہُمْ کے بعد تیسری طلاق کو حرج ان کے ساتھ وَ اِنْ طَلَّقَکَ ثَلَاثًا فرماتے ہیں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اِنْ طَلَّقَکَ ثَلَاثًا کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی وہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے میں طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور مجبوب ہے، بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہؓ و تابعین سے عد طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے طلاق احسن کہا ہے، اور حضرات صحابہؓ نے اسی کو طلاق بہتر طریق قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین جہن پورے ہونے دیتے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دیدی جائے

مگر مؤثران کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، انطلاقاً خلافاً سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مؤثران ایک ترتیب و تراخی کی طرف متنبہ ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں بھی کہ کوئی شخص کسی کو دو دفعہ الگ الگ دفعہ دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہریں دو طلاق دی جائیں (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باقائے ائمہ و فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحق ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبغوض و مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ:-

ان خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن رجل طلق امرأته ثلاثاً تطليقات جميعاً فقام غضباً ناثماً قال اي لعجب بكتاب الله وانابين اظہر کھ حق قام رجل وقال يا رسول الله الا اقله رضائي كتاب الطلاق، ص ۹۰	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کیسا کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہاری درمیان موجود ہوں! اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول کیا میں کو قتل کر دوں!
--	--

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن تیمیہ نے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے (زاد المعاد) اور جوہر نفی میں علامہ اردوبی نے اس حدیث کی مسند کو صحیح اور ابن کثیر نے اسناد جید، ابن حبشہ نے زوائد موفقیون فرمایا ہے۔

اس بنا پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحق ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ خلاصہً یہ کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء

شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر مجبوری اس وقت دام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزارنے میں تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی ہیں، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقاء نکاح کے لئے کافی ہو گا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفا نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دے تو اس نے قطعاً نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہی رہی کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہو، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد ہر اضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیار کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس مرحلہ پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی کہ **يَتَعَزَّوْنَ مِنْ اَوْتَسْرِ لِحْمِ بَيَاْحَتَيْنِ**، اس میں بایا حَتَا ت کے لغوی معنی دو حکم بتلانے گئے، اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف اساک یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزار کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل **اَوْتَسْرِ لِحْمِ بَيَاْحَتَيْنِ** فرمایا، تشریح کے معنی کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی

مذکورہ نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔ امام حدیث ابو داؤد نے بروایت ابو رزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے الطَّلَاقِ مَرَّتَيْنِ فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ تَنْسِيْ بِمَنْ يَخْتَارُ جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے، (روح المعانی) مطلب اس کا چہرہ علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقات زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جاتا کہ عدت کے اندر رجعت ذکر کرے، اور جس طرح إِمْتِنَانٌ کے ساتھ بِتَعَرُّؤِ کی قید لگا کر یہ ہدایت شرعی کی کہ رجعت کر کے بیوی کو روکا جائے تو جس سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح تَنْسِيْ بِمَنْ يَخْتَارُ کے ساتھ یہ اختیار کی قید لگا کر یہ ہدایت دیدی کہ طلاق ایک معاملہ کا نسخہ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حسن سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فریغ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کاٹے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:

مَتَّحُوْنَ عَلَى الْوُضُوعِ قَدْ رُفُوْا
وَعَلَى الْاُصْلَاقِ قَدْ رُفُوْا - (۲۳۶:۲)

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سائے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلاوجہ اور بلا ضرورت ختم کر دینے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔ اگر کسی نے غیر متحسن یا غیر مشروع طریقہ سے اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و تین طلاق دیدی تو اس کا اثر کسب ہوگا؟ گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتل ناحق جرم و گناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا اتفاق مذاہب جرم و گناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے بھل ہی جاتا کہ اس طرح تمام معاصی اور جبرائیم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلاوجہ

اپنے سائے اختیار طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اس لئے جہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں، اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ انہما بخصب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزہر محمد سرفراز صاحب کی کتاب عمدة الاثبات بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اور پر لکھی گئی ہے اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہ نے اس شخص کو مستوجب قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعتی طلاق قرار دیکر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آئی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمر کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

فلم يرده النبي صلى الله عليه وسلم
بل امضاها كما في حديث عويس
العجلاني في اللعان حيث مضى
طلاقه الثلاث ولم يرده
وتعد يمين ابن ابي طابع مصدقاً
از عمدة الاثبات

دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:

ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً
~ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق

تَنْزُوجًا نَظْلًا فَشَلَّ السَّبِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَصَلَ
لِلْأَوَّلِ قَالَ لَاحِظِي يَذوقُ حَيْلَتَنَا
كَمَا ذَاقَهَا الْأَوَّلُ

صحیح بخاری، ص ۲۷۹، ج ۲
صحیح مسلم، ص ۲۶۳

دی اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا
تو اس دوسرے شوہر نے بھی اسے طلاق
دی نہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا
کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟
آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ دوسرا
شوہر اسے جماعتی کر کے لطف اندوز نہ ہوگا

جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی؟
انفاظ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شرح حدیث
فتح الباری عمدۃ القاری قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی مترادف دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین
طلاق دی گئیں اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو
نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہیستری اور صحبت نہ ہو جائے، تو اس کے
طلاق دینے سے شوہر اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عمر بن خطابؓ کی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:

فَلَمَّا خَرَفَا قَالَ عَوِيذُ بْنُ
عَلِيهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ اِنْ اَمْسَكْتَا
فَطَلَقْتَا ثَلَاثًا قَبْلَ اَنْ يَأْمُرَهُ
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صحیح بخاری، فتح الباری، ص ۳۰۱ ج ۱
صحیح مسلم، ص ۲۸۱ ج ۱

ہیں جب وہ دونوں لعان سے فارغ
ہو گئے تو عویذؓ نے کہا اے اللہ کے رسول ہیں
اس پر عویذؓ بولنے والا ہوں گا، اگر میں نے
اس کو اپنے پاس رکھ لیا تو عویذ رضی اللہ عنہ
نے اس کو تین طلاقیں دیدی قبل اس کے
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دے

اور ابو ذرؓ نے اس واقعہ کو بروایت حضرت ہبل بن سعد نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

فَالْفَنُّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَكَانَ مَا صَنَعَ عِنْدَ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سَنَدًا قَالَ سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ هَذَا
عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَمَضَتْ السَّنَةُ بَعْدَ فِي

تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لہ
فرادیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے سامنے جو کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا
سعدؓ فرماتے ہیں اس موقع پر میں رسول
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا
پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے

الْمُتَلَاهِيْنَ اِنْ يَفْتَرِقْ بَيْنَهُمَا
ثُمَّ لَا يَجْعَلُ بَيْنَهُمَا اَبْنًا اَوْ ابْنًا
ص ۲۰۱، طبع اھم المطابع

بارے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ ان کے درمیان
تفریق کر دی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی
جمع نہ ہوں؟

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
حضرت عویذؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابو بکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقیں
کر نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپؐ نے اس کو ایک
طلاق دینی مترادف کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں
طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ مذکورہ صدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار
اور اس پر اشکال جواب دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، اگرچہ ایک
اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعہ سے پیدا ہوتا ہے، جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث
میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ
الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَابْنِ بَكْرٍ
وَسُنَّتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَا
الْمَثَلَاثِ وَاحِدَةً فَقَالَ عُمَرُ
الْعَطْلَابُ اِنَّ النَّاسَ قَلِيٌّ فَسَجَّلُوا
فِي اَمْرِكَ اَلْهَمَ فَبَيَّهَ اَنَاةً فَلَوْ
اَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ

تبعث ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت
ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت
کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ
تین طلاقیں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمرؓ
نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں، ایک ایسا معاملہ
میں جس میں ان کے لئے ہلکتی تھی تو مناسب رہو گا
ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں، تو آپؐ نے ان پر نافذ کر دیا

(صحیح مسلم، ص ۳۴۰ ج ۱)

فاروق اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہ و تابعین کے مجمع عام میں ہوا کسی
اس پر انکار یا تردید منقول نہیں، اسی لئے حافظ حدیث امام ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا
ہے، ذوقانی شرح مؤلفہ میں یہ الفاظ ہیں:

والجہور علی وقوع الثلاث بل
یحکی ابن عبد البر والاجماع
قائلان خلافہ لا یلتفت الیہ
ذوقانی شرح مؤطا ص ۱۶۷ ج ۳

اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا:

قال الشافعی ومالك والرحمہ
واحمد وجماہیر العلماء من
السلطان والخلف یقیم الثلاث
وقال طائفة وبعض اهل الظاہ
لا یقیم بن ثلاث الا وحده۔

(شرح مسلم ص ۱۶۷ ج ۳)

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں منسرایا:

فخطب عمر بن الخطاب
جميعا وفيهم اصحاب رسول الله
صلی الله علیہ وسلم رضی الله
عنہم الذین قد علما ما تقتضی
من ذلك فی زمن رسول الله
صلی الله علیہ وسلم فلم ینکرو علیہ
منہم منکروا لحدید فعدہ دافع
(شرح معانی الآثار ص ۲۸۹)

اور جہور امت میں طلاق کے واقع ہونے
پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبد البر نے اس پر اجماع
نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شافعی
جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔

اہم شافعی، امام الکت، امام ابو حنیفہ،
امام احمد اور مسلم و طحاوی کے جماہر علماء
نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اور
طاؤس اور بعض اہل ظاہر نے کہا کہ اس سے
ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔

تیس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے
ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں
میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ
بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا
علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے
نے اسے زد نہیں کیا، اور کسی زور کرنے والے

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ امت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہؓ و تابعینؓ مسترد ہو گئی کہ تین
طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر
اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بعض
دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد
روایات حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر
خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جسد بد کی

اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا،
کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا
تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ منسرایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت، عہد صدیقی میں
تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض
ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیے ہیں، ان میں
صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے،
کہ فاروق اعظمؓ کا یہ منسردمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت
کے متعلق منسردمانا ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ بیک وقت طلاق کہے تو طلاق بیک وقت
کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے
نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے
مکر رہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے
ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی،
اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید
کے لئے یہ الفاظ مکرر ہوئے تھے تو آپ اس کے علنی بیان کی تصدیق فرمادیتے اور اس کو ایک ہی
طلاق منسردمیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ
انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ البتہ کے ساتھ طلاق دیدی تھی، یہ لفظ عرب کے عرب عام میں تین
طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری
نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کر لیا، تو آپ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف مسندوں اور مختلف الفاظ کے
ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھیں
مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ البتہ سے طلاق دیدی تھی، یہ لفظ چونکہ
عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہو

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکائش کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلفت کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، ان سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دس سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا ماحیا ٹھٹھ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
مسائل میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں“

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والبعید

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تھیں تو عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے یا

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو بھل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیارت کرو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کھانا بیسک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو کتابی حکم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ يَعْلَمُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سب کچھ

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہو کہ حضرت رکائٹ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلفت کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، ان سوال کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپؐ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و نیت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دس سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار ٹھٹھ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دور بینی کو بھی صحابہؓ نے درست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مشناس تھے، انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب لوگوں کی مخفی نیت اور صاحب معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکورہ صدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انھوں نے فرمایا:

ان الناس قد استعجلوا فی
امور کانت لهم فیہ اناة فلو
امضینا علیہم

لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے
مسئلہ میں جن میں اُن کے لئے ہلکت تھی،
تو مناسب بیگا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں

کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی سترار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرار طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت میں بھی تین ہی سترار دی جاتی تھیں ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو یا تین طلاق دینے کا سترار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تو فاروق اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف کیا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، واللہ، اس جگہ مسئلہ طلاق ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شرح حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والاعین

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَامْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تھیں تو عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی مدت کو تو رکھ لو ان کو عرفانی دستور کے یا

سَرَّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ

چھوڑ دو ان کو بھل طرح سے اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کیلئے تاکہ اُن پر زیارت کرو اور جو ایسا

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَخِذْ أَيْتِ اللَّهِ هُزُوًا

کر کچھ نہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنس

وَأَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ

اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو کتابی حکم پر کتاب اور

وَالْحِكْمَةَ يَعْلَمُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا اس کے ساتھ اور ڈرتے رہو اللہ سب کچھ

عَلَيْكُمْ ۖ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُكُنْ أَجَلُهُنَّ فَلَا تَعْصِمُوهُنَّ
أَنْ يَتَّكِنَنَّ أَرْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَٰلِكَ

جانتا ہے، اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکوان کو

اِس سے کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے یہ نصیحت

یُوَعِّظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكُمْ اَرْكَىٰ

اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اس میں تمہارا مال

لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بڑی بخراں اور بہت پاکیزگی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی وہ آیتوں میں قانون طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکورہ اصول و آیتوں میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی

نکاح دونوں کے لئے خاص برائست عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار

مائل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دے، دوسرے یہ کہ رجعت نہ

کرے، اور تعلق نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیاراتوں کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے

مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں

پاکتصرّف وین کا لفظ دونوں جگہ ملتا ہے، علحدہ لاکر اس کی طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ رجعت کے

لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی

اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، بعض وقتی غصے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے اور

عورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود شراکین میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار احوال کا خیال کر کے رائے یہ ہو جائے

کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے غصہ ناراضی

کو دل سے نکال کر خیر معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا

پیش نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر مستانہ اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیت

مذکورہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے، وَلَا تَمْسِكُوهُنَّ جُنَاحًا لِّمَا فَعَلْتُمْ وَلَا لِيَعْنَنَ لَكُمْ اُولٰٓئِكَ

نکاح میں اس لئے نہ روکو کہ ان پر ظلم کرو۔

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورۃ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے، وَأَشْهَدُونَ وَأَذْهَبَ

عَنْكُمْ وَتُنْكَحُ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ بِلِقَائِهِ (۲۱۶:۲۱۷) اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرنا، پھر اگر

گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا دروغی گواہی دو۔

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنا لو، اس

میں کوئی قاعدہ نہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس

گواہی سے کام لیا جائے۔

دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت

کا قاعدہ نہ جاری کیا جاتے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گذر جانے کے بعد بھی اپنی

غرض یا شیطانی اغواء سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا کہ رجعت کرو تو اس پر

وہ معتبر گواہ بنائو۔

معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عذمت کی ہلاکت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دونوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قلعہ تعلق ہی برقرار رکھنا، تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہو کہ دشمنی اور انتقامی ہڈی بھڑک اٹھیں، جن کا اثر دو شخصوں سے متحد ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہو، اور نظریں کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے انسداد کے لئے مختصر طور پر تو یہی ارشاد فرمایا گیا کہ **اَوْ مَن مِّنْكُمْ يَمْسُكُ وَيَتَّقُ** یعنی چھوڑنا اور قلعہ کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود مشرآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا، **وَلَا يَجْعَلُ كَعُقَدِ مَنَاقِبِكُمْ** یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہو اسامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔

اور اس کے بعد ایک آیت میں ارشاد فرمایا **وَلَا تَجْعَلُوا مَنَاقِبِكُمْ مِثْلَ مَنَاقِبِ الْفَاسِقِينَ** سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، ان پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں، فائدہ پہنچانے کی تفسیر و رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کر کے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کر دیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاقی اور محسن معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فیج معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب ضروری اور حسن سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے اگر طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہو چکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آگیا ہے تو آدھا ہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرے، یہ تو سب صحیح و واجب ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیسریں عرفاً جنگ و جدل اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا **وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ** یعنی جو شخص ان حدود و خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا انتقام بارگاہ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بدایں دنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چھکنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے

پنداشت بستمگر کہ جفا بر ما کرد

بر گردن دے بماند و بر ما بگذشت

مشرآن کریم کا اسلوب حکیم اور خاص انداز بیان ہے، کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانین تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتبہ انداز میں قانون کا بیان اس کی حکمت و مصلحت کی وضاحت اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت و نقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا کہ جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف آخرت کا حساب لایا جاتا ہے۔

نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ [دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ، **وَلَا تَجْعَلُوا آيَاتِ اللَّهِ هُكُوكًا** کھیل بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا، اور دوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے منکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائے گا نیت نہ کرنے کا عذر مسوع نہ ہو گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح راخر جہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ وابن المنذر عن عبادۃ بن الصامتؓ۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں،

ثلاث جن جن جد وھزلھن جل
النکاح والطلاق والرجعة

تین تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد و ارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا ہرگز ایک نکاح دوسرے طلاق تیسری رجعت کو ظہری

ان تینوں چیزوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ دہر و دعورت اگر بلا قصد نکاح ہنسی ہنسی میں گواہوں کے سامنے نکاح کا ایجاب و قبول کر لیں تو بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر بلا قصد ہنسی ہنسی میں صریح طور پر طلاق دیدے تو طلاق ہو جاتی ہے، یا رجعت کرے تو رجعت ہو جاتی ہے، ایسے ہی کسی غلام کو ہنسی میں آزاد کرنے کو کہہ دے تو غلام باندی آزاد ہو جاتے ہیں، ہنسی طلاق کوئی عذر نہیں مانا جاتا۔

اس حکم کے بیان کے بعد پھر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کی حق تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے خوف کا سبق دیا، ارشاد فرمایا: وَإِذَا كُنْزُ الْبُعْثَةِ لَكُمْ
وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ الْحُكْمَ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعت کو ہم پر نازل فرماتا ہے اور اس میں نصیحت کی باتیں ہیں اور اللہ
دور الیکبر و اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ تمہاری نیتوں اور ارادوں اور دلوں میں چھپے ہوئے
بھیدوں سے باخبر ہیں، اس لئے اگر بیوی کو طلاق دے کر آزاد ہی کرنا ہو تو باہمی نزاع اور ایک
دوسرے کی حق تلفی اور ظلم سے بچنے بچانے کی نیت سے کرو، غصہ کے انتقام یا بیوی کو ذلیل
دسا کرنے یا تکلیف پہنچانے کی نیت سے نہ کرو۔

طلاق میں اصل یہی ہرگز مرتبہ عیسر مسئلہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ شریعت
اور بھی طلاق دی جائے وسنت کی نظر میں اصل یہی ہے کہ کوئی آدمی اگر طلاق دینے پر مجبور
ہی ہو جائے تو صاف و صریح لفظوں میں ایک طلاق بھی دیدے، تاکہ عدت تک رجعت کا
حق باقی رہے، ایسے الفاظ نہ بولے جن سے فوری طور پر تعلق زوجیت منقطع ہو جائے جس کو طلاق
باتن کہتے ہیں، اور نہ تین طلاق تک پہنچے جس کے بعد آپس میں نکاح جدید بھی حرام ہو جائے،
یہ اشارہ لفظاً لَكُمْ کو مطلق بلا قید کے ذکر کرنے سے حاصل ہوا، کیونکہ جو حکم اس
آیت میں بتلایا ہے وہ اگرچہ صرف طلاق رجعی ایک دو تک کے لئے ہے، طلاق باتن یا کین
طلاق کا یہ حکم نہیں، مگر قرآن کریم نے کوئی قید اس کی ذکر نہ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ
اصل طلاق مشروع رجعی طلاق ہی ہے، دوسری صورتیں کراہت یا ناپسندیدگی سے خالی نہیں
مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے دوسری آیت میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا
سے بلا جبر شرعی روکنا حرام ہے، جو عام طور پر مطلقہ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے،

کہ ان کو دوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے شخص کے نکاح
میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے، اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے
اولیاء بھی اس کو دوسری شادی کرنے سے روکتے ہیں، اور ان میں بعض اس طبع میں روکتے ہیں
کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم لینے لے حاصل کر لیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پہلے اپنے سابق
شوہر سے نکاح پر راضی ہو جاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء و استرباء کو طلاق دینے کی وجہ سے
ایک قسم کی عداوت اس سے ہو جاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے
باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں، آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلا عذر شرعی روکنا
خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا انسداد
اس آیت میں مندرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت
معتل بن یسار نے اپنی بہن کی مشاوری ایک شخص کے ساتھ کر دی تھی، اس نے طلاق
دیدیں اور عدت بھی گذر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا، اور چاہا کہ دوبارہ نکاح
کر لیں، اس کی بیوی یعنی معتل بن یسار کی بہن بھی اس پر آمادہ ہو گئی، لیکن جب اس
شخص نے معتل سے اس کا ذکر کیا تو ان کو طلاق دینے پر غصہ تھا، انھوں نے کہا کہ میں نے
تمہارا اعزاز کیا، اپنی بہن تمہارے نکاح میں دیدی تھی، کی قید کی کہ اس کو طلاق دیدی اب پھر تمہارے پاس آئے ہو
کہ دوبارہ نکاح کروں، خدا کی قسم اب وہ تمہارے نکاح سے روکے گی۔

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبد اللہ کی چچا زاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات
پر آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں معتل اور جابر کے اس رویہ کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔
صحابہ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے عاشق تھے، آیت کریمہ
کے سنتے ہی معتل بن یسار کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور خود جاکر اس شخص سے بہن کا دوبارہ
نکاح کر دیا، اور قسم کا کفارہ ادا کیا، اسی طرح جابر بن عبد اللہ نے بھی تعمیل فرمائی۔

اس آیت کے خطاب میں وہ شوہر بھی داخل ہیں جنہوں نے طلاق دی ہے، اور لڑکی
کے اولیاء بھی، دونوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فَلَا تَعْصُوا لَكُمْ مِنْ أَنْ يَخْتَارَ لَكُمْ إِذَا تَوَاصَوْا
بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، یعنی مت روکو مطلقہ عورتوں کو اس بات سے کہ وہ اپنے تجویز کئے ہوئے
شوہروں سے نکاح کریں، خواہ پہلے ہی شوہر ہوں جنہوں نے طلاق دی تھی، یا دوسرے لوگ
مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی گئی إِذَا تَوَاصَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ، یعنی جب دونوں
مرد و عورت شرعی قاعدہ کے مطابق رضا مند ہو جائیں، تو نکاح سے نہ روکو، جس میں اشارہ

ہو، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی اداساری دنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرز بیان حاکمانہ سے زیادہ مرتبہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحق سزا نہ بنے، دنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کر انھوں نے ایک قانون بنادیا، اور مشالہ کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتنا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوب قرآن اور اس کے مخصوص انداز بیان سے ایک دُور رس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سے بچنے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بنا پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اس فکر کی بنا پر اس کا ظاہر و باطن خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ذرہ ذرہ سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ شرآئی تعلیم نے جو اصول معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتا تھا۔

شرآئی نظام حکومت کا یہی ہستیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے، فرد دوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعہ انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور انہیں جسرم و سزائے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالنے تو معلوم ہو گا کہ نئے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوتی محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا بسکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلا دیں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری

أَنْ يُمْلِمَ الرِّضَاعَةَ عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِشْقُهُنَّ وَكِتَابَتُهُنَّ

کرے دودھ کی مدت اور لڑکے والے یمن باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا

بِالْمَعْرُوفِ لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارُّ وَالِدٌ مَوْلًى

رواقی دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جائے اور اس کے بچے کی

وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ يَكْلِفُ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَ الْفَصْلُ

وجہ سے اور نہ اس کو جس کا وہ بچہ ہے یمن باپ کو اس کے بچے کی وجہ اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے پھر اگر باپ چاہیں کہ دودھ

عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَادَ ثَمَرَانِ

پھر الیمن و دوبرس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورے سے تو ای پر کچھ منہا نہیں اور اگر تم دوگ چاہو کہ دودھ

تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اتَّيَمُّ

پلاؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ منہا نہیں جب کہ حوالے کرو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

موانع دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۲ رضاعت | اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلا یا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی

کی تکمیل کرنا چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے لئے یہ ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا

جائے اگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو یہ نہیں ہو پھانا چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے اور کسی کے بچے تکلیف دینی

چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو (مثلاً طریق مذکور کے) بچے کی پرورش کا انتظام، اس کے (محرم قرابت

دار کے) دفتر، جو (شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے پھر (یہ کچھ لوگ) اگر دونوں (ماں اور باپ) دو سال تک (یا)

دودھ پھڑانا چاہیں، یہی رضا مندی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے

ہوئے بھی کسی معلوت ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں پتہ کو ضرور ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور ماں کا دودھ پلانا چاہو

تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کرو جو کچھ ان کو دینا ملے یا ہے، قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلے اور

بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے

ذکر کئے گئے ہیں کہ عمر باطلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے معتدل احکام بیان فرمادیے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہرہ و مشورہ اس کا ایک ایسا نظام بتا دیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔

مثلاً آیہ کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا، وَالْوَالِدَيْنِ إِذَا زَاغَا اُن کے والدین اگر گمراہ ہو جائیں تو کہیں کہیں وَالْأُولَآءِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اُن کے اولاد کے لئے اللہ کے راستے میں وَالْوَالِدَيْنِ إِذَا زَاغَا اُن کے والدین اگر گمراہ ہو جائیں تو کہیں کہیں وَالْأُولَآءِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اُن کے اولاد کے لئے اللہ کے راستے میں وَالْوَالِدَيْنِ إِذَا زَاغَا اُن کے والدین اگر گمراہ ہو جائیں تو کہیں کہیں وَالْأُولَآءِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اُن کے اولاد کے لئے اللہ کے راستے میں

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے :-

دودھ پلانا ماں کے اولیٰ کے کہ دودھ پلانا دینا ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی صند یا ناراضی کے ذمہ واجب ہے سبب دودھ نہ پلانے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جب تک کہ اس کے اپنی نکاح میں بڑا ہو کہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدتِ رضاءت | دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدتِ رضاءت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اگر تین مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلادیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا باتفاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں ارشاد ہے: **وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ يَرْزُقُهُنَّ وَيَكْفِيَهُنَّ**
يَا مَعْزُورِينَ لَا تَكْفُلْنَ أَنْفُسَكُمْ إِلَّا ذُرِّيَّتَهُنَّ، یعنی باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا
 قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اوّل کے لئے تو فسرّ آن نے لفظ وَالَّذِينَ کے استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالَّذِينَ چھوڑ کر الْمُؤْمِنِينَ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے، وَالَّذِينَ عَنِ النَّبِيِّ مگر یہاں والد کی جگہ مؤمنین کے اختیار کر لئے ہیں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے فسرّ آن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طریق بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مرتبہ اور مستغنیٰ

上

طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے، جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچہ کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں و باپ کی مشترک ملکیت ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بچائے والدین کے حقوق کا اظہار اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کروا کر اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے ملتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہو تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو درود پلا ناماں کے ذمہ
اور ماں کا نان و نفقہ و ضرورت
باپ کے ذمہ ہیں

یہ مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ درود پلانا
ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان نفقہ اور ضرورت یا سب زندگی باپ
کے ذمہ ہے اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے
کساح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ
درجیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو درود پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم
ہے گا (منہجری)

دو چنانچہ شوہر کی حیثیت
چوتھا مسئلہ اس پر توافق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مالدار ہوں تو نفقہ طرہ از
واجب ہوگا اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ
غریب و دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں اس میں فقہار کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے
اصناف کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ
نیشیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کرخی کے نزدیک اعتبار
شوہر کے حال کا ہوگا، فتح القدیر میں بہت فقہار کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم (فتح القدیر ص ۲۲۲)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا لَا تُضَارُّوْا اِلَیْہِ ؕ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ حَلٰلٍ وَّ طَهْرًا ۚ اِنَّ ذٰلِکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ لَمُبَشِّرٌ
 آپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں عنداضدی نہ
 رہیں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا
 بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں
 بعد دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلوئے گا
 لہذا کو دودھ پلانے پر مجبور
 رنے یا نہ کرنے کی تفصیل

تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ ذیل آیت میں ہے۔

عورت جب تک نکاح میں ہے چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچہ کی ماں دودھ پلانے کی اجرت تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے، اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا مان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچاتا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ اپنے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی اتنا کا دودھ پلاوے۔

قیم بچے کے دودھ پلانے آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے، **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ** یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مر جائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہو وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ قیم بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ پھرانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گزارہ ہے، مثلاً اگر قیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں، اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک ہتائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو ہتائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیم پوتہ کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہو، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں اور قیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حقدار بنانا اصول میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث **لَا ذَنْبَ عَلَى ذَكَرٍ** کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت ہے تو قیم پوتہ کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصہ سے قائم بھی ہو سکتی ہے اسی طرح قیم پوتہ کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام اس کے بعد آیت متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَإِنْ أَرَادَ الْفَصْلُ أَنْ يُفَصَّلَ فَفَصْلُهُ مِثْلُ مَا كَانَ** یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑادیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں، آپس کے مشورے اور رضامندی کی مشروط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپس کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو سختہ مشن نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت آخر میں ارشاد فرمایا گیا **وَإِنْ أَرَادَتْ أَنْ تَرْضِعَ وَلَدًا فَتَرْضِعُهُ مِثْلُ مَا كَانَ** **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَا تَسْأَلُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَبِالْإِحْسَانِ** اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی اتنا کا دودھ پلاؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی ہوا اجرت معسرہ کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں، اور اس کو معسرہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ نہیں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی اتنا سے پلاوے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی جائے، اس میں مال مثول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد آیت میں ارشاد ہوتا ہے **وَأَقْبُوا اللَّهَ مَا عَمِلْتُمْ** کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے **وَأَقْبُوا اللَّهَ مَا عَمِلْتُمْ** **أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہا ہے، اور وہ تمہارے دلوں کے غمی ارادوں اور نیٹوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ حق سزا ہوگا۔

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنَاسِكَ دِينًا وَرَوْنًا **أَشْرَافًا جَائِلِينَ بِأَنْفُسِهِمْ** اور جو لوگ مجاہدین ختم میں سے اور چھوڑ جا دیں اپنی عورتیں تو جانے کہ وہ عورتیں انتظام کیسے آجکی

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ وَلَا جُنَاحَ

عَلَيْكُمْ فِي مَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ

ثُمَّ بَدَأْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ مِنْهُ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تَأْتِيَنَّ مِنْهُنَّ إِلَّا أَنْ

تَقُولُوا أَقُولَ مَعْرُوفًا وَلَا تَعْنُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ

الْكِتَابُ أَجَلَها ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۲، شوہر کی وفات کے بعد اگر عورت چار مہینے اور دس دن پہر جب اپنی عدت کی ميعاد

تعم کر لیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا، ایسی بات کہ وہ عورتیں اپنی ذات

کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدہ شرع

کے کریں اور تم باوجود روک رکھنے کے نہ روکو تو تم بھی مشرک گناہ ہو گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھتے ہیں،

حکم نمبر ۱۳، عدت میں اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدت وفات میں ہیں) پیغام

نکاح کا پیغام دینا (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہہ دو مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک

عورت سے نکاح کی ضرورت ہے، یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو جب

بھی گناہ نہیں اور وہ اس اجازت کی یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا

(ضرور) ذکر ذکر کر رہے (سو خبر ذکر ذکر کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ

داد و گفتگو مست کر دے کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں، اور وہ بات

قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشارۃً کہو، اور تم تعلیق نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مست کرو،

یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہو جائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اطلاع ہے تمہارے

دلوں کی بات کی سوائے تعالیٰ سے ڈرتے رہ کر و اور ناجائز امر کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو، اور (یہ بھی)

یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارف مسائل

عدت کے (۱) جس کا خاوند مر جائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمہ اور تیل

بل ضرورت دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور صریح گفتگو سے نکاح

ثانی بھی درست نہیں، جیسا اہل آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست

نہیں، ترجمہ میں نکاح کے ساتھ جو وغیرہ کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے

اس عورت کا جس پر طلاق یا تن واقع ہوئی، یعنی جس کی رجعت درست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر

سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست ہے۔

(۲) اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ انیس

کے ہوں، چاند کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے

تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، پس کل ایک سو تیس دن پورے

کریں گے، اس سلسلے سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت

گزر کر وہی وقت آئے گا، عدت ختم ہو جاوے گی، اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ

کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلاف شرع کرے

تو اور دن پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرط قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے

ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ مشرفاً صحیح اور جائز ہو، تمام

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 کچھ نہ ہو کہ اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ نہ لگا یا ہو اور نہ معشر سمجھا ہو کہ
 فَرِيضَتُهُنَّ وَتَعَوُّهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدْ رُكِبَ وَعَلَى الْمَقْتِرِ قَدْ رُكِبَ مَا
 لئے کچھ ہوا اور ان کو کچھ خرچہ دو مقدور دالے پر اس کے موافق ہو اور تنگی دالے پر اس کے موافق جو خرچہ
 بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۳۷﴾ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ
 قاعدہ کے موافق ہو لازم ہر تنگی کر لے والوں پر اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ نہ لگانے سے پہلے اور
 أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا
 ٹھہرا ہے تم ان کے لئے ہر قول لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم معشر کر چکے تھے مگر یہ کہ درگزر
 أَنْ تَعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بَيْنَهُ عُقْدَةٌ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ
 کری عفو میں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہو کہ نکاح کی بین خاوند اور تم مرد درگزر کر دو قریب
 لِلتَّقْوَى وَلَا تَلْسُوا الْفُضْلَ بَيْنَكُمْ إِنْ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۸﴾
 ہے ہر گارہی اور نہ بھلا اور احسان کرنا آپس میں بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳، طلاق قبل الدخول کی صورت | طلاق قبل الدخول کے سنی یہ ہیں کہ زوجین میں ایک جان اور خلوت
 میں ہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان | صحیح سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، اس کی دو صورتیں ہیں، یا
 تو اس نکاح کے وقت ہر معشر کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدار ہر متعین کر دی گئی، پہلی
 صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 میں تم پر دہرا کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دید کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگا یا
 ہے اور نہ ان کے لئے کچھ ہر معشر کیا ہے، (سو اس صورت میں ہر اپنے ذمہ مت سمجھا اور دھڑکا
 ان کو ایک) فائدہ پہنچاؤ صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگ دست
 کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے
 خوش معاملہ لوگوں پر یعنی سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس

سے ایک جوڑا پڑوں کا دینا ہے۔
 اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے، وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ دَالِي قَوْلِهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ
 بصیر ہے اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ
 ہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا ہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہو
 (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو یہ کہ وہ عورتیں
 اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری
 صورت) یہ ہے کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہو
 یعنی خاوند پورا ہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی ہر اور اگر نہ ہوگا
 اور دالے (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا بہ نسبت وصول کرنے کے تقویٰ سے زیادہ قریب
 ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے)
 اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے عظمت مت کر دو، بلکہ ہر شخص دوسرے کے
 ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے
 ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کر دے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو
 دیں گے) (بیان القرآن)

معارف و مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْسُوهُنَّ
 لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ ہر معشر
 نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ ہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت
 یہ ہے کہ ہر بھی معشر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آدے، اس میں جو ہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا،
 یہ حکم شرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ ہر معین نہ کیا،
 اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں ہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں
 رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے
 کہ ہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی
 کہ ایک جوڑا پٹریے کا دیدے، دراصل شرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی
 البتہ یہ بتلادیا کہ مالدار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترجیح ہے کہ صاحبیت

اس میں تنگی سے کام نہ لے، حضرت حسنؑ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا علیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانسو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ پر ہر کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے (قرطبی)

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا ہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوت مجھ کے طلاق دیدی ہو تو مقرر کئے ہوئے ہر کا نصف مرد کے لئے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو اختیار ہی اس کا ہے، جیسا کہ آیت **إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنَّ أَوْ يُعْفُوا إِلَيْهِ** کا حوالہ ہے۔

(۱) مرد کے پورا ہر دینے کو بھی معاف کئے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عوب کی یہ تھی کہ ہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دیدی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہو گیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی مشا ہی کرتا ہے، اور معاف کر لے کر افضل اور اقرب للفقوی قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعین نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصد شریعت اور موجب ثواب عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

(۲) **الَّذِي يَتَّبِعُ** کا حوالہ ہے نکاح کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی **دَلِيٌّ عَقْدُ النِّكَاحِ الزَّوْجُ**، یعنی عقد نکاح کا مالک شوہر ہے، یہ حدیث دار قطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جبہ عن قول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی (قرطبی) اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق دہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۝۳۹

خبردار رہو سب نمازوں سے اور پنج والی نماز سے اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمْسَلْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا

بہرا اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھو یا سوار پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح

عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝۴۰

کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳ نمازوں کی حفاظت کا بیان | اس سے آگے جیسے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان منسباً اشارہ اس طرف ہے کہ مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے علاوہ اور مصامتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہو، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اطلاق سے درجہ الہی سے دردی ہوتی ہے، جس کے لازم میں سے حق و عہد دونوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ دَالِي قَوْلِهِ مَا كُنْتُمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝۳۹

کر سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہو اگر اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی نہ ہو) یاد ہو اور گور کو رع و سجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو، پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جانا کر) تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی اولائے نماز) اس طریق سے کر دو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

معارف مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ پنج والی نماز مرد اور عورت کے لیے اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں، مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور "عاجزی" کی تفسیر حدیث میں سکوت کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، پہلے کلام کرنا درست تھا۔ اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہو، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن)

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے لئے

مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے مگر سے پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۱﴾

کریں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالْمُعْرُوذَاتُ ۚ فَكَذَلِكَ

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے فائدہ کے موافق لازم ہو پر ہر گاروں پر اسی طرح

يُمَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۳۲﴾

بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم تاکہ تم سمجھ لو۔

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۵، بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویوں کو (ان کے

ذمہ لازم ہے کہ وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے واسطے ایک سال تک (نان و نفقہ

اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جاویں ہاں اگر چاہیں

دس دن کے بعد رخصت حل کے بعد عدت گزار کر خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں،

اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے باپے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ

زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کر دو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہارا

مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالْمُعْرُوذَاتُ ۚ فَكَذَلِكَ

دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں معسر ہی) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا

ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ معسر ہو یا عجب کے

درجہ میں ہو یا استہاب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام

بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف مسائل

(۱) وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ

وفات زدوں کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار مہینے دس دن

مقرر ہوئے جیسا کہ اقبل ہی آیت یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا بَلَغَتِ الْمَرْءُ أَشْهُرَ وَعَشْرًا سے معلوم ہو چکا ہے

مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا،

اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں معسر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار بعض مردے کی

وصیت پر تھا جیسا کہ آیت کُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْصَيْتُمْ (۱۸۰) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اسلئے

یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہو تو سال بھر تک

اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی کے ترکہ سے اس ذات میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جاوے

اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور غا دندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں،

اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے

وارثوں کو تو گھر سے نکالنا جائز تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا

حق درخ کو چھوڑ دے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی

مراد ہے قاعدہ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا عورت

کے لئے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل

ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سو اپنے حصہ میں رہے، اور اپنے حصہ

سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

(۲) وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ وَالْمُعْرُوذَاتُ ۚ فَكَذَلِكَ

پہلی آیت میں بھی آپکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا، جن کو صحبت خلوت

سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جلتے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ

تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے

سوائے جس کا مہر معسر رکھا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر معسر

نہ اور قاعدہ سے مراد یہ تفصیل ہو جاتے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت

کیا جائے گا، اور خدا کو واجب کے معنی میں نہیں ملے اور علی الزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ بعض تاکید کے لئے

ہوگا مگر درجہ استہاب ہی ہیں (بیان العساکر)

نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے ہر مثل واجب ہو، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر اقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

الْمُتَرَاتِي الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا نہ دیکھا کہ ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے

فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى

پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ کر دیا بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے

النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۳۳﴾ وَقَالُوا إِنِّي مَسْبُورُونَ

لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور لڑاؤ اللہ کی راہ میں

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جان لو کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

دائے مخاطب، کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سوائے اللہ

ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر ان کو جلا دیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا افضل کرنے والے ہیں لوگوں کے حال اب مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور اس واقعہ پر غور کر کے اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سنتے والے اور خوب جانتے والے ہیں رجباؤ کرنے اور نہ کرنیوالوں کی باتیں سنتے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے

معارف و مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں ان میں ایک عجیب لمخ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الہی کے

تاریخ ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں اور بزدلی سے جان بچانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں، تفسیر ابن کثیر میں سلب صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہو کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت دیوار طاعون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت فرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، اس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن و دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنادیا، ان کی لاشیں حسب دستور گل مٹھیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حسرت بن قیل بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلادیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ان لوگوں کو بھر زندہ فرما دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور انھیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب کریں۔

ایہا العظام البالیۃ ان اللہ

یا مریک ان تجتبعی

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا میں قتل

ہے شہر بستی ہے مگر دنیا کے ہر ذرہ ذرہ کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب

عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، مگر ان کریم نے آیت اَعْطِیْ سُلَیْمٰنَ شَيْعَ خُلُقًا

شُعْذٰی (۵۰:۱۲) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو

اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی، مولانا رومیؒ نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان

کو یہ آواز دو۔

ایہا العظام ان اللہ یا مریک

تین لے ہڈی اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہو

ان تکلتی لحيماً وعصباً وجلداً | اپنا گوشت ہیں لا اور پٹھے اور کھال درست کر دو
یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہڑھانچہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک نکل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ
اب ارواح کو یہ خطاب کیا جائے۔

ایہما الاصلان ان الله یا مریک | یعنی اے ارواح تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے
ان ترجع کل روح الی الجسد | کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں جن کی تعمیر
الذی کانت تعمرو | رجعت ان سے وابستہ تھی۔

یہ آواز دیتے ہیں ان کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے، اور حیرت سے چار طرف
دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا مِثْمَثًا ذَلِکَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنتَ۔

یہ واقعہ عالم دنیا کے ظالموں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر محبت
قائمہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا غمراہی ہے
جو یا کسی ربا و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جبکہ
یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہو گا اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور ایک سیکنڈ
مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی
وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو مفسران کے الفاظ سے دیکھئے، بیان واقعہ کے لئے قرآن نے مندرمایا
أَنفَرْنَا إِلَى الْبِیِّنَاتِ خَرَجُوا مِنْ دِیَارِهِمْ، یعنی کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو
اپنے گھروں سے بخوفِ موت نکل کھڑے ہوئے تھے؟

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں
برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضورؐ سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں أَلَمْ نَقْرَأْ فَرَمَانِیْ کا کیا
مقابلہ ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ
أَلَمْ نَقْرَأْ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے
کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رویت سے رویت قلبی مراد ہوتی ہے جس کے معنی
میں علم و ادراک یعنی أَلَمْ نَقْرَأْ ایسے مواقع میں أَلَمْ نَعْلَمْ کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ أَلَمْ
قرآن سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و مشہور ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ یہ واقعہ
ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، أَلَمْ نَقْرَأْ کے بعد حسرتِ اِلٰی
پر حالے سے اذرتے زبان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَمَّ أَكْثَرُ

اس کے بعد مفسران میں ان کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا وَهَمَّ أَكْثَرُ

یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی
زبان کے قاعدہ سے یہ لفظ صحیح کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم
ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مَوْتُوا، یعنی کہہ دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے کہ مری جاؤ
اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور بلا واسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں
ارشاد ہے، اِذَا أَمَرْنَا لَکُمْ شَيْئًا أَن تَمُوتُوا فَتَمُوتُوا۔ (۸۲:۲۶)

اس کے بعد فرمایا ہے إِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے
والے ہیں لوگوں پر، اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کر کے
فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ امت محمدیہ کو بخلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنا یا۔

آخر میں خلقتِ شعائر انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا وَفَکَیْنِ أَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُونَ
یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے
ادوار اکثر انسان شکر گزار نہیں ہوتے۔

مسائل متعلقہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوئے۔

۱۔ **مہمہ اللہ** | اول یہ کہ تقدیر الہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، اور جہاد سے یا
طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور نہ ان میں قاسم رہنا
موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے نہ اس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

۲۔ **مہمہ اللہ** | دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبا یا مرض طاعون وغیرہ
پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں پھیل چکا ہو اس سے بھاگ کر کہیں
ان جہادوں کا اثر ہے | کے ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا
بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:

ان هذا القسم عذب به الامم
قبلکم فاذا اصابکم به فی الارض
فلا تدخلوها واذ وقع بارض
وانتم ہا فلا تخرجوا فراساً
(بخاری، مسلم، ابی نعیم)

یعنی اس بیماری طاعون کبیر اللہ تعالیٰ نے
تم سے پہلے قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے
سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ
وبا یا مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر
کسی جہتی میں وہ مرض پھیل جائے اور تم وہاں
ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ بھاگو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملک شام کے قصد سے سفر کیا، سرحد شام پر تبوک کے قریب ایک مقام میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملک شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون عموماً اس کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عموماً نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بیت سے صحابہؓ و تابعینؓ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروق اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ میں ملک شام میں اس وقت جانا چاہئے یا رہا ہونا مناسب ہے، اس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ذكر الوجد فقال رجز عن اسب
عن م ب به الام ثم بقى منه
بقية فيذهب الموت ويأتي
الاخرى فمن سمع به بارض
فلا يقدر من عليه ومن كان
بارض وقع بها فلا يخرج فرا
منه، رواه البخاري عن انس
من زيد واخرجه الاثمة بمثله۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (طاعون)
مکمل کی کہ درو کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ ایک فدا
ہو جس سے بعض امتوں کو عذاب دیا گیا تھا
پھر اس کا کچھ بقیہ رہ گیا اب اس کا یہ حال ہو
کہ کبھی چلا جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے، تو جو
شخص یہ سنے کہ فلاں خطہ زمین میں یہ عذاب
آ جا ہوا تو اس کو چاہئے کہ اس خطہ زمین میں
نہ جائے، اور جو شخص اس خطہ میں پہنچے موجود
ہو تو طاعون بھاگنے کے لئے وہاں نہ نکلے (بخاری)

حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقاء کو واپسی کا حکم دیدیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملک شام کے عامل و امیر مقرر ہوئے، اس مجلس میں موجود تھے، فاروق اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرمائے گئے، افراسامہ بن قنر اللہ، یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں! فاروق اعظمؓ نے جواب میں فرمایا، ابو عبیدہؓ کا ش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:

فعم نفر من قدر الله الى
قدر الله

بیشک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر
کی طرف بھاگتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دورانہ طاعون لڑنا نہیں | رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی کی بھشتیں میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو اس جگہ سے بخوبی موت بھاگنا ممنوع ہے۔

اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کسی یہ گمان ہو گا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دوسروں کو بھی یہی خیال ہو گا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوتی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلطی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ معتد در بھرا بیس چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مصراً ہلاکت کا سبب بنتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے لئے ہر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تقدیر الہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔ اسی طرح اسی بستی کے رہنے والوں کو بخوبی موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعیف، مرد و عورت کا بھی عادی ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، ان کا حشر کیا ہو گا، ازل تو وہ تنہا رہ کر ہیست ہی سے مرنے لگیں گے، پھر ان میں جو بیمار ہیں ان کی خبر گیری کون کرے گا، مر جائیں گے تو دُشمن کف کا انتظام کیسے ہو گا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اڑ کر کچھ ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے۔

سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گذرے گی، ابن المدینی نے ملایہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

ما فرأى أحد من الصبيان فسلم
(قروطنی) | یعنی جو شخص وہاں سے بھاتا ہے وہ بھی سلم
نہیں رہتا۔

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وہابی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و قوت کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے ممبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:

روى البخارى عن يحيى بن يعمر
عن عائشة أنها أخبرته أنها
سألت رسول الله صلى الله عليه
وسلم عن الطاعون فأنشدها
النبي صلى الله عليه وسلم أن
كان عن أبي بختة الله على من
يشاء فجعل الله رحمة
للمؤمنين فليس من عبد
يقم الطاعون فيسكت في بلد
صابراً يعلم أنه لن يصيبه إلا
ما كتب الله له إلا كان له مثل
أجر شهيد وهذا نصير لقوله
صلى الله عليه وسلم الطاعون
شهادة والمطعون شهيد

(قروطنی ص ۲۳۵ ج ۲)

میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔

بعض خاص صورتوں کا استثناء | حدیث کے الفاظ میں فلا تخروا وافرار امناہ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو

کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی، یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے ٹھن آہ ہو اکی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وہاں پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔

تیسرا مسئلہ اس آیت سے یہ استفادہ ہوا کہ بخوف موت چہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔

جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں چہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:

الَّذِينَ قَالُوا لَا تَحْرِبُوهُمْ
فَقَدْ قَالُوا أَطَاعُوا مَا قُتِلُوا
أَلَمْ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْمَوْتَى
إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۱۵

یعنی کچھ لوگ خود بھی چہاد میں شرکت ہوئے اور چہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانے والوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہمارے ہاتھ تو قتل نہ ہوتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ اگر موت کے ہمارے ہاتھ نہ ہوتے تو ان لوگوں کی کیا فکر کرتے جو تم خود اپنی فکر کو اور اپنے آپ کو موت سے بھاگ رہے ہیں چہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں مگر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔

ممانعت قدرت سے ہے کہ صحابہ کرام کے سب بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری چہاد ہی میں گذری ہے، وہ کسی چہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے مگر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان جنگوں اور چہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آگام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں چہاد و قتال

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

(قرطبی)

مطلات کس قدر اہل اللہ صراط کے لئے تیار ہیں

(یعنی جنت میں)

(۳) قرطبی میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرطبی سے کچھ زیادہ ادا کر دیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان خياركم احسنكم قضاء

”تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق و قرض کو اچھے طریقے سے ادا کرے“

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی تو وہ حرام ہے اور سزا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ مِثْقَاتٍ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ إِذْ قَالُوا لِمُوسَى

کیا دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے

لَهُمْ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا يُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ

مقرر کرد ہوا ہے کہ ایک بادشاہ تاکہ ہم لوہیں اللہ کی راہ میں بیٹھنے کے لئے تو قہر ہو کر

عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ أَلا تَقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ

اگر ہم ہولناکی کا تو ہم اس وقت نہ لڑو وہ بولے ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم

قَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا کہ لڑنا تو وہ سب پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ

مگر تھوڑے سے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو ظالموں کو اور فرمایا ان سے کہ ان کے نبی نے

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ

یہ کہ اللہ نے معترف فرمایا تھا ہے طالت کو بادشاہ کہنے لگے کیونکر ہو سکتی ہو اس کو حکومت

عَلَيْنَا وَهَذَا أَخٌ بَالِ الْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۝

ہم پر اور ہم زیادہ ستم ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کثایت مال میں

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَشَرَّاهُ بِسَطَةِ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

بیٹھنے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں

وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ وَقَالَ لَهُمْ

اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جسکو چاہے اور اللہ بے حد وسیع و عظیم ہے اور کہا بنی اسرائیل

نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ

ہے ان کے نبی نے حکایت کی سلطنت کی نشانی یہ کہ آؤ تمہارا پاس ایک صندوق کہ جس میں نسل خاطر ہے

مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ

سماجہ رب کی طرف سے اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی، موسیٰ اور ہارون کی اولاد اور

الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

انجلیکے کہ اس صندوق کو فرشتے، بیشک اس میں پوری نشانی ہے تمہارا واسطے اگر تم یقین رکھتے ہو،

فَلَمَّا أَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ

پھر جب اہل طالت لوہیں نے کہا ہے شک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا

سوں نے ان پر اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر

مَنْ أَغْرَقَ غُرْفَةً يَدِي ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۝

جو نہ بہرے ایک ہلو اپنے ہاتھ سے، بہرنا یا سب سے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا حَارَدْنَاهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ

پھر جب اہل طالت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج

بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلْكُوا اللَّهَ كَرُمٌ

جالت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی کہنے لگے وہ تو جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ٹانہ ہے، بار

مِنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئْتَهُ كَثِيرَةٌ يَّا ذِينَ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

تھوڑی جماعت غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا مَبْرَأًا وَكُنْتَ

اور جب سامنے ہوئے جالت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارا ڈال دے ہمارے سر پر مبراؤ

أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۱﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ

دیکھ ہمارے پاؤں اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر ۔ پھر شکست دی ہر منوں جاوت کے فکر کو اللہ کے

وَقَتْلَ دَاوُدَ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مَا

اور مار ڈالا داؤد نے جاوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا

يَسَاءُ ذُوْلًا دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيُفْسِدَ الْأَرْضَ

اور اگر نہ ہوتا دفع کر دینا اللہ کا ایک کو دوسرے کو خواب ہو جاتا ملک ۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۲﴾

لیکن اللہ بہت ہر ان سے جہان کے لوگوں پر ۔

خلاصہ تفسیر

رَبِّ آیات مقصود اس مقام میں زیادہ ترغیب قتال کی ہے، اور پر کا قصہ اسی کی تحدید ہے، اتفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طاوت و جالوت کا قصہ اسی کی تائید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرایا، جس کا ذکر قبل کی آیت ذالہ یَقْبِضُ وَيَبْسُطُ میں آیا ہے، اگر فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے خست یار میں ہے۔

طاوت اور جالوت کا قصہ (اسے مخاطب) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا، (جس سے پہلے

ان پر کا فر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دہائے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم اس کے ساتھ ہو کر اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کوئی سبب ہو گا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ ہم ان کافروں کے ہاتھوں اپنی بستیوں اور اپنے نر ندروں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دہائی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے، (جیسا کہ آگے چہاد کی غرض سے بادشاہ کے معتمد رہنے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیل بیان آتا ہے) اور

اللہ تعالیٰ ظالموں کو دین خلافت محکم کرنے والوں کو، خوب جانتے ہیں، (سب کو مناسب ہوا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طاوت کو بادشاہ معتمد

(رایا، کہنے لگے ان کو ہم پر مکرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم مکرانی کے زیادہ

مستحق ہیں، اور ان کو کہہ الی وسعت بھی نہیں دی گئی، کیونکہ طاوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے

دعوت میں (فرمایا کہ اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی

مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و مکرانی) اور جہاد میں اس کو

ریاضت (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جہاد

میں باہر امن ہے) کرمات و مخالفت کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ

(اللہ الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے)

اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال و دنیا کیا مشکل ہے، جس کے اعتبار سے تم کو شہر ہو

اور) ماننے والے ہیں (کہ کون یاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے

یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری جہت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کر لیں تو

اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ)

بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لئے ہوئے) آجائے

میں میں سکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی تورات اور تورات کا منجانب

اللہ ہو لکھا ہے) اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام

ہم لائے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے آویں گے

اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لائے

والے ہو، پھر جب (بنی اسرائیل نے طاوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور جالوت کے مقابلے کے

لئے نکلیں ہو گئے) اور (طاوت فوجوں کو لے کر اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عیالہ کی

طرف) چلے گئے انہوں نے اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے ساتھیوں سے

ہمراہ کر کے (اللہ تعالیٰ) استقلال و بے استقلالی میں تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے

(جو راہ میں آئے گی اور تم شدت تشنگی کے وقت اُس پر گزرو گے) سو جو شخص اس سے (افراط

کے ساتھ) پانی پئے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور پانی

نہ پئے) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی نصرت

ہے، طمأنینہ پھر اسے میں آئی، پیاس کی تھی شدت) سو سب لے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع

کر دیا، پھر صوفیوں نے ان میں سے رعایا کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہو گا، کسی نے

چلو سے زیادہ نہ پایا ہوگا) سوجب طاہر اور جو زمینیں ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے، اور اپنے بچ کو دیکھا تو بھڑے سے آدمی رہ گئے، اس وقت بعض آدمی آپس میں کہنے لگے کہ آج تو بہارِ بچ اتنا کم ہے کہ اس حالت سے ہم میں جاہل اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سنکر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رو برو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ کثرت سے ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں، اصل چیز استقلال ہے اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے ہیں، اور جب دیارِ عالم میں پہنچے اور جاؤ اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آگئے تو دربار میں حق تعالیٰ سے کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غلبہ) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کی وقت) ہمارے قدم ہمارے رکھتے، اور ہم کو اس کا فرقہ پر غالب کیجئے، پھر طاہر والوں نے جاہل والوں کو خدا تعالیٰ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طاہر کے لشکر میں تھے اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جاہل کو قتل کر ڈالا (اور منظر و منصور واپس آئے) اور اس کے بعد، ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطا فرمائی اور بھی جو منظور ہوا انکو تعلیم فرمایا (جیسے غیر آلات کے زرہ بنانا اور جانوروں کی بولی سمجھنا) آگے اس واقعہ کی مصلحت مآثر فرماتے ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں) وقتاً فوقتاً دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمام) فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں چنانچہ والوں پر اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں۔

معارف و مسائل

۱۔ اِذْ قَالُوا لَنَبِيِّنَا اَنْتُمْ اَبْعَثْتُمْ تِلْكَ الْاَنْبِيَاءَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا، کفارِ عالمہ ان پر مسلط کر دیئے گئے، اس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، اور جن نبی کا یہاں ذکر ہے ان کا نام شموئیل مشہور ہے۔

۲۔ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الدَّابُّوْنَ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کی بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جاہل بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی

لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے ہیں وہاں اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلیوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلیوں کو ہانک کر طاہر کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طاہر کی ادا شہت پر یقین لائے، اور طاہر نے جاہل پر فوج کشی کر دی اور موسمِ نہایت گرم تھا۔

۳۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بَشَعًا، اس امتحان کی حکمت اور توجہ احقر کے ذوق میں معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جانے والے کم ہوتے ہیں، اور اس وقت ایسوں کا اکثر جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا ملین کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان معسر رکھا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفاکشی کی ہوتی ہے، سوشدیت پیاس کے وقت بے وقت والی ملنے پر مضطرب کرنا دلیل ہستہ قتال کی اور اندھے بازوؤں کی طرح جاگر نادلیل بے استقلال کی ہر آگے لڑنے، مادہ ہو کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور اذکار رفتہ ہو گئے، ہزاروں المعانی میں بسند ابن ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے۔

۱۔ اہل ایمان جو امتحان میں پورے اترے، اور کامل جو امتحان میں پورے اترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور کامل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ تَتْلُوْهُ اَعْلٰیكَ بِالْحَقِّ وَاَنْتَ لَمِنْ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اے ایسے اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سناتے ہیں غیب کی حکمت اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے۔

خلاصہ تفسیر

۱۔ کہ سورۃ کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جن جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جب کہ آپؐ نے نہ کسی سے پڑھا نہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک مجزہ ہے جو آپؐ کی نبوت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپؐ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں:

نبوت مستند پر یہ آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا، اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم استدلال

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ

یہ سب رسولانِ فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے کوئی تو وہ ہے

مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآخِثًا بَيْنَ مَرْيَمَ

کو کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے اور دئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیچ

الْبَيْتِ وَآيِدُنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَفْتَلْنَا

کو معجزے مرتبہ اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبریل اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مَنْ بَعْدَ مَا جَاءَ ثَمَّ الْبَيْتِ وَلَكِنْ اِخْتَلَفُوا فِيهِمْ

جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف ہم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا،

مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَفْتَلُوا لَكِنْ

پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے ، لیکن

اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَرِيدُ ﴿۵۶﴾

اللہ کرتا ہے جو چاہے ۔

خلاصہ تفسیر

بعض انبیاء اور امتوں کے کچھ احوال یہ حضراتِ مرسلین (جن کا ذکر ابھی آگیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً) بعضے

ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت

عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) سے فرمائی رہبر وقت یہود سے انکی مخالفت

کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد

اس کے کہ ان کے پاس (دلائل) پیغمبروں کی معرفت پہنچ چکے تھے (جن کا متفقہ اتفاق ہو چکا ہے) قبول پر متفق رہنا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں اس لئے ان میں اتنا

نہیں نہیں پیدا کیا، وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں فوجت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

(۱) تِلْكَ الرُّسُلُ اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مگر تسلی دینا ہوا کیونکہ جب آپ کی رسالت دلیل سے ثابت تھی جسکو اُنْكَارُ الْكَافِرِ میں بھی فرمایا ہوا اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپ کے رنج و افسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سننا ہی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان مام کسی کی امت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں مگر ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحتاً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَفْضَلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ اللَّهُ يَزِيدُ مَا يَشَاءُ

لا تفضلو بین انبیاء اللہ لا تختارونی علی موسیٰ۔

لا اقول ان احدا افضل من یونس بن مثنیٰ

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟

جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر

فضیلت دواں نہ کرنا، کسی نبی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت معلوم ہو گئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

وہ آپ کا یہ ارشاد کہ لا اقول ان احد افضل من یونس بن مثنیٰ اور لا تخیرونی علی موسیٰ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلا دی گئی اور صحابہ کرام سے آپ نے اس کا اہلار بھی فرمایا (منظہری)

(۲) وَمَنْ يَخْلُقْ مِنْ كَلِمَةِ اللَّهِ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلائی گو بلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورہ شوریٰ کی آیت مَا كَانُوا يَنْشُرُونَ لَكُمْ كَلِمَةَ اللَّهِ الْكَافِرُونَ جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ ہمد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ لَا

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے

تَبْعُ فِيهِ وَلَا تَخْلَعُوا وَلَا تَسْفَعُوا وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۷﴾

کس میں نہ خرید و فروخت ہو اور نہ کشائی اور نہ سفارش اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

خلاصہ تفسیر

الغنی فی سبیل اللہ اے ایمان والو خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس میں کوئی چیز اعمال خیرہ کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی نہ کہ کوئی چیز دے کر اعمال خیرہ کی خرید کرے اور نہ دے کر (دوسری ہوگی نہ کہ کوئی تم کو اپنے اعمال خیرہ دے) اور نہ بلا اذن الہی کسی کی کوئی سفارش ہوگی جس سے اعمال خیرہ کی تم کو حاجت نہ رہے، اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں نہ کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعات بدعتہ و البتہ کو ترک اور معصیت الہیہ و بدعتہ کو اختیار کرتے ہیں تم تو ایسے نہ بنو۔

معارف و مسائل

اس سورہ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کثیر بیان فرمائے ہیں جن میں سب کی تفہیل لغز کرنا اگر اور بھاری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خسران

کرنا ہوتا ہے، اور احکام الہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق ہیں یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی ہوسلت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور اتفاق کو بیان نہرنا مناسب ہوا، وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ النَّارِ کہیں کہیں اللہ الخ میں اول کا بیان تھا اور تَنْزِيلُ الْكِتَابِ الخ میں دوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طاہرہ سے اول کی تاکید ہوئی قراب أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ الخ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ اتفاق مال پر بہت سے امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی اتفاق مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل پکے ہیں نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے بچھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ مَا

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا بھالنے والا نہیں پکڑ سکتی اس کو ادھم اور نہ نیند

لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا

اس کا ہی جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر ان

بِأَذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ

اجازت سے جانتا ہے جو کچھ خلقت کے درپردہ اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ سب احاطہ نہیں

مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَهوَ

کر بکھے کسی چیز کا اس کی معلوم نہیں ہے مگر جتنا کہ وہی چاہے گنجائش ہو اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۸﴾

اور گراں نہیں اس کو بھالنا ان کا اور وہی ہے سب سے بزرگ و عظیم والا

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو ادھم دیا سکتی ہے اور نہ نیند (دیا سکتی ہے)

اسی کے ملک میں سب کچھ (بھی آسمانوں میں موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرے کہ بدوں اس کی اجازت کے وہ چاہتا ہے ان تمام موجودات کے تمام حاضر و غائب حالات کو اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر علم دینا وہی چاہے اس کی کرسی راستی بڑی ہے کہ اس نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں آسمان و زمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف و مسائل

آیت الکرسی کے | یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات خاص فضائل | مذکور ہیں مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات الفضل شرا پایا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا آیت الکرسی، (ابن کثیر عن احمد بن محمد) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدۃ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے بچل جاتا ہے۔

انسانی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے ہجر موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، شکم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کا ذکر کا مالک ہونا کہ ساری عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے والی رکھنے اور ان کا نظام حکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم

محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھل یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ**، اس میں لفظ **اللَّهُ** اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابل عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے **الْعَلِيُّ الْغُيُومُ** لفظ **الْعَلِيُّ** کے معنی عربی زبان میں ہیں زندہ، اس لئے کہ یہی ہے یہ لفظ لاکر یہ بتلاتا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ **غُيُومُ** قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، قائم کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں، قیوم اور تمام مبالغہ کے صیغے کہلاتے ہیں، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے، قیوم حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کہی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے اس بارہ صفات میں حتی و قیوم کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم علم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار یا علی یا قیوم یا حتی یا قیوم کہہ رہے ہیں۔

تیسرا جملہ **لَا تَأْخُذُكَ شَيْءٌ** **لَا تَذُوْمُ** ہے، لفظ **تَذُوْمُ** میں کے زبر کے ساتھ، اوگمہ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور **تَذُوْمُ** مکمل نیند کو، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اوگمہ اور نیند سے بے غری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ قیوم نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ ساری آسمانوں زمینوں اور ان میں ساری والی تمام کائنات کو تحائف اور سنبھالتے ہوئے ہیں اور ساری کائنات اسی کے ہوائے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک استا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر تنبیہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا نہ سمجھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کا طے کرنے کے لئے یہ ساری کلام نہ کہ مشکل ہیں، نہ اس کے لئے بھکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور محاکات کعب اور اوگمہ اور نیند سے بالاتر ہے۔

جو تھا جملہ ہے لَمْ تَلَفِ الْكُمُوتِ وَمَلِكِ الْآسَمِ حِی، اس کے شروع میں لفظ لَمْ کالام ملکہ کے معنی کے لئے آگیا ہے، جس کے معنی یہ ہوتے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ کی ملک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرمائے۔

پانچواں جملہ ہُوَ مَنْ ذَا الَّذِي يَنْفَعُ عِنْدَهُ الْأَمْرُ بِذِيهِ، یعنی ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے، اس میں چند مسائل بیان فرادیئے ہیں۔

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون و چسپاں کی مجال نہیں، ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کسی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرمادیا کہ بارگاہِ عزت و جلال میں کسی کو مجالِ دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دیدی گئی، غرض بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش و شفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری امتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقام محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے يَنْفَعُهُمْ مَتَابِعُ اَيُّهَا يَوْمُومٌ وَمَتَابِعُهُمْ لَيْسَ اللّٰهُ تَعَالٰی اُن لوگوں کے آگے بچے کے نام حال اور احوال سے واقف و باخبر ہے، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ وَلَا يَكْفِيكَوْنُ يَوْمَ عِلْيَةٍ إِلَّا بِمَا شَاءَ ہے، یعنی انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہو سکتا ہے، اس میں بتلادیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہو سکتی۔

آٹھواں جملہ ہے وَسِعَتْ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حِی، یعنی اس کی کرسی اتنی بڑی ہے

جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمیت ہوتے ہیں، اللہ جل شانہ نشست و برخاست اور خیز و مکان سے بالاتر ہیں، اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بڑھا بیڑے ہیں ابن کثیر نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے، آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتری جیسا ڈال دیا جائے۔

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتری کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے وَلَا يَكْفِيكَوْنُ يَوْمَ عِلْيَةٍ لَيْسَ اللّٰهُ تَعَالٰی كَوْنِ دُوْنُوْنَ عِلْمِ مَخْلُوْقَاتِ اَسْمٰوِ وَ اَرْضِ حِی کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادر مطلق کی قدرت کا ملکہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہُوَ الَّذِي اَلْعَظِيْمُ لَيْسَ اللّٰهُ تَعَالٰی اُن لوگوں کے آگے بچے کے نام حال اور احوال سے واقف و باخبر ہے، آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

لَا اَكْرَاهُ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ

اور دینی نہیں دین کے معاملہ میں بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جو کوئی نہ مانے گمراہ

بِالطَّاعُوْتِ وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ

کرنے والوں کو اور یقین لادے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا

لَقَدْ اٰتٰنَا اللّٰهُ تَسْمِيْعًا عَلِيْمًا

نہیں اور اللہ سب کچھ سننا جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

دین اسلام کے قبول کرنے میں زبردستی کافی نفع کوئی موقع نہیں دیکھو۔
ہدایت یقیناً عمر اسی سے ممتاز ہو چکی ہے یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے
واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے،
اور جب اسلام کی غرض یقیناً ثابت ہے، تو جو شخص شیطان سے با اعتماد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ
خوش اعتماد یعنی اسلام قبول کرے، تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تمام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں
سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں اقوال ظاہری کے، اور خوب جاننے والے ہیں احوال باطنی کے،

معارف مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کا
ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تمام کر گرنے سے مامون رہتا ہے
اور جس طرح ایسی رسی کے ٹوٹ کر گرنے کا خطو نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی
طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسار نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات
ہے (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ
دین میں زبردستی نہیں ہو، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔

اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام
میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی
زمیندار میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے،
بلکہ دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو نا پسند ہے، جس کے دپے کافر بہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں:-

وَيَبْعُونَ فِي الْأَسْوَاقِ قِسَادًا لِلَّهِ
لَا يُجِبُّ الْمُغْضِبِينَ (۱۴:۵)

تو لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ
تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم
دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بزرگوں اور پاچہ وغیرہ کے قتل کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے
رکھا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے
جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول
کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور امن و امان قائم
رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس
کہا: اَنَا عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ إِلَيَّ قَرِيبٌ "میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت
میں اپنا مذہب کیوں چھوڑ دوں؟" حضرت عمرؓ نے پرسش کر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت
تلاوت فرمائی: لَا أَكْرَاهُ فِي الدِّينِ مَيْنَ دِينٍ میں زبردستی نہیں ہے۔

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری
اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا
ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان
کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد و قتال آیت "لَا أَكْرَاهُ
فِي الدِّينِ مَيْنَ دِينٍ" کے معارض نہیں ہیں۔ (منظہری، مستطین)

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکالنے ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف اور جو لوگ

كَفَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ

کافر ہوئے اُن کے رفیق ہیں شیطان نکالتے ہیں اُن کو روشنی سے اندھیروں کی طرف

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۵﴾

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ قَوْلِهِ خَلِدُوا فِيهِ اللَّهُ تَعَالَىٰ سَاقِي هِيَ ان لوگوں

کا جوا ایمان لائے، ان کو دیکھو تاریکیوں سے نکال کر یا بجا کر نور (اسلام) کی طرف
لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے ساتھی شیاطین ہیں (انسی یا جنتی) وہ ان کو نور (اسلام) سے
نکال کر یا بجا کر کفر کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر
نہایت کر رہیں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا
بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی غلط ہے۔

معارف مسائل

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے چھڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت اس وحی کہ دی تھی ایش

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ

لے اسکو سلطنت جب کہا ابراہیم نے میرا رب یہی جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا میں ہی چلاتا ہوں اور مارتا ہوں

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالنَّمِيسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا

کہا ابراہیم نے بیشک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو

مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

مغرب سے تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا

الظَّالِمِينَ ﴿۵﴾

بے انصافیوں کو۔

خلاصہ تفسیر

راے محتاط، کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی غزوہ کا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں دینے تو یہ تو یہ خدا کے وجود ہی کا مستکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہے تو یہ تھا کہ نعمت سلطنت پر احسان ماننا اور ایمان لانا، اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ بات اس وقت شروع ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے جواب دیا) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ چلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے) وہ کوڑے معزز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں، کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں (میں بھی چلاتا اور مارتا ہوں) چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے اور جس کو چاہوں قتل سے معاف کر دوں یہ چلاتا ہے (ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بالکل ہی بعدی عقل کا ہے کہ اس کو چلاتا اور مارتا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے، اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو، اور قرآن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھ گاہ نہیں، اس لئے اس ضرورت سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق

سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر اور کچھ جواب نہیں آیا اس کا معترضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی مگر اس پر جارہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف و مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجاہد کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے (قرطبی)

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے، دفع اس شبہ کا یہ ہو کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص مغرب ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ اس شخص کو دیکھ کر مجھ سے مغرب ہو کر ان کی راہ پر ہوں، اور اسی جہت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا (بیان القرآن)

أَوَكَلَّيْنِي مَرْغَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر، اور وہ گر پڑا تھا اپنی جھنڈوں پر بولا کیوں کر زندہ کرے گا

هَٰذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِنَا ۚ قَامَتَهُ اللَّهُ مِائَةً عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ

اس کو اللہ مر گئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے تئو برس پورا ٹھایا اس کو کہا تو کہنی

كَمْ كُنْتُ ۖ قَالَ كُنْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَّيْسَ بِمِائَةٍ

دیر یہاں رہا، بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا تئو برس

عَامٍ ۖ فَالْظُّرُّ إِلَىٰ لَعَامٍ ۖ وَشَرَّ إِلَيْكَ لَمْ يَتَسَنَّ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ جَمَازِكَ

اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا، ستر نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گرد سے کو

وَلْيَجْعَلَ آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کی واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم انکو کس طرح اُٹھا کر جوڑ دیں

تَكْسُوْهَا الْحَمَاءُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

بہر آن پر پہناتے ہیں گشت، پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہو کہ بیشک

فَدِيْرٌ ۝

اللہ ہر چیز پر قادر

خلاصہ تفسیر

اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْبَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عَيْنِ النَّاسِ اَنَّهُ اللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ
یہ نام کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی
حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، (یعنی پہلے چھتیں گریں
پھر ان پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی مڑا
گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو
یعنی اس کے مردوں کو) اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو
یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے چلانے کا جو خیال غالب ہوا
تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہو گئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام
کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے
ہو گا، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں، تاکہ ایک نظر کے واقف ہو جائے
سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو)
تو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت
اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (تاکہ یہ
مدت قلیل سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر
اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا)
نہیں سڑی گئی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے
(سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر کہ گل سڑ کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عقرب اس کو
تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو
(اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ
ہونے پر استدلال کر سکیں) اور اب اس گدھے کی، ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح

ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض
یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے (پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہوئی
تو بے ہمتی و جوش میں آکر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ
ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوْمِرْ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اسے پروردگار میرے دکھلاؤ مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مرے، فرمایا یا تو یہ یقین کر

قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنُّ قَلْبِيْ قَالَ فُخِّدْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا کیوں نہیں لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاؤ میرے دل کو فرمایا تو چار پرندوں کو (چار جانور اڑنے والے)

فَصَرَ هُنَّ اِلَيْكَ لَمَّا جَعَلَ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْهُنَّ

پھر ان کو بلانے اپنے ساتھ، پھر رکھنے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا

يٰۤاٰتِيْنٰكَ سَعِيًا وَّاَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ ۝

چلے آؤں گے تیرے پاس دڑتے ہوئے اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر

اور اس وقت کے واقعہ کو یاد کر جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ
اے میرے پروردگار مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے
زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی مختلف صورتیں اور کیفیتیں
ہو سکتی ہیں وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ
آدمی کو اس کا شبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان
یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کر کے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام
سے اس سوال کے جواب میں (اول) ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے، انھوں نے
(جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لانا، لیکن اس عرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے
قلب کو (معتین صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمالاً
سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو،

زناکر ان کی خوب شناخت ہر جادوے (پھر) سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پر دو سمیت ان کا قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کروا دینی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے، ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو اور پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس زندہ ہو کر (دوڑ دوڑ کر چلے آویں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں، (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ کی درخواست یہ ہمیشہ اقصیٰ ہے جو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ حیات بعد الموت کا مشاہدہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مژدوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرت کا ملکہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر جادو ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرت کا ملکہ کے مظاہر ہر لحظہ ہر آن مشاہد میں آتے رہتے ہیں، اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرا ذرہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہو گا؟ یہ ذہنی انتشار سکون قلب اور اطمینان میں غلغلہ نامزد ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاء موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کر قلب کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمائی کہ ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و غمضات کے ازالہ کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کر لیں، پھر ان کو پاس رکھ کر بلا لیں کہ وہ ایسے بل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ ہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پر وں سمیت ان کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمہ کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر ان کو بلا لیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر روح المعانی میں بسند ابن المنذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی پر سے خون سے خون، گوشت سے گوشت، ہڈی سے ہڈی، اصل ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم قیامت کے روز اس طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کر کے ایک دم سے ان میں جان ڈالوں گا، قرآن کے الفاظ میں یَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ تَعَالَىٰ، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اڑ کر آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے، اس وقت میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دکھلایا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کرا دیا۔

حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کی یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعید میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزاء انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں روح ڈال دینا سطحی نظروں سے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابل قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کرے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے وہ خود چیلن کے تحت لطف گوشتوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت بدست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گھائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انھوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کہیں کس خطہ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کا جزو بنتی ہیں وہ کس کس گوشتہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ

اور نظامِ محکم نے ایک انسان کے بدن میں جم فرمادیے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی تن بدن کی تحقیق (ریس سرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے جو کوئی مشرق کا ہے کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا کوئی شمالی حصہ کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظامِ محکم نے اس کے بدن میں جم فرمادیے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، کو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا حج فرما دینا اس کی قدرت کا ملکہ کے لئے کیا دشوار ہے، جس نے پہل مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرما دیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں،
جوابات اول یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پرست تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک و شبہ کی بناء پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کا ملکہ سے یہ کیسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کبھی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہوا جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام الطینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور الطینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور الطینان سکون قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کا مل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشاد ربانی **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** یعنی کیا آپ کو یقین نہیں؟ فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟
 جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

ابنی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا **اَوْ لَمْ تُؤْمِنُ** تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں بتلی فرما کر افزاء پر رازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیم سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر الطینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و الطینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے الطینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجہ الطینان حاصل ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو الطینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ الطینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ الطینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام الطینان ہے جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی فوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ الطینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ الطینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس الطینان میں حضرت خلیل اللہ در سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرماتے ہیں وہ سب اعلیٰ معیار الطینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرنا الطینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ بین اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، اور حکمت والے ہیں، زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمایا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ مقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں، مگر پھر ایمان بالنبی کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہو کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگھیں

سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ

سات بائیس ہر مال میں تتر تتر دانتے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے

يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝۱۶۱ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي

چاہے اور اللہ بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مِمَّا آتَوْا مِمَّا وَلَا آذَى لَهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر خرچ کر کے پیچھے نہ اُٹھتے ہیں اور نہ سستاتے ہیں اُن کے لئے ہے

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۶۲

ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمیں ہوں گے،

قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذَى وَاللَّهُ

جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہوشیاری اور اللہ بے پروا

غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝۱۶۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ

ہو نہایت غنیمت والا، اے ایمان والو! مت غفلت نہ کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر

وَالَّذِي كَانِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ

اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرے اپنے مال لوگوں کے دکھانے کو اور یقین نہیں رکھتا کہ اللہ

الْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثَرَابٌ فَأَصَابَهُ

پراور قیامت کے دن ہر سوا اس کی مثال ایسی ہو جیسے صاف پتھر کے اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسات آئی

وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ

زور کا میٹھ کر چھوڑا اس کو بالکل صاف کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب میں چیز کا جو انھوں نے کایا اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝۱۶۴ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

نہیں دکھاتا، سیدھی راہ کا فرد کو، اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ كَبُرَتْ

کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے ایسی ہو ایک باغ پر بلند زمین پر

أَصَابَهَا وَابِلٌ فَانْتَأَتْ أَكْطَا ضَعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِيبْهَا وَابِلٌ فَطَلُّ

اس پر پڑا زور کا میٹھ کر لایا وہ باغ اپنا پھل دو چند اور اگر نہ پڑا اس پر میٹھ تو پھواری کاں ہے،

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۶۵ أَيُّودُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے، کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ

مِنْ تَخِيلٍ وَأَعْيَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ

کھجور کا اور انگور کا بہتی ہوں نیچے اس کے بہری اس کو اس باغ میں اور بھی سب

الشَّجَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضَعُفَاءٌ مِنْ أَصَابِهِ

طرح کا میٹھ ہو حاصل اور آگیا اس پر بڑھاپا اور اس کی اولاد میں ضعیف تب آپڑا اس باغ پر

إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

ایک جگہ لاجس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اٹھا، یوں سمجھنا ہے تم کو اللہ آیتیں

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۱۶۶

تاکہ تم غور کرو۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی امور خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت رحمت اللہ، ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں ہمیں (اور) ہر بالی کے اندر ستودا لے ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ السنو فی غذا تعالیٰ جسکو چاہتا ہے (بعد اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ سب کو یہ السنو فی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی (جاننے والے) بھی (ہیں) اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں ان لوگوں کو ان کے عمل کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (جا کر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ندامت کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا اور اگر سائل بدتمیزی سے قصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا اور جہاں بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد آزار پہنچا یا جائے اور اللہ تعالیٰ بخود غنی ہیں کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے پھر آزار کس بنا پر پہنچا یا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ (بھی) ہیں، اے ایمان والو ہم احسان جتلاتے ہیں یا اذہار پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کر دو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر مراد اس سے (تقریباً) نبی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھوس جم آ یا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو جیسا تھا ویسا ہی (بالکل صاف کر دے) اسی طرح اس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل جس میں امید ثواب ہو معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے لفاظ نے اس شخص کو ویسا ہی کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں (ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی) کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو قیامت کے

روز ثواب کے مگر میں جنت کا) راستہ نہ بتلاں گے کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچانے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تاکہ دوسرے اعمال صالحہ سہولت سے پیدا ہو کر ان پس ان لوگوں کے نفعات و صدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی نیلے پر ہو کہ اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ (باغ) لطیف ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دنیا (چوگنا) پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا میٹھ نہ پڑے تو ہلکے پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور مرقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں) بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک باغ ہو کہ جو ریزوں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور اس (باغ) کے درختوں کے) نیچے ہنریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جنہیں رکمانے کی قوت نہیں اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس وجہ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر اس سے) وہ باغ جل جلے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی امید ہو جو کہ وقت ہو گا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدار قبول ہو گا اپنی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہو گا کہ ہمارے احسان جتلاتے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطال طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سو جا کر (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف و مسائل

یہ سورۃ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورۃ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۸۳ تک آیت ۲۳۱ ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دنیا آج ان پر پوری طرح مامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے، جس میں آج کی دنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا رد عمل اشتراکیت اور اشتالیست کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے، ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دوسرے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔ ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلق احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سود کی کاروبار کی حرمت و مانعت اور قرض ادا کر کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اوپر بھی گئی ہیں ان میں اول اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا۔ اس کے بعد ایسی شراائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ و خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بن جائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہو جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک ان نفقات و صدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں و دوسرے ان نفقات و صدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ انفاق بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ اطعام، کہیں بہ لفظ صدقہ اور کہیں بہ لفظ ایثار الزکوۃ، ان الفاظ تشریحاتی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ و خیرات اور رضائے الہی حاصل کرنے

کے لئے ہر قسم کے خرچ پر جاری ہے، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفل اور مستحب، اور زکوۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ایثار الزکوۃ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرت اشارہ ہو کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ انفاق سے اور کہیں لفظ صدقہ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہو کہ یہاں عام صدقات و میراث کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں وہ ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی چ میں کرنا ایک مثال یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیز و دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گہوں کا عمدہ زمین میں بولے، اس دانہ سے گہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک لے کر سات سو تک پہنچتا ہو، ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گئے تک پہنچ سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے جو النہ مسند احمد بیان کی ہے۔

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب ست سو روپے کے خرچ کے برابر ملتا ہے۔

قبولیت صدقات کی لیکن تشریح کی ہے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے مثبت شراائط کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کا شیشہ کا ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہو جب کہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کا شیشہ بھی کاشت کاری کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہو گئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمال صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو

کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال لاکے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔
دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیست اور صالح ہو، بدعتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانہ کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جاتے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نااہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی عین شرطیں بھی، کہ مال حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کر لے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب بیکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مستحسن طریقہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا، ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہو، اور نہ گزشتہ پر کوئی بوجھ و غم۔

قبولیت صدقہ کی منفی شرائط | اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عللاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا پہنچے۔

تیسری آیت **قَوْلُ الْمُغْتَرِفِ** میں بھی صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں ساتل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب غرض پیش کر دینا، اور اگر ساتل بدتمیزی سے غصہ دلا دے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے، ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و حلیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاقِ الہیہ کے تابع ہو کر غفور و درگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برادر نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کا لعدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں، اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھائے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوسے پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے، اس سے قبولیت صدقہ و خیرات کی یہ مشروط معلوم ہوئی، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلانے یا نام و نمود کی نیت سے نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مومن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہو کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ **لَا يَذُوقُ ثَمَرَهَا** کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہو کہ ریاء کاری، اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور دنیا آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریاء کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی ہوتی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، کافر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں، جن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاق مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں بخلی پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو و چنداں اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ٹیلے پھوٹا بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاص نیت اور رعایت شرائط مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تمہارا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجب خیراتِ آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک بارغ ہو کہ جو راہ ان گورڈوں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے بارغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس بارغ پر ایک گولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ بارغ جل جائے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا بارغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر بارغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ بارغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو بارغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو بارغ کے جل جانے یا کٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیوں شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک بارغ لگایا، اور وہ بارغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو بارغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے بارغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کالے اور دوبارہ بارغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام کرے، اور اگر اس حالت میں اس کا بارغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور ذل کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہو گا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلا نا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بنیران کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہو گا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبِكُمْ رِوَمَا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کرو مستحکم چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ رِوَمَا لَا تَيْسَمُوا الْخَيْثُ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصداً کہہ دئی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائط مذکورہ کی خلاف ورزی کر لے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہو کہ اس کا ایک بارغ ہو کہ جو راہ ان گورڈوں کا اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے بارغ میں ہر قسم کے میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پا آگیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس بارغ پر ایک گولہ آدے جس میں آگ ہو، پھر وہ بارغ جل جائے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمھارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلاف شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدیں بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھا پا آگیا، اس کے اولاد بھی بڑا اور اولاد بھی چھوٹے سچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا بارغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ امید ہو سکتی ہے کہ پھر بارغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ بارغ لگانے کی امید بھی نہ ہو تو بارغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو بارغ کے جل جانے یا کٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے، غرض یہ تینوں قیدیوں شدت جستیاچ کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں، کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک بارغ لگایا، اور وہ بارغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھا پا اور کمزوری کا زمانہ بھی آگیا، اور یہ شخص صاحب عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگا یا ہو بارغ جل جائے تو صدمہ شدید ہو گا، اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے رباہ کاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے بارغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کالے اور دوبارہ بارغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ پھل کمانی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام کرے، اور اگر اس حالت میں اس کا بارغ اور مال متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور ذل کی انتہاء نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو رباہ خورد کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا ہے گا جب کہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرط اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے الفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی کچھ شرائط معلوم ہوں گی:

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلا نا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بنیران کی رضا مندی کے بندیا کم کر کے صدقہ و خیرات کرنا کوئی امر ثواب نہیں، حاجت مند داروں کو محروم کر کے سائے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتظام کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رُود سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا حق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہو جو شریعت کی رُود سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ كَسْبِكُمْ رِوَمَا أَخْرَجْنَا

اے ایمان والو خرچ کرو مستحکم چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو

لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ رِوَمَا لَا تَبْسُوَا الْخَيْثُ مِنْهُ تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ

ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے اور قصد کرو مندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم

يَا خِزْيَةُ إِلَّا أَنْ تُغِيضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿١٢٨﴾

اس کو کسی نہ لوگے مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے غریبوں والا ،

الْكَافِرُ يُعَذِّبُكُمْ بِالْفَقْرِ وَيَا مَرْكُومًا بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ كُفْرَكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے بیحیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو

مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٩﴾ يُوْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ

اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ بہت کثافت والا ہے سب کچھ جانتا ہے، عنایت کرتا ہے کچھ جس کو

يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ

چاہے اور جس کو سمجھ مل ہے اس کو بڑی عین مل اور نصیحت دی قبول کرتے ہیں

إِلَّا أُولَ الْأَلْبَابِ ﴿١٣٠﴾ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ

جو عقل والے ہیں ، اور جو خرچ کر دے تم خیرات یا قبول کر دے کوئی منت تو

تَذَرُّوْنَ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿١٣٢﴾ إِنْ تَبَدَّلَا

بیشک اللہ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ، اگر ظاہر کر کے دو

الْقَدَّاسِ فَنِعْمَ هِيَ وَإِنْ تُخَفُّوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفَقْرَاءَ فَهِيَ

خیرات تو کیا اچھی بات ہے ، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ

خَيْرٌ لَّكُمْ وَيَكْفِرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بہتر ہے تمہارے حق میں اور در کرے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ تمہارے کاموں سے

خَيْرٌ ﴿١٣٣﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا هُمٌّ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُهْدِي مَنْ يَشَاءُ

خوب خیر داتا ہرگز نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لادے جس کو چاہے ،

وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تُسْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ

اور جو کچھ خرچ کر دے تم مال سوا اپنے ہی واسطے جب تک کہ خرچ کر دے اللہ ہی کی رضا جوئی

اللَّهُ وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ لِيُؤْتِيَ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تظْلَمُونَ ﴿١٣٤﴾

میں اور جو خرچ کر دے خیرات سوہری لے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ،

لِنَفَقَةٍ أَمْ لَا يَنْتَبِهُنَّ أَنْ هُنَّ لِيَوْمَ تَأْتِي سُنُبُهُنَّ لَا يُغْنِي عَنْهُنَّ صِرَابُهُنَّ

خیرات کی فقیروں کیلئے ہے جوڑے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے

فِي الْأَرْضِ مَنْ يَحْتَسِبُ لَهُمُ الْجَاهِلُ أَوْ غَنِيَاءُ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ

تک میں سمجھیں ان کو تا وقت مالدار اُن کے سوال نہ کرنے سے تو پہچانتا ہے ان کو

بِسِيمَتِهِمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُسْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

اُن کے چہرے سے ، نہیں سوال کرتے لوگوں سے پٹ کر ، اور جو کچھ خرچ کر دے گا ان کی چیز وہ

اللَّهُ بِهِ عَلِيمٌ ﴿١٣٥﴾ الَّذِينَ يُسْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْأَيْدِي وَالنَّهَارِ

بیشک اللہ کو معلوم ہے ، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو

سِرًّا أَوْ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا تَخَوْفُ عَلَيْهِمْ

چھپا کر اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہر ان کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈرہی اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣٦﴾

اور نہ وہ غمیں ہوں گے ۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! نزدیک کام میں خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو)

اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے کام میں لانے کے لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز

کی طرف ہست مت لے جایا کر دے اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ (دوسری ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارا

حق واجب کے عین یا سوغات میں دینے لگے تو تم کہیں اس کے لینے والے نہیں ، ہاں مگر چشم پوشی

(اور رعایت) کر جاؤ تو اور بات ہے ، اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ، جو ایسی

ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں ، تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے

دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے ،

دک اگر خرچ کر دے یا اچھا مال خرچ کر دے تو محتاج ہو جاؤ گے ، اور تم کو بڑی بات (یعنی غفلت)

کا مشورہ دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر)

اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ ایک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے

کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزاء دیں گے، یہ اس لئے منایا تاکہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جا کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحا وعید سنائی۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَيَحْتَمِلُوْهَا رَاٰی اِلٰی قَوْلِہٖ) وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ ظاہر ہے آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سببِ اخفاء ہی ان نفل ہے، اس میں دین مصلحت بھی ہے، اگر ریاء سے بعد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دوسری مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیتِ اخفاء سے آیت میں افضلیت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی مارض سے مثلاً دفعِ جہت یا امیدِ اقتدار وغیرہ سے اہلکار کو ترجیح ہو جائے تو افضلیت فی نفسہ کے منافی نہیں، یُکَفِّرُ عَنْکُمْ سُرَّتْکُمْ مِّمَّا سَیَّئَلْتُمْ سِتَّاتٍ اَلَمْ یَخْفَاہُ کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کر لے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں تجھے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منعقبض نہیں ہونا چاہئے، اس کو کہ تمہارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمہارے لئے فائدہ عظیم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا بُعْدٌ (الی قولہ) اَرَأَيْتُمْ لَا تَطْلَعُوا ۚ اس آیت میں بتلایا گیا کہ اگر
نیت بت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی
کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے، کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ
مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ فطری ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا حرام ہے۔ (منظہری)

مسئلہ: حربی کافر کو کسی قسم کا مددہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ: کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و فغل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

يَلْفُكْ أَهْلَ الْيَمِينِ ائْتِ بِسُبْحَانَ اللَّهِ (القول) فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

يَحْسَبُهُمُ الْكَافِرُونَ اَغْنِيَآءُ مِنَ التَّعْطِفِ ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر تیری

اور ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا (قرطبی)

مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنا رہے اور اس کا ختنہ بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا (قرطبی)

لَا يَسْأَلُونَكَ النَّاسُ الْعَاقِبَةَ، اس آیت سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ پست کر نہیں سکتے، لیکن بغیر پست کرنا سمجھنے کی نفی نہیں ہے، چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، لِإِنَّهُمْ مَعَافُونَ عَنِ السَّأَلِ عَقِبَ نَامَةِ (قرطبی)

آٹھویں آیت اَلَّذِيْنَ يَسْفَحُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالْبَيْلِ وَالْغَنَآءِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُ اللّٰهُ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ مقصد و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہے کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

رُوحِ النعانی میں بحوالہ ابنِ عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول اسی واقعہ صدیق اکبرؓ کو لکھا ہے، اسکے شانِ نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَخْطِئُ

جو لوگ کہاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جن طرح اٹھنا ہے وہ شخص کو جس کے پاس

السَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَشَرُ مِثْلُ الرِّبَا

کھڑے ہوئے جن نے لپٹ کر یہ حالت اُن کی اس واسطے ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ سو گری بھی تو ایسے ہی جیسے سولیا

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزَّيْوَ فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو، پھر جسکو یہی نصیحت اپنے رب کی

رَبِّهِ قَاتِلْهُ فَاَلَمْ يَكُنْ لَكَ دُونَهُ آلَافٌ مِّنْ عَسَاكِرَ

طوت سے اور وہ باز آگیا تو اس کی واسطے ہر چہ پہلے ہر چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہو اور جو کوئی

فَاُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٥٠﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ

بہرہ پر سرد تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ، مثلاً ہے اللہ

الرِّبَا وَيُرِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُغَيِّبُ كُلَّ غَفَّارٍ اَشِيمٍ ﴿٥١﴾

سود اور بڑھاتا ہر تجارت کو اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے ،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور

اٰتَوْا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَّ

دیتے رہے زکوٰۃ ان کیلئے ہے ثواب ان کا ان کے رب کے پاس اور نہ ان کو خوف ہے اور

لَهُمْ يَخْشَوْنَ ﴿٥٢﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوْا مَا

وہ غمگین ہوں گے ، اے ایمان والو! اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ

بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اِنَّ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٣﴾ اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاذْكُرُوْا

باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ، پس اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہوجاؤ

بِخُرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتَلُوْا فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ

لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارا واسطے ہر اصل مال تمہارا

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٥٤﴾ وَاِنْ كَانَ دُوْعٰى قَنَظِرَةً اِلٰی

ذم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی ، اور اگر ہے تنگدست تو بہت دینی چاہئے کشاکش

مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَاتَّقُوا

ہونے تک اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہے ، اور ڈرتے رہو

يَوْمَ تَرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ

اس دن سے جس دن لوٹائے جائے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کایا اور

لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٥٦﴾

ان پر ظلم نہ ہوگا

مُحَلِّصَةٌ تَفْسِيْر

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر

جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے جھلی بنا دیا ہو پٹ کر (یعنی حیران مہوش)

پس سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے

لئے) کہا تھا کہ بیچ بھی تو مثل سود کے ہے ، کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے ،

اور بیع یقیناً حلال ہے ، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے (حالانکہ (دونوں

میں کھلا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود

کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے

(اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے) یعنی حلال کہنے

سے باز آگیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے

(لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا بار بار یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی ، اور لیا ہوا

مال اسی کی ملک ہے (اور باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کر لی ہے)

(یہ خدا کے حوالے رہا) ، اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی ، تم کو

بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سن کر بھی) اسی قول اور اس فعل کی

طرت) پھر خود کرے تو روبرو اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں

جائیں گے (اور روبرو اس کے کہ ان کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ

رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے ، لیکن مال کا کار) اللہ تعالیٰ سود

کو مٹاتے ہیں رکھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہو

کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا

معلوم ہوتا ہے ، لیکن مال کا اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھلاتے ہیں ، (کبھی تو دنیا میں بھی

ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے ، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا جیسا اوپر

آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے

والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے) اور اسی طرح پسند نہیں کرتے

کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کلمات کا مرتکب ہو)۔

میں ایک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک اور آخرت میں، ان پر کوئی خطہ واقع ہونے والا نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے قوت ہونے سے) مغلوب ہوں گے،

لے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اس تمہارے جو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے نہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ دلا جاوے) اور اگر (قرضدار) تنگ و سست ہو اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے (تو اس کو) ہمت دینے کا حکم ہے (سود کی تک) یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو (اور یہ بات) کہ بالکل معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو) +

معارف و مسائل

ان آیات میں رہا یعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربا پر شرع و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جو لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں ربا کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس بھمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔ دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیا فی الواقع سود و ربا ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عوام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل رہاؤں کی پیداوار ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصاد امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سبب بڑا سبب سود و ربا ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چھ آیاتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر غیبتی بنادیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اس پاگل و مجنون کی طرح لٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے غیبتی بنادیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہل تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور عاقلانہ حجت جو زی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے، کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہو سکتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا

سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ فسران نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پھل یا بھجنوں ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے پست کر خبطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بیہوش و بھجن تو بعض اوقات چُپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بھواس اور ہڈیاں اور دوسری بھونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بیہوش یا بھجن ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔ اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزائیں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خبطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہو کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بیہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا پسند اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو کھانے کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی دہی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے تکفل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہو، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دوجرم کئے ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور

حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربی کی مثل ہے، جس طرح ربی کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں، اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربی بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہے تو ربی بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انھوں نے طرز بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا اتہاز کیا، کہ تم ربی کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربی کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک و الملکوت اللہ جل شانہ ہے وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور پھلے پڑے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیدیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی علیم و خیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہو اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دیدیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی، اور باز آگیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اسی کی ہو گئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہو، اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو

چونکہ یہ فعل سود خوری گناہ ہے، یہ لوگ روزخ میں جائیں گے، اور چونکہ ان کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لئے وہ روزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹانے میں اور صدقات کو بڑھانے میں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثواب آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجود مال پر ناجائز زیادتی کا خواہشمند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا شرعاً ان کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کے شادی ہے، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھانے میں جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کو نیوالے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آ جاتے ہیں۔ سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تورہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربوہ سسٹم کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فستیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ عمل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سسٹم کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے

اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آ کر اس کو برباد کر دیتی ہے، حضرت معمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے، کہ اس کے مال پر حاق زمین ٹھٹھا آجاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال منافع دہر باد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے، کیونکہ یہ بات کچھ غفلت نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد نہ اس سے کسی کی بھوک بٹھ سکتی ہے، نہ پیاس نہ سردی نہ گرمی سے بچنے کے لئے اور صابن بچایا جاسکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام لے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گزار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوئی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں یکہنا بالکل صحت ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن ورم وغیرہ سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہو رہی ہے، کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان ہتیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے پہننے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، تو کر چا کر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ دنیا

ان الذین اذین کثران عاقبتہ
تصیر الی قتل

یعنی سوداگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر ان کا
نتیجہ اس کا قتل ہے۔

یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے، **وَاللّٰهُ لَا يَجِبُ عَلَيْكَ كَفَّارٌ اَوْ ذَنْبٌ**، یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو، اس میں اشارہ فرمادیا ہو کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مومنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں ان کے اجر عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلے آیت میں سود و غور و دل کے لئے عذاب جہنم اور ان کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، مسترآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجات آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْطِ الَّذِي كُنتُمْ تَكُونُونَ** کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربوہ کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقیب کسی کے ذمہ باقی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رواج پھیلا ہوا تھا، آیات متذکرہ سے پہلے آیتوں میں اس کی مانعت آئی تو حسب عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقبوں کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انھوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، اکیہ کہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مسگر مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اسیدؓ تھے، انھوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافت حکم لکھ بھیجا،

اس پر مسترآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف اس المال وصول کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب کے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقم سود جو غیر مسلموں کے ذمہ تھی اس کو چھوڑنے میں ثواب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبہ میں ارشاد فرمایا:

الا ان کل ربا کان فی الجاہلیۃ موضوع عنکم کلہ لکمہ و من اموالکم
لا تظلمون ولا تظلمون و اول ربا موضوع ربا العباس ابن عبد المطلب کلہ،
راہن کشیر بحوالہ ابن ابی حاتم۔ یعنی زائد جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رستم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کرے گا، اور سب کے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقیب غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے ماندہ ہوتی تھیں، قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے **اول اتقوا اللہ** کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ مسترآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے متاثر ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے، یہاں بھی پچھلے ماندہ شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے **اتقوا اللہ** فرمایا، اس کے بعد حکم دیا **وَاذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الزَّيْطِ**، یعنی چھوڑ دو بقایا سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا **اِنَّ كُنْتُمْ مَّؤْمِنِيْنَ**، یعنی اگر تم ایمان والے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے

کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طہارح پر مہاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے **ادْعُوا إِلَىٰ دِينِكُمْ** اور حکم کے بعد **إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** کے ارشاد ملا دیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ میں لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا مَن لَّا يَتَّبِعُكُمْ وَلَا يُغْنِيكُمْ وَلَا يَحْصِي لَكُمْ مَالًا یعنی اگر تم توبہ کرو اور آئندہ کے لئے سود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس مال میں کسی یا دیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا، اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب توبہ شخص اسلام سے خارج اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے ہٹل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بناء پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھ بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دیدیا جائے، شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا، **وَلَا تَتَّبِعُوا مَن لَّا يَتَّبِعُكُمْ وَلَا يُغْنِيكُمْ وَلَا يَحْصِي لَكُمْ مَالًا** یعنی اگر تم توبہ نہ کرو گے تو تمہارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مسابقت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد

۴۲

ہوتا ہے، **وَلَا تَكُن مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُوا إِلَىٰ مَن لَّا يَتَّبِعُهُمْ وَلَا يَحْصِي لَهُم مَّا كَانَتْ يُدْعُوا إِلَيْهِ** یعنی اگر تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک ہسٹ دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

سود خوروں کی عادت توبہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سو کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں حکم الحاکمین نے یہ قانون بنادیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادا سے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک ہسٹ دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دیدی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو تشرآن نے بلفظ صدقہ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہو کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہوگی، نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر نزوان کے لئے نقصان کا سبب ہو کہ سود تو چھوڑا ہی تھا اصل راس المال بھی گیا، مگر تشرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دود وجہ ہیں، اول توبہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جب کہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا، کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی، برکت کی حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے مال میں کام بہت بھل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مفت دار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مالداروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سا بقہ نہیں پڑتا، اول تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خسار خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آتی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی

حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو مسترض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان نظر آتا تھا، اس شرعی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔
مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مہربانی کی تعلیم کے لئے احادیث صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے، طہرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مفروض کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور سند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رقم کے صدقہ کا ثواب ملے گا، جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعاد و قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دو گنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔
ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب و عذاب کے ذکر پر احکام سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:
وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۚ یعنی ڈرو اس روز سے جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک رہے احکام سے متعلقہ سورۃ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، رہا کہ حرمت و مانعت پر شرعاً کریم میں سورۃ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورۃ آل عمران میں ایک آیت، سورۃ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورۃ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح شرعی حکم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و ربا کے

احکام مذکور ہیں۔

سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء اور سورۃ روم میں آتی ہیں، تاکہ تمام آیات یک جا ہو کر ربا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔
آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا
الرِّبَا مَضَاعِفَ ۚ
اللَّهُ تَعَالَىٰ تَعْلِيْفُكُمْ ۚ

”یہی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ جسے
زائدہ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، امید ہے
کہ تم کامیاب ہو۔“

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوردی کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معین کے لئے اوصار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھا دی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوتی تو سود کی مقدار اور بڑھا دی یہ واقعہ عام کتب تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں بردایت مجاہد مذکور ہے۔

جاہلیت عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (یعنی کئی حصے زائد) فرما کر ان کے مرد و عورت کی مذمت اور ملت کشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا، اس کے معنی یہ نہیں کہ اعضا و اعضاء نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورۃ بقرہ اور نساء میں مطلقاً ربا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اعضا و اعضاء مضاعفت ہو یا نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جاہل فرمایا گیا کہ لَا تَشْتَرُوا بِإِيمَانِكُمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۚ یعنی میری آیتوں کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت مت لو، اس میں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیات الہیہ کے بدلہ میں اگر بہت قلیل کی سلطنت بھی لے لے تو وہ تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز، اسی طرح اس آیت میں اضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا لفظ ان کے شرمناک طریقہ پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مرد و عورتوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سود خوردی کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا، بلکہ لازماً اعضا و اعضاء مضاعفت ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رستم سود سے حاصل ہو کر سود خورد کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اضْعَافًا مُّضَاعَفَةً

ہو جائے گا، اس طرح ہر سود اضعاف مضاعف بن کر رہے گا۔

اور سورہ نسا میں دو آیتیں سود کے متعلق یہ ہیں:

يُظْلِمُونَ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ مِمَّا هَاهُوَ حَرَامٌ عَلَيْهِمْ يَكْفُرُونَ
عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ عَلَيْهِمْ
وَيُضِلُّونَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
كَثِيرًا ۚ وَآخِذُوا
بِذُنُوبِهِمْ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ
أَمْ وَاللَّاسِ بِالتَّابِلِ ۚ
أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۱۶۱-۱۶۰)

یعنی یہودی کے اپنی بڑے بڑے جرائم کے
سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے
لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں اور بسبب
اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رشد کی راہ سے
مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سود
لے کر تھے، حالانکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کی
نعمی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال
ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے

ان لوگوں کیلئے جو ان میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان معسرہ کر رکھا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی ان کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انھوں نے حرص دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بعض حلال چیزیں بھی حرام فرما دیں۔

اور سورہ روم کے چوتھے رکوع کی آیت میں ہے:

وَمَا آتَيْنَا مِنْ رَبٍّ إِلَّا بِبُحَا
فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرِبُوا
عِنْدَ اللَّهِ وَمَا آتَيْنَا مِنْ
ذِكْرٍ إِلَّا وَحْيًا وَجَهَ اللَّهُ
فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُصْبِحُونَ ۝ (۳۹-۳۸)

یعنی جو چیز ہم نے دوسے کو وہ لوگوں
کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ
کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو ذکر وہ لوگ
جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ
خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔

بعض حضرات مفسرین نے لفظ ربا اور زیادتی پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود بیاہ کی
پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر سرائی ہے کہ سود بیاہ کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی
زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر وہم ہو جائے
تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقلمند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش
نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے
میں، اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے۔

جیسے کوئی شخص ماوۃ ناسہ کے اخراج کے لئے مہبل سہتا ہے، یا نقد کھلو اگر خون بکھولا ہے، تو
بظاہر ہسردہ کزدور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں
یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علماء تفسیر نے اس آیت کو سود بیاہ کی مانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا
یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال احتلاص و نیک بنتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے
دے کہ میں اس کو یہ چیزیں دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی
برادریوں میں نوتا کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ
دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں
فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ
صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیتے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر
اللہ کے نزدیک وہ دوگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے، وَلَا تَقْنَطُوا مِنْ خِصْفِ ثَوْبٍ ۚ ۝ (۱۱۱) یعنی آپ کسی پراحت
اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

اور سورہ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی رائج معلوم ہوتی ہے، اقول تو
اس لئے کہ سورہ روم بھی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت کی ہر مگر
غالب گمان بھی ہونے کا ضرور ہے، جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت
کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمیت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمیت
سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی
دوسری تفسیر ہی کارحمان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے:

فَاتَّبِعْ مَا تَدْعُنِي ۚ إِنَّكَ تَكُونُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۚ وَابْتَغِ الْوَسِيلَةَ إِلَىٰ خَلْقٍ كَثِيرٍ ۚ لَّيِّنَ يَرْوِيكَ ذُنُوبُ
وَجْهَ اللَّهِ ۚ (۲۸-۲۷) قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین اور مساکین کو بھی یہ ان لوگوں کے لئے
بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مساکینوں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے
کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد
والی آیت مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے
دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہوا

اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہر حال ممانعتِ سود کے مسئلہ میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورۃ الصد بہت سی آیتیں آئی ہیں جن میں سے سورۃ آل عمران کی ایک آیت میں اضاعت مضاعت سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضاعت مضاعت اور سود در سود ہو یا اکہر اسود، بہر حال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سنا یا گیا ہے۔

مسئلہ سود و ربا

کی کچھ مزید

تشریح و تفصیل

آج کل ربا چونکہ عام نظامِ تجارت کا رکنِ اعظم اور غائب نہیں رہا ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت ملنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھنے کے وقت اس کی حرمت سے چمکپاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا مخزن یہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، غلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُبھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:

اول یہ کہ قرآن و سنت میں ربا کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟
دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس بحث و مصلحت پر مبنی ہے؟
تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی بُرا ہی، لیکن آج کل کی دنیا میں وہ نظامِ معاشیات و تجارت کا رکنِ اعظم بن چکا ہے، اگر نستر آئی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظامِ بنکے تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ربا کی تعریف میں کبھی کوئی اہم نہیں رہا | اب سنئے کہ لفظ ربوا عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مخالطہ کا جواب

بعثت اور نزولِ قرآن سے قبل جاہلیتِ عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لائن دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورۃ نسا کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ربا کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہِ قورات میں بھی معروف تھے اور قورات میں بھی اس کو حرام

نستر دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہِ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف تھا آتا ہو اور اس پر لائن دین کا رواج چل رہا ہے، اور نستر آن اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی خبر دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ یہی وجہ ہو کہ جب شہہ ہجری میں سورۃ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ربا کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کو دستِ معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الاداء تھا وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الاداء تھا، اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دنیا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلمؐ سے دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورۃ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانہ کے بقایا ربا کا لائن دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک سلامی حاکم شرعی کی وجہ سے ہمارا دوپہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلمؐ کے حکم محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا ہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے، اور اس کا لائن دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلمؐ نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپؐ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انھیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، ورنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو شک یا شبہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی اختلاف ہوا۔

اب سنے عرب کا مروجہ رہا کیا تھا؟ امام تفسیر ابن جریر نے حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے کہ جو رہا جاہلیت میں جاری تھا اور شرانے اسے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لئے قرض لے کر اس پر اصل راس المال سے زائد معسرہ زیادتی لینے تھے، اور اگر میعاد معسرہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے و تفسیر ابن جریر ص ۲۶۲ ج ۳ اندلس کے مشہور امام تفسیر ابو حیان عسکری کی تفسیر بحر تحیط میں بھی جاہلیت کے رہا کی یہی صورت لکھی ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام رہا تھا، اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع و شرائ میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھا رکھنے کو نفع لینا بھی حبابز ہونا چاہئے، شران کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع و رہا کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔

ابن عسکری نے احکام القرآن میں فرمایا: اَلرَّهْنُ الَّذِي لَا يُؤْتَى فِيهِ مَالٌ وَلَا مَتَاعٌ بِهِيَ الْاِثْمُ كُلُّ رَهْنٍ لَا يُؤْتَى فِيهِ مَالٌ وَلَا مَتَاعٌ (ص ۲۶۱-۲۶۲) یعنی رہا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو، امام رازی نے اپنی تفسیر میں سنرا یا کہ رہا کی رد قیاس ہیں، ایکٹ معاملات بیع و شرائ کے اندر رہا، دو شرائ ادھار کا رہا، اور جاہلیت عرب میں دوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معتین میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعاد معتین پر ادائیگی نہ کر سکا، تو میعاد اور بڑھا دی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھا دیتے، یہی جاہلیت کا رہا تھا، جس کو شران نے حرام کیا۔

امام جصاص نے احکام القرآن میں رہا کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں:

هَرَّاهُ مِنَ الْمَتْنِ وَطَفِيهِ
الْاَجَلُ وَزِيَادَةُ مَالٍ عَلَيْهِ
الْمُسْتَقْبَلِ

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہا کی تعریف یہ فرمائی ہے:

مَنْ قَرْضَ جَرِ نَفْعًا فَهُوَ
رِهًا

دہرا ہے

یہ حدیث جامع صغیر میں ہو اور عزیزی نے اس کو حسن کہا ہے۔

تخللا صما یہ ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام رہا ہے جو جاہلیت عرب کے زمانہ میں رائج اور معروف تھا، جس کو شران کریم کی آیت مذکورہ نے صراحہ حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرام نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصوصیات میں اس کو زائد نہ فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال نہ اس میں کسی کو کوئی ہشتباہ و اشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہا کے مفہوم میں بیع و شرائ کی چند صورتوں کو بھی داخل سنرا یا جن کو عرب رہا نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع و شرائ میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر برابر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا ادھار کیا گیا تو وہ بھی رہا ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہوڑے، بکرا، بکرا و درانگور ہیں۔

اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزاحمت اور محالہ کے نام سے رائج تھیں آیت رہا نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رہا میں شامل شرار دے کر منع فرمایا (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم، ص ۳۲۴ ج ۱)

اس میں یہ بات قابل غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے، یا ان کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کہیں کس صورت کو داخل رہا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا، جس کی بنا پر فرمایا:

اِنَّ اَيَّةَ الْمَرْبِطِ مِنَ الْاَخْرِ مَا نَزَلَ مِنَ
الْعَنْ اَنْ وَاَنْ الْمَتْنِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ
سَلَامٌ قَبْضُ قَبْلِ اَنْ يَبْدِيَهُ لِنَاذِرِ عَوَالِ الْوَبْطِ
وَالرَّهْنِ

احکام القرآن، جصاص، ص ۵۵۱

و تفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن قدام، ص ۲۸ ج ۱

یعنی آیت رہا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے
اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے
پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
ہو گئی، اس لئے اب احتیاط لازم ہے رہا کو
تھوڑا ہی ہے جس صورت میں رہا کا مشابہ
ہی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے

مذہب مزاحمت پر کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازہ سے فروخت کیا جائے، اور محالہ یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازہ میں چھوٹے کمی بیشی کا امکان رہتا ہے، اس لئے اس کو منع کیا گیا ۱۲ من

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملات بیع و شراہ کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیت عرب میں رباہ نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رباہ میں داخل و شراہ دے کر حرام فرمایا، باقی اصل رباہ جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرام نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظم کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظم کو رباہ کی جن خاص صورتوں میں ہشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں رباہ کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظام تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروق اعظم کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ رباہ کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں ماتے کی گنجائش ہے، جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، احکام القرآن میں ابن عربی نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنہوں نے اس فاروقی ارشاد کی بناء پر آیات رباہ کو مجمل کہا تھا۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا:

إِنَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذِهِ الْآيَةُ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَعَاطِفَ النَّبِيِّ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَرْسَلَ رَسُولَهُ إِلَى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ يُلْقِيهِمْ وَآتَاكَ عَلَيْهِمْ كِتَابَهُ نَبِيًّا رَأَيْنَاهُ يَلْتَمِزُهُمْ وَالتَّيْبَانِ فِي الْآيَةِ كُلِّ زِيَادَةٍ لَا يَكْفِيَانِ عَوْنُ

تین ہیں نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اسے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے انہی کی زبان میں سمجھا، ان پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی اور لفظ رباہ کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں اور دراصل آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ مبادلہ ہے۔

اور امام رازی نے تفسیر تیسیر میں فرمایا کہ رباہ کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا رباہ دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا رباہ، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی، اور اہل جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی، کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراہ میں کمی زیادتی رباہ میں داخل ہے۔ اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ رباہ کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراہ کے اندر

دوسری بغیر بیع و شراہ کے اور زمانہ جاہلیت کا رباہ ہے دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہو کہ وہ شراہ جس میں بحساب مبادلہ کوئی نفع لیا جائے، اور یہی مضمون ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے، اور شراہ میں ادھار پر نفع لینے کے رباہ کا حرام ہونا مسترآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ شراہ میں جو رباہ مذکور ہے اس سے حلی اور واضح طور پر وہ رباہ مراد ہے جو شراہ میں ادھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اس کو زمانہ جاہلیت میں رباہ کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے رباہ کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراہ میں کمی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے، اور اس رباہ کے حرام ہونے پر بھی اعداد بیش رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آتی ہیں، مگر اس قسم کے رباہ کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے (معانی الآثار ص ۲۳۲ تا ۲۳۷)۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تجلۃ اللہ الباقیہ میں منسرایا ہے کہ رباہ حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم رباہ ہے، حقیقی رباہ شراہ میں ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم رباہ وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں زیادتی لینے کو رباہ کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے (لا با الا فی النسیۃ دروالبخاری) یعنی رباہ صرف ادھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصلی رباہ جس کو عام طور پر رباہ سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ ادھار پر نفع لینے کا نام ہے اس کے سوا حقیقی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں وہ سب کلمہ رباہ میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں

اول یہ کہ نزول شراہ سے پہلے رباہ ایک متعارف چیز تھی، فرض ادھار پر بحساب مبادلہ زیادتی لینے کو رباہ کہا جاتا تھا۔

دوسرے یہ کہ شراہ میں حرمت رباہ نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرام نے اس رباہ کو ترک کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ ہشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چیزوں کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراہ میں براہری شرط ہے، کمی بیشی رباہ میں داخل ہے، اور ان میں ادھار

کرنا بھی رہا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گہیوں، جو، گجور، انگور ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروجہ اقسام بیع مزابنہ، نیا قلعہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور ادھار کو تو حرام رہا میں داخل کر کے حرام قرار دیدیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محل تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہوا؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں ہشتمیہ رہنے کے سبب حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہارِ انفس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد منسرا یا کہ جہاں رہا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

پچھلے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی رہا جس کو فقہاء نے ربوا القرآن یا ربوا القرض کے نام سے موسوم کیا ہے وہی ہے جو عرب میں منہات تھا یعنی قرض ادھار پر بھاب میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے رہا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی رہا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف و اختلاف امت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملات رہا میں ہوا، پہلی قسم کا رہا جو ربوا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت متحدہ میں کسی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آجکل جو رہا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی رہا ہے جس کی حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

رہا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رواج عام ہے نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہو گئی کہ مسترآن و سنت میں رہا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمت سود کی بحث مصلحت اس کے بعد دوسری بحث اس کی پر کہ رہا کی حرمت و ممانعت کس بحث و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کونسی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں، جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخادقات اور ان کے معاملات

میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بھتو، بھیڑیا، شیر اور سنسکھیا جیسے ذہر قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرت زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے، قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے جہتناب لازم ہے۔

رہا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دنیوی اور اخروی وبال اس نفع کے مقابلہ میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقل مند کے نزدیک قابل نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیر پا یا دائمی تو اس کو کوئی عقل مند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوشمند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالتے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج یا جاتی ہو تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں، اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم درواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلور فارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم درواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندی رسم درواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آئے دیتی۔

سودور با اس زمانہ میں ایک دہائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا درواج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑور کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی متفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر اکثر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں دبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر مؤثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بنا پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے، ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مصرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاح خلق کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سننے لگا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ لا الہ الا اللہ کا ماننے والا اس وقت کون تھا جب کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟ سودور بالآخر آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے، جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آجکل کے اہل علم و فن بھی کبھی رسم درواج کے تنگ دائرہ سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سودور بالآخر لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلق خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریبے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہتے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان

کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکہ اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہئے ہیں اور یہ دکھانا چاہئے ہیں کہ یہ لوگ سود و ربا کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردم خوروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردم خوروں کے محلہ میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تانے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردم خوروں کے عمل کی برکات مردم خوروں کے محلہ میں نہیں دوسٹر محلوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں ہزاروں مرد بے پڑے ہوئے ہیں جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے چلے ہیں، اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتنے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔

سودور با کی معاشی خرابیاں

سودور با میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہمارے ہاں سودی اور منسروہ طریقہ میں تو ایسا سمجھنا اپن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر مومن عقل دل لے کر بھی سمجھ میں آجاتا تھا، مگر آجکل کی نئی روشنی جس کو نئی اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے چوری اور ڈاک کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنایا ہے کہ سطحی نظروں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دکافروں کے مشترک کہنیاں بنائی ہیں جن کو بینک کہا جاتا ہے، اور اب دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ علوم جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے یا قلت سرمایہ کی بنا پر نہیں کر سکتے ان سب کار و پیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گو قلیل ہی بھی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ

ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ اہل تسرب ہی ہے جو شراب کی گندی پھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت منسروشی کے اڈوں کو سنیاءوں اور شبیہ نگہوں میں تبدیل کر کے زیر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھلانے کے لئے عمل میں لاتی ہے اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلات پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا ہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیکڑہ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان منسراہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود جو بیونگ بینکوں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ دان کو داخل ہونا خود اپنی مروت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہو اور تھوڑے سرمایہ دان کے لئے کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، ان کو دس گنا زیادہ قرض دینے، ایک ہزار کی مالیت دانے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھتا ہو تو لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور قرض کر لیتے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فی صد کا نفع ہوگا، جو اس کے مزدوری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اور ہمارے بینک میں بڑے سرمایہ دانوں کو عام سانا جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ دانوں کو میسر نہیں آسکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آتی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک

سمجھ کر کچھ اپنی گروہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱۔ یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲۔ اور در سرمایہ سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آ جاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہشیا کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گروہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلوانے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعہ کھینچ کر ان خود غرض لوگوں کی پردریش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بننے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاٹ ملوہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور ہشیا کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیار نہ طرین کارلے پوری قوم کو ایک ہلک بیماری لگادی اور دوسرے اس کی ذہنیت خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا کچھ

۳۔ بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاش نقصان اور دیکھتے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو خود کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوٹے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لیکر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوٹے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔

۳۔ سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھاسٹے میں آجائے تو پھر وہ پینے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دوسری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور دوسرے سے بنگ کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہو گا مگر قرض تو نہ ہو گا۔

۱۹۵۲ء میں پاکستان میں روٹی کے بڑے بڑے اشتراکی ارشاد کے مطابق حاکم کی آفت آنی اور حکومت نے کروڑوں روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی غومت تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کا رد ہا میں بیشتر سرمایہ بینکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روٹی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو بچیس سے گر کر دس پر آ گئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپیہ کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا وہی بچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جاتا ہے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

خوش پروری اور ملت کشی کی ایک اور مثال

سود و ربا کی ملت کشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیارسی اور چالاک ریچھے کے سود خوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیمبر کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے **يَمْحُجُّ اللَّهُ ذُنُوبَ بَعْضِ الْبَازِئِرِ** یعنی سود کے مال میں حاکم کی آفتیں آنالازی ہیں، جس کے نتیجہ میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سسٹم کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، ایک کوئی آسانی آفت کہ ہمارا ڈوب گیا، یا جل گیا یا کوئی اور ایسی ہی آفت آگئی، دوسرے کہ سامان کا نرخ اس کی قیمت خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انھوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر

ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سودی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعہ وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن انکی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہو کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اونچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی سنسودہ موٹر کو آگ لگا کر یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، تنہا ایک رو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہو گا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سسٹم کا بازار گرم کیا، اس سسٹم کے ذریعہ تمام افراد ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔

اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہو گا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگدستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بگڑتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی شرح بڑھا دی جائے، یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ ان کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔

لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجہ میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فزنی اور جمل بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دنیوں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہو کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی معتر ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوتی، جس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانایا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہو گئی کہ ۵

درہ بہت و دشمن اندر حسانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے ملنے کا پہلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص انفرادی بے جانف اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسکو بند نہ کیا جائے اور اس کاروبار نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ فوائد عوام کو بھی ملنا چاہئے۔ لیکن اگر بینکوں کی قلیل ہو اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے زمانہ میں تھا کہ لوگوں کا سرمایہ دفینوں اور خزیں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ ان کو فائدہ ہوگا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے اس کی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ کیس کی صورت میں عائد کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجھد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرگٹیکس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دفینہ کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھدار انسان اس پر مجبور ہوگا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت | اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ معنوی ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی امداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت پر لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی، کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مالدار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جب کہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے

سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ داروں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غریب و فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

سودی روحانی بیماریاں | یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱۔ انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جو ہر ایشیاء و خوارت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سود خور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آنا نہیں دیکھ سکتا۔

۲۔ وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳۔ سود خوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور بڑے کو بھی نہیں پہچانتا، اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی ارباب کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب تیسری تجارت نہیں چلی سکتی؟ بحث یہ باقی ہو کر رہا کہ معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہو گئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ رہا جس تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہو؟ بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر رہا کی صورت اختیار کر لے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں البتہ صبر و استقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، انشاء کریم ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:

مَّا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ (۲۲:۲۸) | یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی سہی نہیں ڈالی ہے۔

اس لئے ضرور ہے کہ رہا سے جہت ناپ کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور

اقتصادی نقصان بھی نہ ہوا اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور با سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہل بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں رہا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہو کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول اور سر فہرست کو بزرگ کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو انشاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں، جن کی بناء پر بینک سسٹم کو بغیر با کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیروما جہند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورت زکوٰۃ و صدقات واجہ موجود ہے، لیکن دین اور علم دین سے بھری اور بے پردائی کا نتیجہ جو جس آجکل نظام زکوٰۃ بھی مدخل کو دیا ہو، بے شمار مسلمان ہیں جو نماز کی طرح زکوٰۃ کے پاس نہیں جاتے، اور جو لوگ نکالتے بھی ہیں ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکیم الہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں، بلکہ ادا کرنے کا ہے اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ ہے، کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق

۱۔ احقر نے چند علماء کے مشورے سے سود و بھکاری کا مسودہ وضع ہوا کیا کر بھی دیا تھا اور بھکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابل عمل تسلیم بھی کر لیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام نا جروں کی توجہ اس طرف ہونے کے سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظور نہ ہونے کے سبب چل نہیں سکا، فانی مدظلہ العالی

اسلامی حکومت عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی ہیئت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموال ظاہر کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس ہیئت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور کسی بڑی رقم کی ضرورت پڑ جائے تو بطور قرض بھی بغیر سود کے دیا جاسکتا ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی و کانیں سر اگر یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظام زکوٰۃ ایسی چیز ہو کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات و با کی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاش و اقتصادی خود کشی کے مراد ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا ہتھ نہ کرے افراد و عادی کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سود کے مخوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں عملی گناہ میں کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی ہو، سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعتراف جرم کا نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایات حدیث اور ارشاد است رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو اپنی آیات قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آتی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو بیدار ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ

اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے ڈو گناہ بنالیں، اور بڑے بڑے صالح و سیدار مسلمان جو رات کو ہتجد اور ذکر اللہ میں گزاریں صبح جب دکان یا کارخانہ میں پہنچیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

① رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات ہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا، ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ دعا و عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں، کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے چاد و کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر ہتھ باندھنا (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے)

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے کج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی ہنردیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہے، جب یہ ہنر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ بھٹکے کا ارادہ کرتا ہے، تو پھر یہ کنارہ والا آدمی بھی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ان دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے بتلایا کہ خون کی ہنر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا اپنے من کی سزا پا رہا ہے، یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

③ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں، اور بعض روایات میں شاہد کا تب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

④ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت

نہ پہنچے دے، وہ چار یہ ہیں، شراب پیئے کا عادی اور سود کھانے والا اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ پچیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مال حرام سے بنا ہو اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے، اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد طبرانی وغیرہ میں ہے)

⑥ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ بھیل کو قابل استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور نہ فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے)

⑦ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا دعب غلبہ ان پر ہو جاتا ہے (یہ روایت مسند احمد میں ہے)

⑧ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر عدد و برقی کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھوٹے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آتے ہیں، میں نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں (یہ روایت مسند احمد کی ہے)

⑨ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت بن مالک سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مال غنیمت کی چوری ہے، اور دوسرے سود کھانا اور طہرائی

⑩ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو (ایسا نہ ہو اس نے ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)

ربا کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دیوبی تباہ کاری کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیث نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچئے سمجھئے والے مسلمان کیلئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام (مسئلہ سود) شائع ہو چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا دُعِيتُمْ إِلَى آجَلٍ مَّعِي فَاتَّبِعُونِي ۖ
 اسے ایمان والوں جب تم آپس میں معاملہ کرو اور حاکم کسی وقت مقرر ہو تو اس کو کلمہ لیا کرو
 وَلْيَكْتُب بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْب كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا
 اور چاہئے کہ کلمہ لے بہادر درمیان کوئی لکھنے والا انصاف اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ کلمہ دیوے جیسا
 عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ
 سکھایا اسکا اللہ نے سوا سکو چاہئے کہ کلمہ لے اور بتلا جائے جس پر قرض ہو اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے
 وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ
 اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہو بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا
 لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ لِیُّهِ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِیدَیْنِ
 آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کار گزار اس کا انصاف اور گواہ کرد دو شاہد اپنے
 مِنْ بَرِّ جَالِکُمْ ۖ فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتُهُ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
 مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جس کو تم پسند
 مِنَ الشُّهَدَاءِ أَوْ أَنْ تَفِضَلَ أِحْدَهُمَا فَقَدْ تَرَىٰ أَحَدَهُمَا الْأُخْرٰی وَلَا
 کرنے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری اور انکار
 بَابُ الشَّهَادَةِ إِذَا دُعُوا ۖ وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوا صَغِيرًا أَوْ
 ذکر میں گواہ جس وقت بتلا دے جادوں اور کالی نہ کر داس کے لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا
 كَبِيرًا إِلَىٰ آجَلٍ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنٰی
 بڑا اس کی میعاد تک اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا اور گواہی کو
 الْأَقْرَبُ تَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ
 اور نزدیک ہو کہ شہر میں نہ چڑھو مگر یہ کہ سودا ہو انھوں ہاتھ لینے دیتے ہو اس کو آپس میں تو ہم پر
 فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۚ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ
 کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو اور عہد کر لیا کرو جب تم سودا کرو

وَلَا يُضَارَسَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فَسَوْفٌ بِكُمْ
 اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کر دو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر
 وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَیَعْلَمُ اللَّهُ شَیْءَ كُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۴﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ
 اور ڈرتے ہو اللہ سے اور اللہ تم کو سمجھتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے اور اگر تم
 عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَهُ ۚ فَإِنْ أَتَىٰ بَعْضُكُم
 سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرد ہاتھ میں رکھنی چاہئے پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے
 بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي الْوَقْفَ أَمَانَتَهُ وَلْيَسْتَقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْفُرُوا
 کا تو چاہئے کہ پورا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور اگر ڈرے اللہ سے جو رب اسکا اور مت چھوڑو
 الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۵﴾
 گواہی کو اور جو شخص اس کو چھوڑ دے تو بے شک گنہگار ہو دل اس کا اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

خلاصہ تفسیر

اسے ایمان والوں جب معاملہ کرنے لگو اور حاکم کا رخاوا دام اور حاکم ہوں یا جو چیز خریدنا ہے
 دو ادھار ہو جیسے بیع سلم میں ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس کی یادداشت و دستاویز
 کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو کوئی لکھنے والا ہو وہ) انصاف کے ساتھ
 لکھے یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کی بیشی نہ کرے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے
 جیسا کہ خدا نے اس کو دکھانا سکھایا ہے اس کو چاہئے کہ کلمہ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص
 (بتلا دے اور) لکھو اسے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو کہ وہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا
 ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور پھر (اور) لکھاتے وقت اللہ تعالیٰ سے جو اس کا
 پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے پھر جس شخص کے
 ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معترہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا
 پیر فرقت) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود دیوانہ کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو
 مثلاً مگر گناہ ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا یا مثلاً دوسرے مالک کا رہنے والا ہو اور
 زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن

ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوائے اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کہ درود شرعی اصل دار ثبوت دعویٰ کا یہی گواہ ہیں گو دستاویز نہ ہو اور خالی دستاویز بدو گواہوں کے لیے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں دستاویز بکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لیے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور منکر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسٹر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لیے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ وہ سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلادے، اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لیے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے آگاہ مسکرت و خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزا دار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور مضرت) نہیں اور راتنا اس میں بھی ضرور کیا کر دو کہ اس کے خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو دام ہی کا اختیار بھی لے لیا تھا یا ابھی تو بیع پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمھاری طرف سے کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالاجائے) اور اگر تم ایسا کر دو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ تم کو احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں ہر ایک کو مناسب جزا دیں گے) اور اگر تم (دین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سو ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ (دین رکھنے کی چیزیں) ہیں جو (مدیون کی طرف سے مستحب حق کے) قبضہ میں دیدی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو

(اور اس لئے دین کی ضرورت نہ رہے) تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پرورا) ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء مست کرد اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمھارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی اخفاء کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف و مسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرارنامہ | آیات مذکورہ میں قانون معاملات جن کو آجکل کے قانون لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آجکل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھتے تو اس وقت دنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز بنایا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور منسرایا:

إِذَا اشْتَرَيْتُمْ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ شَيْئًا فَاطْلُبُوا فِي شَهَادَتِهِمْ وَأَنْتُمْ عَلَيْكُمْ دِينُ اللَّهِ (یعنی جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو)۔ اس میں ایک اصول قویہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان نشرایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، طبع معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی معسر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابھام نہ ہو، عینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کہیتی کھٹے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی دیہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلَكُمْ مَكْتَبٌ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْبَائِعِينَ (یعنی یہ ضروری ہے کہ تمھارے درمیان کوئی لکھنے

والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانبدار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور غلبان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے، اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ کچھ لکھ سکے ہے اس کا شکر ادا کرے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا: **وَلْيُسْئَلْ اَلَّذِي مَعْلُومٌ اَلْحَقُّ**، یعنی لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے، مثلاً سزا خریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس شخص کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوادے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: **وَلَا يَتَّبِعْ اَشْفَاقَهُ وَلَا يَتَّبِعْ يَمِينَهُ شَيْئًا**، یعنی اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا ہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے، معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق ماند ہو وہ خیف لعل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گویا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا دلی لکھوادے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو دلی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معاملات دلی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور اگر گھٹے یا دوسری زبان بولنے والے کا دلی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنائے تو بھی ہو سکتا ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ دلی دونوں معنی پر حاوی ہے۔

مضابطہ شہادت کے یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان چندان اہم اصول تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صورت تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آجکل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر رہیں۔

گواہی کیلئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں مثلاً (۱) گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک

اکیلہ مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط (۲) دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ میں تو جائز ہے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے (۳) تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، **وَالَّذِينَ تَزَوَّجْتُمْ مِنْ اَشْفَاقِكُمْ** میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بعد مذکورہ شرائط اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ انکار کرنا گناہ ہے بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت

ہیں احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں، اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اکساتیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلب بند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہو اور عارضہ ہو اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے، مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے بیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں صلہ و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شہادت دینے سے

انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا **وَلَا يَتَّبِعْ اَشْفَاقَهُ وَلَا يَتَّبِعْ يَمِينَهُ شَيْئًا**، یعنی کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے ان کی مصلحت اور فائدہ میں خلل ڈالیں پھر فرمایا **وَاِنْ كُنْتُمْ اَوْفَاكُم مِّنْكُمْ**، یعنی اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہائے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمد و رفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے، اسلام نے اپنے نظام عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اس طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ

دل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان حق کے مطابق ہو جاتے آج کی دنیا نے اس فستراکی اصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظام عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصل اور سچے گواہ ملنا تقریباً مفقود ہو گیا ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روز وقت بے وقت تھا نیدار صاحب اس کو بلا بھیجتے ہیں، اور بعض اوقات گفتگوں جمعہ سے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روز روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بچا رہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو، درندہ وارنٹ کے ذریعہ گرفتار کیا جاتا اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک مذاب سبھے اور مقدمہ اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، فستراک جھیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمَ كُفْرُ اللَّهِ قَدْ عَلِمَ كُلُّ يَوْمٍ تَكْلِيمًا** یعنی ڈرو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اصول صحیح کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے، چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے میں اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور فستراک کریم کی عام عادت ہو کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوب خدا اور خوب روز جزاء دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیل حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوب خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جیسز چسپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلافت درزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعشار کے لئے کوئی جیسز گردی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ مقبوضۃ سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شے مرہون سے نفع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مگر جن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گہنگار ہے، دل کو اس لئے گہنگار نہ لایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے کیونکہ اقل ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَاِنْ تَبَدَّلَ مَا فِي الْاَرْضِ كُلِّ يَوْمٍ فَسَبْحًا

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات

اَوْ تَخْفَوْهُ يَحْسِبْكُمُ اللّٰهُ فَكَيْفَ يُخْفِيْ مَنْ يَّشَاءُ وَيَعْنِيْ بِمَنْ يَّشَاءُ

یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ پھر بچنے کا جس کو چاہے اور مذاب کرے گا جس کو

يَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

چاہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات)، جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مملوکہ اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ، جو باتیں عقائد فاسدہ یا اخلاق مذمومہ یا گناہوں پر بھونچے عزم و ارادہ کی، تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان و جوارح سے ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا یا اپنے منکر، حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کبھی ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثلاً دوسرے معاصی کے ان کا) حساب لیں گے پھر (حساب لینے کے بعد پھر کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے اور جس کو سزا دینا منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اہلکار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکرار ہے۔ انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جاننے ہوئے چھپایا تو رب علیم و خبیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؓ، شعبیؓ اور مجاہدؓ سے یہی تفسیر منقول ہے (قرطبی)۔

اور علوم الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں بھی ہوا اور معنی آیت

کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گزرے ہیں اور وہ بھی جن کا دل سے بچتہ ارادہ کر لیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمر منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مومن قیامت کے روز اپنے رب کے جل و عل سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مومن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا ہوں، اور حسنات کا اعمال نامہ اس کو دیدیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو مجھ نام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پرشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پرشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ میرے کاتب اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صریح وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں ان چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انھوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مومنین کو معاف کر دیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں پر شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ حَيٌّ وَرَعْنُ أَعْمَى عَمَّا

خَفِيَ عَنْهُمْ مَا لَمْ يَكْتُبُوا

أَوْ يَكْتُبُوا بِهِ (قرطبی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں، اور تمام قرطبی نے فرمایا کہ یہ حدیث احکام دنیا کے متعلق ہے، طلاق، حلق، تیغ، تہہ وغیرہ محض دل میں ارادہ کر لینے سے منع نہیں ہو جاتے، جب تک ان کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکام آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تنازع نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ رساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد و ارادہ کے آجاتے ہیں، بلکہ ان کے خلاف ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر

اختیاری خیالات اور رساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیت مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد و اختیار سے اپنے دل میں جانتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موافق پیش آنے کی بنا پر ان پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گلد چکا ہے، اور چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دو قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات و رساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرام نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہوا اس کی تعمیل و اطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی، صحابہ کرام نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يَخْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَشَعَهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری رساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرام کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباس نقل کی گئی ہے (قرطبی) یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں ان کا تعلق بھی انسان کے قلب ہی سے ہے، اخلاق و صفات، معتبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر، حسد، بغض، حسد و نیاہرین وغیرہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قلعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائے اسی طرح اعمال باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا، یہ آیت سورہ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورہ بقرہ شتران کریم کی ایسی بڑی اور ہم سورہ

ہے جس میں احکام الہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورۃ میں اصولی اور فردی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمت شراب، ربا اور قرض، الین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیل بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام تسام العتران بھی آیا ہے، یعنی مستران کا سبک بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی روح اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود یا دوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق اللہ کے باطن اور قلب سے ہے سب کی درستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کر دی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے معاملہ میں مخلوق کے سامنے توجیل جوئی کے ذریعہ بھی راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ عظیم و خیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیب حفظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن مجید انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اول یا آخر میں خوب خدا اور فکر آخرت کا ایسا محاذ نظر ان کے قلوب پر ٹھاتا ہے کہ وہ راست کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

أَمَّا الرُّسُولُ فَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ لَمْ يَكُنْ أَمِنْ

ان لیا رسول نے جو کچھ آتا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی سب نے مانا

بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقُولُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ

اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو کہ ہم جدا نہیں کرتے

رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا إِنَّكَ رَبَّنَا وَرَبُّ كُلِّ الْمُسْلِمِينَ

کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب تیری ہی طرف سے نجات

لَا يَكْفُلُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا سَعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی کوشش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کیا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا

رَبَّنَا لَا تَزِدْنَا ظَنًّا إِنَّ لَيْسَ بِآوَاخِرَ نَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا

اے ہمارے رب نہ بڑھ دے ہم کو اگر ہم بھولیں یا بھڑکیں، اے رب ہمارے اور نہ دے کہ ہم بد بوجھ

إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ

ہماری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس

لِنَا بِهٖ رَاحَةٌ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا حَمَانًا إِنَّكَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا

کی بھڑکافت نہیں اور درگزر کر ہم سے اور بخشش ہو کہو اور رحم کر ہم پر تو ہی ہمارا رب ہر مدد کر چاری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

کافروں پر

حُلاصۂ تفسیر

اعتقاد رکھنے میں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کے حق ہونے کا جو ان کے پاس لکھ رہا کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں) آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا، سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے حق کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات و صفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ کہ وہ موجود ہیں اور انہوں نے پاک میں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں، اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کا اصل میں سب کچھ ہیں) اور اس کی پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور کچھ ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا ان کا اس طور پر ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھتے ہیں) تو فریق نہیں کرتے کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں کسی کو نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم آپ سے بھٹکنا چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) فتنہ ہے، یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا ہے کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہو گا اس سے مراد امور غیر اختیار دی نہیں بلکہ صرف امور اختیار دی ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو احکام شرعیہ میں مکلف نہیں بناتا یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہو تا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہو گا جو ارادہ کرے اور جو وسوسہ سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب اور وسوسہ طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو حرام اور ان کے نہ آنے کو واجب نہیں کیا، اور نہ ان پر عذاب رکھا، اے ہمارے رب ہم پر وار نہ کر نہ فرما یہ اگر ہم بھول جاویں یا بھڑکیں، اے ہمارے رب ہمارے رب یہ بھی درختا

ہے کہ ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب اور ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہم پر کوئی ایسا بار (مکلف کاری یا آخرت میں) نہ ڈالے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں اور کار ساز طرف دار ہوتا ہے، سو آپ ہم کو کافروں پر غالب کیجئے۔

معارف ومسائل

ان دو آیتوں کے خاص فضائل | یہ سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، احادیث صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔

اور ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزانوں میں سے نازل فرمائی ہیں جسکو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو روز قبل پہلے خود رحمن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں، اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے سورۃ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانہ غامض سے عطا فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ، اسی لئے حضرت فاروق اعظمؓ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جسکو کچھ بھی عقل ہو وہ سورۃ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوسے لگے، ان دونوں آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت ہیں لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں اکثر احکام شرعیہ اجمالاً و تفصیلاً ذکر کر دیئے گئے ہیں، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مومنین کی طرح کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ جل شانہ کے تمام احکام پر لمببیک کہا، اور قبیل کے لئے تیار ہو گئے، اور دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کو پیدا ہو گیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے فضل و رحمت بے حساب کا ذکر فرمایا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ لَنْ شَبَّ ذَا مَنَافِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَتَخَفُوْا يٰۤاَيُّهَا سُبْحٰنَہُ اللّٰہُ! جو کہ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کر دیا چھپاؤ ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے، آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اسنے جنت پار دارادہ سے جو کوئی عمل اپنے دل میں کر دے اس کا

حساب ہوگا، غیر محتسب یا ری دسوسہ اور مجبول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن الفاظ قرآن بظاہر عام تھے ان کے عموم سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے دل میں غیر محتسب یا ری طور پر کوئی خیال آجائے گا تو اس کا بھی حساب ہوگا، صحابہ کرامؓ یہ مستنکر گھبرا اٹھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی یا رسول اللہ اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں، حساب اُن ہی اعمال کا ہوگا، غیر محتسب یا ری خیالات جو دل میں آجائے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر جو دل میں آئے حساب ہوگا، اس میں تو حساب سے نجات پانا سخت دشوار ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر الفاظ کے عموم کے پیش نظر آپؐ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا بلکہ وحی کا انتظار کیا، اور صحابہ کرامؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دشوار، مومن کا کام یہ نہیں کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تاامل کرے تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام مَن کر یہ کہو تَتِمُّعُنَا قُلُوبُنَا غُفْرَةً اَللّٰہُ رَبُّنَا قُلُوبُنَا لَیْسَ ذٰلِکَ بِمُحِبَّیْنِ یعنی اے ہمارے پروردگار ہم نے آپؐ کا حکم سُننا اور اس کی اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی یا فروگزاشت ہوئی ہو تو اس کو معاف فرما دے کیونکہ ہمارا سب کا آپؐ ہی کی طرف قوسنا ہے، صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا اگرچہ اُن کے ذہن میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ بے اختیار دل میں آنے والے خیالات اور وسوسوں سے بچنا تو سخت دشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت بعثت کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدد، اور دوسری میں اس آیت کی اصلی تفسیر بتلائی گئی جس میں صحابہ کرامؓ کو اشتباہ پیش آیا تھا، اب پہلی آیت کے الفاظ دیکھئے

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالتَّوْمِيْنُوْنَ كُلُّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقْرِيْ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ
اَطَعْنَا خُفِّرْنَا لَكَ رَبَّنَا وَ اَلَيْكَ التَّوْمِيْنُ عِني ايمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو ان کے
پاس نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے، اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی
اور اس میں بجا ہے آپ کا نام مبارک لینے کے لفظ رسول فرمایا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی تعظیم و تشریف کو واضح کر دیا، اس کے بعد فرمایا، وَالتَّوْمِيْنُوْنَ، یعنی جس طرح آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وحی پر ایمان و اعتقاد ہے، اس طرح عام مؤمنین کا بھی اعتقاد ہے
اور جو طرح بیان اس جملہ میں اختیار فرمایا کہ پہلے پورا جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان

ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا اعمال اختیار کے ساتھ مخصوص میں انحال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس طرح وہ انحال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ہے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا، اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی بڑے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور جزاء و جزا صرف اختیاری انحال پر ہو، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرام کو اطمینان ہو گیا کہ غیر اختیاری دسارے و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی معنوں کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے، لَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهِمَا مَا آتَا كُتُبَهُنَّ، یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بلا واسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہو کر جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیک کی توفیق ہو جائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے دلے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اول یہ طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہو کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اس شبہ کا جواب ہو کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچتا، بلکہ درجہ کے واسطے سے پہنچتا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے لئے عمل اور اختیار کو بوجہ مل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجا و کیا ہو اچھا یا بُرا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیار کا دخل ضرور ہو اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب بھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے

کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سلطان شریک ہیں لیکن درجہ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کی بناء پر۔

اس کے بعد اس ایمان بجل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفات کا ملکہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس امت کے مؤمنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرق ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس امت کی یہ درج فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے اور پھر صحابہ کرام کے اس جملہ پر ان کی تعریف کی گئی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا، بِمَعْقَدَاتِ الْحَقِّ عَقْنِ اَقْلَقَ رَبَّنَا وَ كَيْفَ الْعَصِيَّةُ۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہو تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا لَا يَخْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا اِلَّا وَ شَعَرًا، یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کام کا حکم نہیں دیتے، اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات دوسرے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مواخذہ صرف ان انحال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و انحال جو ہاتھ ہر آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جاتیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا، دوسرے غیر اختیار، جو بلا ارادہ سرزد ہو جاتیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ یا ریشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، ان میں سب کو معلوم

عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطا کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کی گئی، فرمایا، رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا فِي شَيْءٍ نَّسِيْنَا وَلَا جُنُودَنَا أَوْ أَصْحَابَنَا أَكْثَمْنَا عَلَى الْإِذْنِ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحِثْ عَلَيْنَا مَا لَا كِفَاةَ لَهَا بِهِ، "یعنی اے ہمارے پروردگار ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالنے جیسا ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرما جسے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔"

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کھڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا یا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بد پر کیا گیا، اور یہ سب دُعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا۔

سورۃ بقرہ تمام ہوئی و الحمد للہ و لا اُخر و دہا لہ و ہو المستعان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
۲۵ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ

دیباچہ طبع اول

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ معارف القرآن کی جلد اول جس میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی تفسیر پر عمل شائع ہو چکی ہے، اور محمد اللہ قرق سے زائد مقبولیت کے آثار محسوس کئے جاتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ جلد دوم طبع کی جا رہی ہے جس میں سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیت یہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزیں زوائد کا التزام کیا گیا جو اللہ اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہو گا۔

ایک نوید کہ زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہند کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ خلاصہ تفسیر میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر "بیان العشر آئی" میں جو شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے ان کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس خلاصہ تفسیر میں حضرت نے یہ التزام کیا ہے کہ ترجمہ تشریح کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ کے اوپر خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس خلاصہ تفسیر میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامت کا بھی آگیا، اور مزوری تفسیر بھی، اس التزام کے ساتھ ناظرین "معارف القرآن" کے لئے دو مستند ترجیح مستقبل سامنے آجائیں گے ایک زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہند کا، دوسرا خلاصہ تفسیر کے ضمن میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا باقی خصوصیات تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، واللہ المستعان وعلیہ التکلیل

بندہ محمد شفیع

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۲

شعبان ۱۳۸۵ھ

یہ دوسرے ایڈیشن میں جلد اول کو بھی ان امور کے مطابق کیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب معارف القرآن کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (صحیح)